اشاعتی ضابطہ

نام کتاب: مقالات فریدیہ [حصہ اول]

تصنیف: مفتی شیخ فرید تحصیل مفتی

کمپوزنگ: ضیاء العلوم کمپوزنگ سنٹر سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

کمپیوٹر گرافکس: قاضی محمد یعقوب چشتی

ضخامت: 368 صفحات $\frac{23 \times 36}{16}$

بار طبع اوّل - دسمبر 2009

قیمت: روپے

ناشر: ضیاء العلوم پبلی کیشنز یو 128 بازار تلواڑاں راولپنڈی

0333-516658
Fax-4580404
Emil:ziauloom@isb.paknet.com.pk

ضروری التماس

قارئین کرام! ہم نے اپنی بساط کے مطابق اس کتاب کے متن کی تصحیح میں پوری کوشش کی ہے۔ تاہم پھر بھی آپ اس میں کوئی غلطی پائیں تو ادارہ کو آگاہ ضرور کریں تاکہ وہ درست کردی جائے۔ ادارہ آپ کا بے حد شکر گزار ہوگا۔

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تقریظ

از قلم: فخر اہل سنت سرمایہ ملت حضرت علامہ مولانا حافظ نذیر احمد قادری ضلع مفتی مظفر آباد آزاد کشمیر

ہر ریاست کی پہچان اس کے ادارے ہوتے ہیں اگر ادارے مذہبی ہوں تو ریاست مذہبی کہلاتی ہے ادارے غیر مذہبی ہوں تو ریاست غیر مذہبی کہلاتی ہے جس طرح ہر ریاست میں محکمہ قانون کا ہونا ضروری ہوتا ہے اسی طرح ہر اسلامی ریاست کے لئے محکمہ امور دینیہ/محکمہ افتاء کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تا کہ حکومت، عدالتیں اور عوام الناس دینی معاملات میں محکمہ افتاء کے مفتیوں سے رہنمائی حاصل کر سکیں آزاد کشمیر میں ۱۹۴۹ء میں محکمہ افتاء قائم کر کے جید علماء کو مفتیوں کے عہدوں پر تعنیات کیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں محکمہ افتاء کو محکمہ قضاء میں بدل کر شریعت کورٹ کے تابع کر دیا۔ بعد ازاں ۱۹۸۹ء میں مجاھد اول سردار عبد القیوم خان صاحب سابق صدر وزیر اعظم آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر کی کوششوں، سے از سر نو محکمہ افتاء کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آزاد کشمیر کی مشہور و معروف روحانی اور علمی شخصیت حضرت علامہ مولانا سید اشرف شاہ کاظمیؒ نے ہمیں مفتیوں کے امتحان میں شامل ہونے کی دعوت دی اور صدر ریاست مجاہد اول سردار عبد القیوم خان کی صدارت میں قائم شدہ اعلیٰ سطحی بورڈ میں ٹیسٹ انٹرویو کے بعد میرٹ پر آنے والے علماء کو ضلع وتحصیل مفتیوں کے عہدوں پر تعینات کرنے کی سفارش کی۔ حضرت علامہ مولانا شیخ فرید صاحب کو تحصیل مفتی اور راقم کو ضلع مفتی دتعینات کیا گیا۔

بحمدہ تعالیٰ مولانا شیخ فرید صاحب بھی اس وقت ترقیاب ہو کر ضلع مفتی کے

عہدے پر فائز ہیں۔

الحمدللہ آزاد کشمیر کے تمام سیاسی رہنماوں کا مزاج دینی ہے ریاست میں محکمہ قضاء محکمہ افتاء زکواۃ کونسل، اسلامی نظریاتی کونسل اور علماء ومشائخ کونسل کا وجود اس پر بین دلیل ہے یہ تمام محکمہ جات مجاہد اول سردار عبدالقیوم خان کی کاوشوں سے پروان چڑھے اور ایسے پروان چڑھے کہ حکومتیں بدلتی رہیں ہیں مگر ان اداروں کی ترقی میں کوئی رکاوٹ سامنے نہیں آئی۔

۱۹۸۹ء میں محکمہ افتاء میں آزاد کشمیر کے جن علماء کو مفتیوں کے عہدوں پر تعنیات کیا گیا ان میں سے حضرت علامہ مفتی شیخ فرید صاحب انتہائی فاضل ذہین و فطین اور جملہ علوم وفنون پر مہارت تامہ رکھنے والی شخصیت ہیں۔ آزاد کشمیر میں تمام مکاتب فکر آپ کے علم فضل کے معترف ہیں۔ حضرت مفتی صاحب راقم کے ساتھ تقریباً ۲۰ سال سے مفتی کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ انتہائی دیانت دار، زیرک اور اعلی کردار کے حامل ہیں۔ موصوف کئی کتب کے مصنف ہیں۔ آپ کے ہاتھوں میں یہ کتاب مقالات فریدیہ حضرت مفتی صاحب کے تحقیقی مضامین کا ایک گلدستہ ہے۔ جو آپ نے وقتاً فوقتاً موقع ومحل کے اعتبار سے رقم کیے اور وطن عزیز کے مختلف علمی، مذہبی، جرائد ومجلّہ ہاء میں شائع ہوتے رہے۔ جنہیں اب یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔ جو ان شاء اللہ تعالیٰ موصوف کے لیے صدقہ جاریہ اور عوام و خواص کے لیے قابل قدر تحفہ ثابت ہونگے۔ حضرت مفتی صاحب جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کی عمر میں علم وعمل میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

حافظ نذیر احمد احمد قادری
ضلع مفتی مظفر آباد آزاد کشمیر۔

تاریخ تعمیر کعبہ معظّمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جغرافیائی تعارف:

ہر مسلمان جانتا ہے کہ ملّت اسلامیّہ کا روحانی اور دینی مرکز ومحور کعبہ معظّمہ سعودی عرب کے مقدس ومتبرک شہر مکّہ مکرمہ میں واقع ہے۔اور مکہ مکرمہ بحر احمر کے مشرق میں طول بلد ۴۰ درجے شرقی اور عرض بلد 21 1/2 درجے شمالی پر سطح سمندر سے اوسطاً ۱۰۰ افٹ کی بلندی پر واقع ہے مغرب میں جبل عمر، جنوب میں جبل ابوحدیدہ، جبل کداء جبل ابی قبیس، مشرق میں جبل خندمہ اور شمال میں جبل قیعقان اور جبل سلع واقع ہیں مکہ مکرمہ کے لیے قرآن حکیم میں لفظ بکہ استعمال ہوا ہے۔ یہ دونوں مترادف ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ (آل عمران ۹۶)

اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کیلئے بنایا گیا یقیناً وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔

کعبہ معظّمہ کے پاس مقام ابراہیم کعبہ مبارکہ ہی کے پاس آب زمزم موجود اسکے حطیم میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قبریں۔اس کے مطاف میں چار سو انبیاء کرام علیہم السلام کے مزارات اس میں سنگ اسود اور رکن یمانی اور اس کے پاس صفا مروہ جو شعائر اللہ ہیں اور اس کا شہر مکہ مکرمہ دارالامان ہے اور اسی کا شہر سرور کائنات خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت گاہ۔اسی کے سایہ میں منیٰ ومزدلفہ اور عرفات جیسے متبرک مقامات اسی کا ہمیشہ سے حج ہوا اور ہوتا ہے اور اسی کا عمرہ ہوا اور ہوتا رہے گا اور یہی ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے۔

کعبہ معظّمہ کی تعمیر مورخین کے نزدیک متعدد مرتبہ ہوئی ہے اس میں بعض متفق علیہ

اور بعض مختلف فیہ ہیں۔اس مقام پر تاریخ کی روشنی میں تعمیر کعبہ کے ادوار کا اجمالی تذکرہ مقصود ہے۔

وضع ربی: بعض حضرات کے نزدیک کعبہ معظّمہ کی سب سے پہلے تعمیر اللہ تعالیٰ کے امر کن سے ہوئی جس میں کسی مخلوق کا کوئی دخل نہ تھا علامہ زرقانی فرماتے ہیں۔

" اختلف في اوّل من بنى الكعبة فذكر المحب الطبرى فى منسكه قولاً ان الله وضعه او لاً لابنباء احدٍ"

(شرح موھب لدنیه ج ا ص ۳۸۴ مطبوعه دار الکتب العربیه بیروت)

کعبہ کو سب سے پہلے کس نے تعمیر کیا ہے اس بارے میں اختلاف ہے۔علامہ طبری نے ایک قول یہ بیان کیا ہے کہ اس کی سب سے پہلے تعمیر خود اللہ تعالیٰ نے امر کن سے فرمائی جس میں کسی مخلوق کا کوئی دخل نہ تھا۔

متعدد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم سے نقل کیا گیا ہے کہ تمام زمین کے پیدا ہونے سے پہلے یہ جگہ پانی پر بلبلے کی طرح تھی پھر اسی کو پھیلا کر ساری زمین اسی سے بنائی گئی جیسا کہ پیڑے کو پھیلا کر روٹی بنائی جاتی ہے۔تفسیر معالم التنزیل اور شرح مواہب لدنیہ وغیرہ میں ہے۔

قال بعضهم اول بيت ظهر علىٰ وجه الماء عند خلق السماء والارض قبل خلق الارض بالفى عام وكانت زبدة بيضاء على الماء فد حيت الارض تحتها هذا قول عبدالله بن عمر ومجاهد وقتادة والسدى.

(لعالم التنزیل ج اوّل ص ۷۲ ا تاص ۱۷۳ مطبوعه فتح الکریم بمبئی شرح زرقانی ج اوّل ص ۲۸۴ مطبوعه دار الکتب العربیه بیروت)

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت سب سے پہلے پانی کی سطح پر ظہور پزیر ہونے والا گھر بیت اللہ شریف تھا اور یہ زمین کی پیدائش سے

دو ہزار سال پہلے کا واقعہ ہے۔اور بیت اللہ شریف کی جگہ سطح آب پر سفید جھاگ کی طرح تھی پھر اس کو پھیلا کر زمین پیدا کی گئی یہ حضرات عبداللہ بن عمر، مجاہد اور قتادہ، سدی کا قول ہے۔

ایک روایت میں ہے۔

خلق اللّٰہ تعالٰی ھذا البیت قبل ان یخلق شیئًا من الارضین

اللہ تعالٰی نے کعبہ معظمہ کی تخلیق اس وقت فرمائی جبکہ ساتوں زمینوں کی کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی تھی۔

(تفسیر کبیر جزء ۷ ص ۱۵۲)

دوسری روایت میں ہے۔

خلق اللّٰہ موضع ھذا البیت قبل ان یخلق شیئًا من الارض بالفی عام

(کبیر جزء ۷ ص ۱۵۲)

زمین کی ہر چیز کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے اللہ تعالٰی نے کعبہ معظمہ کی جگہ کو پیدا فرمایا۔

تعمیر ملائکہ: بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالٰی نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ زمین پر اللہ تعالٰی کی عبادت کیلئے ایک مکان بنائیں تا کہ زمینی مخلوق اس کا طواف کریں۔ چنانچہ اللہ تعالٰی کے حکم کی تعمیل میں فرشتوں نے زمین پر کعبہ معظمہ تعمیر کیا تو اللہ تعالٰی نے زمین کی مخلوق کو اس کے طواف کا حکم دیا کہ وہ اس کا اس طرح طواف کریں جس طرح آسمانی مخلوق بیت المعمور کا طواف کرتی ہے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالٰی عنہ رسول اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

ان اللّٰہ بعث ملائکتہ فقال ابنوا فی الارض بیتًا علی مثال بیت المعمور وامر اللہ تعالیٰ من فی الارض ان یطوفوا بہ کما یطوف اھل السماء بالبیت المعمور وکان ھذا قبل خلق آدم

(تفسیر کبیر جزء سابع ص ۱۵۳ مطبوعہ مکتبہ الاعدم الاسلامی ایران)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا اور ان سے فرمایا میری عبادت کے لئے زمین میں بیت المعمور کی مانند ایک گھر تعمیر کرو اور اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کو حکم فرمایا کہ وہ اس کا اسی طرح طواف کریں جس طرح آسمان والے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں اور یہ واقعہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔

صحابہ کرام اور تابعین سے منقول یہ آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ کعبہ معظّمہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے موجود تھا فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

الا ان اللہ حرم مکۃ یوم خلق السموٰت والارض والشمس والقمر

(تفسیر کبیر ج۷ ص ۱۵۳)

بیشک اللہ تعالیٰ نے مکہ کو اسی روز حرم قرار دیدیا تھا جس روز آسمانوں وزمین اور آفتاب وچاند کو پیدا فرمایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین وغیرہ کی تخلیق سے پہلے یہ جگہ موجود تھی کیونکہ تحریم مکہ بعد وجود مکہ ہی ممکن ہے

محمد بن کعب القرظی سے منقول ہے۔

حج آدم فلقیتہ الملائکۃ فقالوا برّ نسکک لقد حججناہ قبلک بالفی عام

(البدایۃ والنہایہ مطبوعہ دار الکتب العربیۃ بیروت)

جب حضرت آدم نے حج کیا تو ان کی فرشتوں سے ملاقات ہوئی فرشتوں نے ان سے کہا اپنا حج مکمل کریں ہم آپ سے دو ہزار پہلے سے اس کا حج کرتے آئے ہیں۔

تعمیر حضرت آدم علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر کعبہ مورخین ومحدثین کے نزدیک مسلم ومشہور ہے۔روایات میں آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی یہ عمارت منہدم ہوگئی اور نشانات مٹ گئے اور بعض روایات کے مطابق آسمانوں کی طرف اٹھالی گئی۔

تفسیر کبیر میں ہے۔

ان آدم صلوٰت اللّٰه عليه وسلامه لمااهبط الى الارض شكا الوحشة فامره الله تعالىٰ ببناء الكعبة وطاف بها بقى ذالك الى زمان نوح عليه السلام فلما ارسل اللّٰه الطوفان رفع البيت الى السماء السابعة

(تفسير كبير جزء ۷ ص ۱۵۳)

ترجمہ جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام زمین میں اتارے گئے تو انھوں نے بارگاہ خداوندی میں تنہائی کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بیت اللہ کی تعمیر کا حکم فرمایا انھوں نے تعمیر کے بعد اسکے طواف میں اپنے کو مصروف رکھا۔اور یہ عمارت حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک موجود رہی جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں طوفان بھیجا تو بیت اللہ کی عمارت کو ساتویں آسمان کی طرف اٹھالیا گیا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی جگہ کی نشاندہی حضرت جبریل امین علیہ السلام نے کی اور حضرت آدم وحضرت حواء نے اس کی تعمیر فرمائی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

بعث الله جبريل الى آدم وحواء فقال لهما ابنيا بيتاً فخط لهما جبريل فجعل آدم يحفر وحواء تنقل حتىٰ اجابه الماء نودى من تحته حسبک یاآدم فلما اوحى اللّٰه اليه ان يطوف به وقيل له انت اوّل الناس وهذا اوّل

بیت ثم تنا سخت القرون حتیٰ حجه نوح ثم تنا سخت القرون حتیٰ رفع ابراهیم القواعد عنه. (البدیة ولنهایة ج اوّل ص ۲۷۷)

ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل کو حضرت آدم وحواء کے پاس بھیجا اور فرمایا ایک گھر کی تعمیر کرو۔ پس حضرت جبریل نے حد بندی کر دی اور حضرت آدم علیہ السلام نے مٹی کھودنا شروع کی اور حضرت حوا رضی اللہ تعالیٰ عنہا وہ مٹی دوسری جگہ منتقل کرتی رہیں۔ یہاں تک وہ پانی کی سطح تک پہنچ گئے تو نیچے سے آواز آئی اے آدم۔ اب بس کرو اتنی گہرائی کافی ہے۔ جب انھوں نے تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی اب اس کا طواف کرو اور انہیں بتایا گیا کہ آپ پہلے انسان ہیں اور یہ پہلا گھر ہے اس کے بعد صدیاں بیت گئیں یہاں تک حضرت نوح علیہ السلام نے اس کا حج کیا پھر صدیاں بیت گئیں یہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بنیادوں کو اٹھایا۔

تعمیر حضرت شیث علیہ السلام

بعض روایات میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت شیث علیہ السلام نے بھی کعبہ کی تعمیر یا مرمت کی تھی۔ چنانچہ علامہ ابن جوزی نے الوفاء میں نقل کیا ہے کہ۔

وبنی آدم مکانه ثم بناه اولاده بالطین والحجارة
(الوفاء باحوال المصطفیٰ ج اوّل ص ۱۴۶)

کعبہ معظّمہ کی جگہ حضرت آدم علیہ السلام نے عمارت تیار کی اور پھر ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی اسی جگہ گارے اور پتھر سے عمارت بنائی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر سے پہلے کعبہ کی تعمیر کے بارے میں جتنی

روایات ہیں وہ اخبار احاد ہیں علامہ بن کثیر کی تحقیق کے مطابق ان میں سے کوئی بھی درجہ صحت تک نہیں پہنچتی ہیں۔

اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر سے قبل کعبہ معظّمہ کی تعمیر کا قطعی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے اسلئے یہ قطعی چیز ہے اور اس سے قبل کی تعمیر گرچہ قطعی نہیں ہیں۔ لیکن اکثر مورخین ومحدثین کے نزدیک مسلّم ہیں۔ اسی لیے علامہ زرقانی نے علامہ ابن کثیر وغیرہ کا جواب دیا ہے کہ اس بارے میں وارد روایات اگر چہ اخبار آحاد اور ضعیف ہیں لیکن یہ اخبار احاد ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں جسکی وجہ سے ان کا ضعف رفع ہوجاتا ہے۔ اسلئے انھیں یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

فهذه الاخبار وان كانت مفرداتها ضعيفة ولكن يقوى بعضها بعضاً

(شرح مواهب لدنيه ج اوّل ص ۳۸۴)

ترجمہ: ان اخبار کے مفرادات اگر چہ ضعیف ہیں لیکن یہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔

تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام

طوفان نوح میں کعبہ معظّمہ کی تعمیر منہدم ہوئی اور اسکے نشانات مٹ گئے اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

واذيرفع ابراهيم القواعد من البيت واسمعيل ربنا تقبل منا انك انت السمع العليم. (البقرة ۱۲۷)

ترجمہ: اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کعبہ کی بنیادیں اور

دیواریں اٹھاتے جاتے تھے اور کہتے جارہے تھے کہ اے ہمارے ربّ: تو ہم سے قبول فرما تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اس مکان سے افضل کون سا مکان ہوسکتا ہے جسکی تعمیر کا حکم اللہ تعالیٰ دے اور جس کی انجینری کا کام حضرت جبریل امین انجام دیں اور اس کا نقشہ بتائیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی اسکے معمار بنیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسے عظیم نبی تعمیر میں مددگار بنیں۔ ابن سعد کی روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اسوقت سو برس تھی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تیس برس۔ (درمنثور)

بعض روایات کے مطابق طوفان نوح کی وجہ سے بیت اللہ شریف کی جگہ سرخ ریت کے ٹیلے بن چکے تھے۔ بنیادیں مخفی ہوچکیں تھیں۔ البتہ لوگوں کو اتنا ضرور معلوم تھا کعبہ معظمہ انھیں ریت کے ٹیلوں کے اردگرد کہیں تھا۔ لیکن وہ پوری طرح اسکی نشاندی نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی وہ ریت کو ہٹا کر اس کی بنیادیں تلاش کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ اسکے باوجود بھی لوگ دور دراز سے یہاں آکر دعائیں کرتے تھے۔ اور جو بھی وہاں پہنچ کر دعا کرتا اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرماتا۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک جتنے انبیا کرام دنیا میں تشریف لاتے رہے وہ بھی بیت اللہ شریف کی خاص جگہ کے تعین نہ ہونے کے باوجود یہاں آکر بیت اللہ کا حج کرتے رہے یہاں تک اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو کعبہ معظمہ کی خاص جگہ اور اس کی بنیادوں پر مطّلع فرمایا تو آپ نے انھیں بنیادوں پر کعبہ معظمہ کی بنیادیں اٹھائیں اور نئے سرے سے انھیں بنیادوں پر تعمیر مکمل فرمائی۔

(ارشاد الساری الی مناسک ملا علی القاری ص ۲۲)

مذکورہ آیت کریمہ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ شریف کی بنیادیں پہلے موجود تھیں انھیں پر حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے عمارت بنائی اسی آیت کریمہ کے تحت حضرت امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں؛

فان هذا صريح فی ان تلک القواعد كانت موجودة متهدمة الا ان ابراهيم عليه السلام رفعها وعمرها. (تفسیر کبیر ج۴ ص۶۳)

ترجمہ: یہ اس بات پر واضح دلالت کر رہی ہے کہ بیت اللہ شریف کی بنیادیں منہدم حالت میں موجود تھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں بلند کیا اور تعمیر فرمایا۔

سورہ حج میں ارشاد ہے۔ واذ بوّأنا ابراهيم مكان البيت (الحج ۲۶)

ترجمہ: اور جب ہم نے ابراہیم کو اس گھر کا ٹھکانا ٹھیک بتا دیا۔

اس آیت سے بھی یہی مستفاد ہو رہا ہے کہ کعبہ معظّمہ کی جگہ پہلے سے ہی متعین چلی آ رہی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے بارے میں مورخین فرماتے ہیں کہ یہ عمارت ۹ گز اونچی اور ۳۰ گز طویل اور ۲۳ گز عریض تھی اور اس پر چھت نہیں تھی۔ اس کے اندر ایک کنواں تھا جس میں نذر و نیاز ڈالدی جاتی تھی جو کعبہ پر نثار کی جاتی تھی۔

تعمیر عمالقہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے انہدام کے بعد عمالقہ نے کعبہ معظّمہ کی تعمیر کی عمالقہ عملیق یا عملاق نامی شخصیت کی اولاد میں سے تھے۔ عملیق یا عملاق حضرت نوح وعلیہ السلام کے پوتے لاوذ بن سام بن نوح کا بیٹا تھا۔ (سیرت حلبیہ ج اوّل ص۱۶۲)

اور بعض مورخین کے نزدیک عمالقہ مصر یا شام کے شاہی خاندان سے تعلق

رکھتے تھے۔ (ارشاد الساری ص ۲۲)

علامہ زرقانی لکھتے ہیں۔

ثم العمالقه ثم جرهم رواه ابن ابی شیبة وابن راهویه وابن جریر وابن ابی حاتم والبیهقی فی الدلائل عن علی ان بناء ابراهیم لبث ما شاء الله تعالیٰ ان یلبث ثم انهدم فبنته العمالقة ثم انهدم فبنته جرهم ثم قصیٰ بن کلاب نقله الزبیر بن بکاروجزم به الماوردی ثم قریش.

(شرح مواهب لدنیه ج اوّل ص ۳۸۴)

حضرت ابرہیم کی تعمیر کے بعد عمالقہ نے کعبہ کی تعمیر کا شرف حاصل کیا اور ان کے بعد قبیلہ جرھم نے۔اس کو ابن ابی شیبہ اور ابن راھویہ اور ابن جریر وابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔اور امام بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم کی تعمیر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا قائم رہی پھر وہ منھدم ہو گئی عمالقہ نے کعبہ کی تعمیر کی اور ان کے بعد جرہم نے اور ان کے بعد قصی بن کلاب نے تعمیر کی اس روایت کو زبیر بن بکار نے بھی نقل کیا ہے اور اسی پر علامہ ماوردی نے جزم کا اظہار کیا ہے۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں قصی کی تعمیر کے بعد قریش نے کعبہ معظّمہ کی از سر نو تعمیر کی۔بعض مورخین نے عمالقہ کی تعمیر میں توقف فرمایا ہے۔اسکی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مکہ معظّمہ میں جو قبیلہ آباد تھا وہ جرہم قبیلہ تھا۔اور یہی قبیلہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کے بعد کعبہ کا متولی بنا اور جرھم قبیلہ کے بعد کعبہ معظمہ کی تولیت قبیلہ خزاعہ کے پاس آ گئی تھی۔عمالقہ کے پاس تو کبھی بھی کعبہ کی تولیت نہیں آئی۔جب ان کے پاس کعبہ کی تولیت آئی ہی نہیں تو انھوں نے اسکی تعمیر کیسے کی؟

علامہ حلبیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ممکن ہے کہ جس زمانے میں قبیلہ جرھم کعبہ کا متولی تھا اس زمانے میں عمالقہ اہل ثروت ہوتے ہوں اور جرھم متولی ہونے کے باوجود مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے کعبہ معظمہ کی تعمیر میں حصہ نہ لے سکے ہوں اور عمالقہ نے ان کی اجازت سے کعبہ کی تعمیر کی ہو۔ اسکی تائید میں علامہ حلبی نے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت بھی نقل کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ واقعی اس دور میں عمالقہ کی معاشی حالت بہت اچھی تھی۔ چنانچہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔

عمالقہ بڑے طاقت ور اور مالدار تھے لیکن جب انھوں نے معاصی کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے شوکت وثروت چھین لی اور ان پر ایک خاص قسم کی چونٹیوں کا عذاب نازل کیا تو وہ مکہ معظمہ سے بھاگ گئے اور متفرق ہو کر ہلاک ہو گئے۔

(انسان العیون مشھور سیرت حلبیہ ج اوّل ص ۱۶۲ مطبوعہ دار احیاء اشرات الاسلامی بیروت)

بعض مورخین کے نزدیک عمالقہ کی تعمیر قبیلہ جرھم کی تعمیر کے بعد ہوئی ہے سیرت حلبیہ میں ہے کہ معروف مورخ علامہ فاکہیؒ کی اخبار مکہ کے مطابق جرھم کی تعمیر عمالقہ کی تعمیر سے مقدم تھی۔ لیکن علامہ حلبی اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جرہم کی تعمیر کا عمالقہ کی تعمیر پر مقدم ہونا تاریخی اعتبار سے درست نہیں کیونکہ اہل تاریخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مکہ معظمہ پر عمالقہ کا اقتدار وتسلّط جرھم کے اقتدار سے پہلے رہا ہے جرھم کے اقتدار کے بعد مکہ معظمہ پر صرف قبیلہ خزاعہ کا اقتدار رہا ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کعبہ معظمہ کی تعمیر عمالقہ نے بھی کی تھی اور ان کی تعمیر قبیلہ جرھم کی تعمیر سے مقدم تھی۔

مؤرخ شہیر علامہ ازرقی بھی عمالقہ کی تعمیر جرھم سے پہلے بیان فرماتے ہیں۔ اسی طرح علامہ طبری نے اپنی کتاب ''القری'' میں اسی قول کو اختیار کیا ہے

درحقیقت یہ دونوں قومیں ہم عصر تھیں اور ان کے مابین مدتوں زبردست جنگ وجدال کا سلسلہ جاری رہا ہے جس کے باعث مؤرخین ان کی تعمیر کے تقدم وتاخر میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔

تعمیر جرہم:

جرہم بنی قحطان کا ایک قبیلہ تھا قحطان یمن کا رئیس تھا جسکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ پہلا شخص تھا جس نے عربی زبان میں گفتگو کی اس کی نسل میں سے جرہم قبیلہ مکہ میں آکر آباد ہوا جب یہ قبیلہ مکہ مکرمہ آیا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ پہلے ہی وہاں سکونت پزیر تھے اس قبیلے نے بھی وہیں سکونت اختیار کرلی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اس قبیلے کی ایک خاتون سے شادی ہوگئی اسی قبیلے سے آپ نے اور آپ کی اولاد نے عربی زبان سیکھی کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مادری زبان عبرانی یا سریانی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ان کے فرزند نابت کعبہ کے متولی بنے ان کے انتقال کے بعد ان کے نانا مضاض بن عمر متولی ہوئے۔ بنو اسماعیل ننھیالی رشتے کی وجہ سے ان کے مطیع ہوگئے اس طرح بنو اسماعیل اور بنو جرہم پر مضاض حکومت کرنے لگا۔ اور اسکے بعد قبیلہ جرہم کی صدیوں تک مکہ مکرمہ میں حکومت رہی ان کے عہد میں ایک مرتبہ زبردست سیلاب آیا جس سے کعبہ معظمہ کی عمارت منہدم ہوگئی تو جرہم نے اسے ازسرے نو تعمیر کیا۔

تعمیر قصی بن کلاب:

قصی بن کلاب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجداد میں سے ہیں۔ یہ بڑے

جہاندیدہ اور بزرگ ودانشمند انسان تھے۔ یہ وہ پہلے دوراندیش سردار ہیں جنھوں نے قریش کی منتشر افرادی قوت کو جمع کیا اور انھیں اطراف و جوانب سے اٹھا کر مکہ معظمہ میں لا کر آباد کیا تا کہ انہیں جب ضرورت پڑے یہ ان کے لئے دست و بازوں ثابت ہوں۔ قصی کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور قریش کو حرم شریف کی کلیدی اسامیوں پر بالادستی حاصل ہو گئے۔ قصی نے سیادت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی منصوبہ بندی کی عوام اور حجاج کی ضروریات کا جائزہ لیا لوگوں کو پیش آمدہ مشکلات کی فہرست تیار کی پھر ان کے حل کے لئے باقاعدہ رفاہی اور اصلاحی پروگرام وضع کئے جو تاریخ میں سقایہ، رفادہ، ندوہ اور حجابۃ کے نام سے مشہور ہیں۔

مکہ معظمہ میں جب قصی کی حکومت مستحکم ہوئی تو اس نے لوگوں کو جمع کر کے کعبہ شریف کی تعمیر کی طرف توجہ مبذول کروائی اس مقصد کے لئے معقول رقم کا بندبست کیا گیا کعبہ شریف کی بوسیدہ عمارت کو منہدم کر کے تعمیر نو شروع کر دی۔ نئے تعمیر میں انتھائی مضبوط اور عمدہ کام کروایا قریش میں قصی وہ پہلا انسان ہے جسے کعبہ معظّمہ کی تعمیر کا شرف حاصل ہوا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تقریباً ۱۳۰ سال پہلے قصی کی حکومت قائم ہوئی تھی۔

علامہ حلبیؒ کی تحقیق کے مطابق عمالقہ، جرھم اور قصی کی تعمیر کعبہ مکمل تعمیر نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک جزوی تعمیر اور مرمت تھی پوری تاریخ میں کعبہ معظّمہ کی مکمل تعمیر تین مرتبہ ہوئی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور قریش اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر کعبہ معظّمہ کی مکمل تعمیرات تھیں۔

والحق ان الکعبة لم تبن جمیعھا الا ثلاث مرات المرة الاولٰی بناء ابراھیم علیہ السلام والثانیة بناء قریش و کان بینھما الفاسنة

وسبعماتة سنة وخمس وسبعون سنة والثالثة بناء عبدالله بن الزبير وكان بينهما نحو اثنتين و ثمانين سنة . واما بناء جرهم والعمالقة و قصيّ فانما كان ترميماً ولم تبن بعد هدمها جميعها الامرتين مرة زمن قريش ومرة زمن ابن الزبير (سیرت حلبیہ ج اوّل ص ۱۷۲)

ترجمہ: تحقیقی بات یہ ہے کہ کعبہ معظّمہ کی پوری تاریخ میں صرف تین مرتبہ مکمل تعمیر ہوئی ہے۔ پہلی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے اور دوسری قریش کی تعمیر ہے ان دونوں کے درمیان ۲۷۷۵ دوہزار سات سو پچھتر سال کا فاصلہ ہے۔ اور تیسری مکمل تعمیر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ہے۔ ان کی اور قریش کی تعمیر کے درمیان تقریباً ۸۲ بیاسی سالوں کا فاصلہ ہے جرھم، عمالقہ اور قصی کی تعمیرات مکمل نہیں تھیں بلکہ یہ بعض حصوں کی مرمت پر مشتمل تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے بعد کعبہ معظّمہ کی پوری عمارت کے انہدام کے بعد مکمل تعمیر صرف دو مرتبہ ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ قریش کے زمانے میں اور دوسری مرتبہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد حکومت میں۔

تعمیر قریش:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے کچھ عرصہ قبل جبکہ آپ کی عمر مبارک ۳۵ سال تھی قریش نے کعبہ معظّمہ کی عمارت تجدید کرنے کا ارادہ کیا۔ سابقہ عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی کعبہ معظّمہ نشیب میں واقع ہونیکی وجہ سے بارش کے سیلابی پانی نے عمارت کو منہدم ہونے کے قریب پہنچا دیا تھا۔ دیواریں بھی کچھ زیادہ اونچی نہ تھیں زیادہ سے زیادہ قد آدم کے برابر تھیں ان کے اوپر کوئی چھت بھی نہ تھی۔ اور تعمیر اس طرح ہوئی تھی کہ بس پتھر پر پتھر رکھے ہوئے تھے کسی چیز سے ان کو چسپاں نہیں کیا گیا

تھا۔دروازہ بھی زمین کے برابر تھا۔کعبہ کا خزانہ اس وقت ایک کنویں میں تھا جو عمارت کے اندر بنایا گیا تھا۔بعض لوگ دیواریں پھاند کر وہاں تک رسائی حاصل کر لیتے اور سرقہ کے مرتکب ہو جاتے ان وجوہ سے اکابرین قریش نے فیصلہ کیا کہ بلند اور پختہ عمارت بنا کر اوپر چھت ڈالدی جائے اسی زمانے میں ایک رومی تاجر کے بحری جہاز کو سمندر کی موجوں اور طوفانی ہواؤں نے جدہ کی بندرگاہ پر لا پھینک دیا بقول بعض مؤرخین شعبیہ کے مقام (جو جدہ سے پہلے حجاز کی بندرگاہ تھی) لا پھینکا تھا۔جس کی وجہ سے جہاز پاش پاش ہو گیا۔بعض روایات کے مطابق اس جہاز میں شاہ روم قیصر نے حبشہ کے ایک گرجا گھر کی تعمیر کے لئے عمارتی سامان لوہا لکڑی سنگ مرمر وغیرہ بھیجا تھا جہاز ٹوٹنے کے بعد اب عمارتی سامان کی واپسی کی کوئی صورت نہ تھی ۔ جہاز ٹوٹنے کی خبر سنکر قریش کے چند افراد وہاں پہنچ گئے ۔اور وہ عمارتی سامان یا شکستہ جہاز کی لکڑیاں خریدیں اس جہاز میں باقوم نامی ایک ایک رومی معمار بھی تھا اور مکہ معظمہ میں ایک قبطی نجار لکڑی کا کام کرنے کے لئے موجود تھا باقوم سے بات چیت کر کے اس کو بھی تعمیر کعبہ کا کام انجام دینے کے لئے راضی کروالیا اس کے بعد بنی مخزوم میں سے ایک شخص ابو دھب بن عمرو بن عائذ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد گرامی حضرت عبداللہؓ کا ماموں تھا اٹھا اور کعبہ کی دیوار سے ایک پتھر نکال کر اسی جگہ واپس رکھدیا اور پھر قریش سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

یا معشر قریش لا تد خلوا فی بنائها من کسبکم الا طیباً و لا ید خل فیها مهر بغی و لا بیع رباً و لا مظلمة احد من الناس (اسیرة النبویة از ابن کثیر ج اوّل ص ۲۷۷)

اے قریش اس کی تعمیر میں اپنی حلال کمائی لگاؤ اس میں زنا کاری سود یا کسی شخص پر ظلم کر کے حاصل کی ہوئی کمائی داخل نہ ہونے پائے۔

قریش کے لوگ کعبہ کی عمارت کو منہدم کرنے سے ڈر رہے تھے ولید بن مغیرہ نے کدال ہاتھ میں لی اور کہا اے اللہ۔ہم دین سے منحرف نہیں ہوئے ہیں۔ہم خیر کے سوا کچھ نہیں چاہتے یعنی کسی بری نیت سے کعبہ کو نہیں ڈھا رہے ہیں یہ کہہ کر اس نے کعبہ معظمہ کی عمارت کے ایک حصہ کو ضرب لگائی اور رک گیا۔سب لوگ رات بھر اسی انتظار میں رہے کہ ولید پر کوئی آفت آتی ہے یا نہیں۔اگر آفت آجائے تو ہم کام روک دیں گے۔اور جو پتھر اکھڑا ہے اسے اسی کی جگہ رکھ دیں گے۔اگر وہ کسی آفت میں گرفتار نہ ہوا تو کام جاری رکھیں گے۔صبح تک ولید پر اس فعل کا کوئی وبال نہ پڑا یہ دیکھ کر مختلف قبیلوں نے مختلف سمتوں سے کعبہ کی عمارت کے انھدام کا کام اپنے اپنے ذمہ لے لیا۔اور بناء ابراہیمی تک دیواریں توڑ دی گئیں۔پھر سارے لوگ پتھر اٹھا اٹھا کر لانے اور عمارت تعمیر کرنے میں شریک ہو گئے۔اسی نئی تعمیر کے موقع پر حلال کمائی کی کمی کے باعث کعبہ کے ایک حصے کو باہر چھوڑ دیا گیا اور اس کے گرد دیوار کھینچ دی گئی۔اس کو حجر بھی کہتے ہیں اور حطیم بھی اسی جگہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام مدفون ہیں۔

جب قریش کی تعمیر اس مقام تک پہنچ گئی جہاں حجر اسود نصب کیا جانا تھا تو ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اسے حاصل ہو۔اس پر اتنا جھگڑا ہوا کہ آپس میں لڑائی تک کا خطرہ پیدا ہو گیا چار پانچ روز یہی اختلاف چلتا رہا۔آخر ایک روز حرم میں سب لوگ مشورہ کے لئے جمع ہو گئے بنی مخزوم میں سے ایک شخص ابوامیہ بن مغیرہ جو اس وقت سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا۔اٹھ کر اس نے تجویز پیش کی کہ جو شخص اس مسجد کے دروازے سے پہلے داخل ہو وہ اس کا فیصلہ کر دے۔دروازہ سے مراد باب بنی شیبہ تھا اور بعض روایات کے مطابق باب الصفا تھا۔اس تجویز کو سب نے تسلیم کیا۔اب خدا کا

کرنا ایسا ہوا کہ سب سے پہلے داخل ہونے والے رسول اللہ ﷺ تھے۔لوگوں نے آپ کو دیکھتے ہی کہا۔

هذا لامين رضينا به حكماً هذا محمد.

یہ امین ہیں ہم سب ان کے فیصلے پر راضی ہیں یہ تو محمد ہیں۔

مسند احمد کی روایت میں ہے۔

لوگوں نے آپ کو دیکھتے ہی کہا۔اتا کم الامین۔تمہارے پاس امین آ گیا۔

رسول اللہ ﷺ کو جب پتہ چلا کہ اس قضیہ کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے تو آپ نے فرمایا ایک کپڑا لاؤ لوگ کپڑا لے آئے آپ نے حجر اسود کو اس کپڑے میں رکھ دیا پھر فرمایا ہر قبیلہ ایک ایک طرف سے اس کپڑے کو پکڑ لے اور سب ملکر حجر اسود کو اٹھائیں جب حجر اسود اس مقام پر پہنچ گیا جہاں اس کو نصب کرنا تھا تو آپ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے وہاں لگا دیا۔اس طرح اس مقدس کام میں شرکت کا شرف بھی سب کو حاصل ہو گیا فتنہ وفساد کے بھڑکنے والے شعلے بھی اپنی موت آپ مر گئے اور سب کے دلوں میں مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ گئی اور پوری قوم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ آپ کس قدر دانشمند انسان ہیں اتنے بڑے خطرناک قضیئے کو بہترین طریقے سے حل کر کے قریش کو خانہ جنگی سے بچالیا۔ (البدایہ والنہایہ ج۲ص ۲۷۸)

تعمیر قریش کی کیفیت

قریش نے کعبہ کی تعمیر میں دیواریں بہت بلند بنائیں پہلے کعبہ غیر مسقّف تھا انھوں نے اس پر چھت بھی ڈالدی پہلے کعبہ کے دو دروازیں تھے ایک شرقی اور دوسرا غربی انھوں نے دخول وخروج کے لئے مشرقی ومغربی سمت میں دو الگ الگ

دروازے تعمیر کرنے کے بجائے صرف ایک دروازہ رکھا۔ اور رکھا بھی کافی اونچائی پر تاکہ بیت اللہ میں وہی داخل ہو سکے جسکو وہ اندر جانے کی اجازت دیں۔ سعید بن عمروؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔

رأیت قریشاً یفتحونّ البیت فی الجاهلیة یوم الاثنین ویوم الخمسین فکان حجابه یجلسون علی بابه فیرقی الرجل فاذا کانوا لایریدون دخوله دفع فطرح (الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۲۴۷)

میں نے قریش کو دیکھا کہ وہ دور جاہلیت میں پیر اور جمعرات کے روز بیت اللہ شریف کا دروازہ کھولتے تھے۔ چنانچہ دربان لوگ دروازے پر بیٹھ جاتے تھے جب کوئی شخص سیڑھی پر چڑھتا جسے وہ داخل ہونا پسند نہ کرتے تھے تو اسے دھکا دیکر پرے دھکیل دیتے تھے۔

علامہ بلاذری لکھتے ہیں:

کعبہ کا دروازہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جرھم وعمالیق کے عہد سے قریش کی تعمیر تک زمین پر تھا۔ اسے کرسی نہیں دی گئی تھی تعمیر کے وقت ابوحذیفہ بن مغیرہ نے قریش سے کہا اے قوم کعبہ کا دروازہ بلند کرو کہ ان کے سوا جن کا آنا تمہیں پسند ہو کوئی دوسرا اندر نہ آ سکے۔ اگر کبھی کوئی ایسا شخص اندر آنا چاہے جس کا اندر آنا تمہیں پسند نہ ہو تو اس صورت میں تم اُسے اوپر سے پھینک سکو اور وہ گر جائیگا۔ اور دوسرے کے لئے باعث عبرت ہوگا چنانچہ قریش نے کعبہ کا دروازہ کرسی دیکر بلند کر دیا۔

(فتوح البلدان مترجم اردو حصہ اول ص ۸۰ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

هل تدرین لم کان قومک رفعوا بابها؟

قلت لا قال تعززاً الا ید خلها الا من ارادوا فکان الرجل اذا کرهوا

ان یدخلها دعوهٔ یرتقی حتی اذا کان ان یدخلها دفعوهٔ فسقط

(صحیح ابن خزیمه ج رابع ص ۲۲۳)

تم جانتی ہو کہ تمہاری قوم نے کعبہ کا دروازہ کیوں بلند رکھا؟

میں نے عرض کیا میں نہیں جانتی ۔آپ نے فرمایا انھوں نے اپنی بڑائی جتانے کیلئے اتنا بلند رکھا تھا۔تاکہ جسے چاہیں اسی کو داخل ہونے دیں۔جب کوئی ایسا شخص داخل ہونا چاہتا جسکا داخل ہونا ان کو پسند نہ ہوتا تو اُس کو سیڑھی چڑھنے دیتے جب داخل ہونے کے قریب پہنچ جاتا تو دھکا دیدیتے تھے اور وہ اوپر سے نیچے گر جاتا تھا۔

کعبہ معظّمہ کا دروازہ تعمیر کے تمام ادوار میں زمین کے ساتھ تھا قریش نے اپنے دور میں تجدید تعمیر کے دوران اپنی ھیبت و دبدبہ قائم کرنے کے لئے زمین سے کرسی دیکر کافی بلندی پر رکھا

علامہ حلبیؒ فرماتے ہیں

کان باب الکعبة کان علی عهدالعمالیق وجرهم وابراهیم علیه السلام لاصقًا بالارض حتی رفعته قریش.

(انسان العیون مشهور سیرت حلبیه ج ا ص ۱۷۴ مطبوعه بیروت)

کعبہ کا دروازہ عمالقہ و جرہم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں زمین کیساتھ لگا ہوا تھا قریش نے اپنے عہد میں اس کو زمین سے بلند کردیا۔

قریش نے کعبہ کی تعمیر میں ایک تبدیلی دروازے میں کی اور دوسری تبدیلی حجر یعنی حطیم کے حصے کو کعبہ معظّمہ کی دیوار سے باہر رکھا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے تعمیر کے آغاز میں یہ عہد کیا تھا کہ تعمیر میں صرف حلال و پاکیزہ کمائی صرف کی جائے گی۔ دوران تعمیر حلال کمائی کی کمی ہونے کی وجہ سے کعبہ معظّمہ کے ایک حصے کو اندر شامل نہ

کر سکے اور اس کو کعبہ عمارت سے خارج کر کے اس کے باہر سے ایک دیوار کھینچ دی تا کہ وہ حصہ نمایاں رہے اور لوگوں کو پتہ چلے کہ یہ جگہ درحقیقت کعبہ معظّمہ کا حصہ ہے۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

یا عائشہ لولا ان قومک حدیثوا عھد بجاھلیۃ لامرت بالبیت فھدم فادخلت فیہ مااخرج منہ والزقتہ بالارض وجعلت لہ بابین باباً شرقیاً وباباً غربیاً فبلغت بہ اساس ابراھیم علیہ السلام

(بخاری ۱-۲۱۵ صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۳۰ سنن نسائی ج ۲ ص ۲۷)

اے عائشہؓ اگر تیری قوم کا زمانہ جاہلیت کے قریب نہ ہوتا تو میں بیت اللہ شریف کو منہدم کرنے کا حکم دیتا اور جن چیزوں کو قریش نے کعبہ سے نکال دیا ہے انہیں دوبارہ اس میں شامل کر دیتا (یعنی حطیم اور بنیادوں کا آدھا حصہ) اور دروازے کو زمین کے برابر کر دیتا اور اس کے دو دروازے بناتا ایک مشرق کی جانب دوسرا مغرب کی جانب اس طرح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں کی تعمیر کرتا۔

تعمیر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ

۶۴ھ میں یزید نے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے لوگوں سے اپنی بیعت لینے اور بیعت سے انکار کرنے والوں سے جنگ کرنے کے لئے ایک لشکر جرار بھیجا چونکہ مکہ اور مدینہ کے رہنے والے لوگوں نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی بیعت کر لی تھی۔ اس لئے یزید کی بیعت کرنے سے صاف انکار فرما دیا۔ نتیجتاً فریقین کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ شامی فوجوں نے منجنیق کے ذریعہ آگ برسائی جس سے کعبہ کی چھت اور پردے جل

گئے دیواریں کافی حد تک کمزور ہو گئیں۔ اسی اثناء میں یزید مر گیا اور فوجیں وہاں سے واپس آ گئیں تو حضرت سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ نے کعبہ کو منہدم کر کے از سر نو تعمیر کیا جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خواہش کے مطابق حطیم کے حصہ کو اندر داخل کیا اور دروازے کو زمین کے قریب کر دیا کہ ہر شخص اس میں داخل ہو سکے۔ اور دوسرا دروازہ اس کے مقابل دیوار میں مغرب کی جانب قائم کر دیا تا کہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوں اور دوسرے سے نکلتے رہیں اور جانے میں مزاحمت نہ ہو۔ جمادی الاخری ۶۴ھ میں تعمیر شروع ہوئی اور رجب ۶۴ھ یا ۶۵ھ میں تعمیر مکمل ہوئی۔ حضرت عبداللہ زبیرؓ نے اس کی خوشی میں بہت بڑی دعوت کی جس میں سو اونٹ ذبح کئے گئے اور اظہار تشکر کے لئے تنعیم سے چل کر لوگوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ عمرہ ادا کیا اور اس سعادت عظیم کے حصول پر بارگاہ خداوندی میں سجدہ شکر بجا لائے۔

تعمیر حجاج بن یوسف

سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر کردہ عمارت تقریباً دس سال تک قائم رہی جب حجاج بن یوسف نے مکہ پر حملہ کیا اور آپ کو بڑی بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ زمام حکومت حجاج بن یوسف کے ہاتھ آئی تو اس نے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کو لکھا کہ عبداللہ بن زبیر نے کعبہ میں تغیر پیدا کر دیا ہے اور اس کو اس حال پر نہیں چھوڑا جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا۔ اس نے از راہ بغض حکم دیا کہ اس عمارت کو گرا دیا جائے جو ابن زبیرؓ نے تعمیر کرائی ہے اور جن بنیادوں پر پہلے تعمیر کی گئی تھی انہیں پر تعمیر کی جائے اس پر حجاج نے قدیم طرز کے موافق مشرقی دروازہ کو اونچا کر دیا اور اس کے بالمقابل دروازہ کو بند کر دیا اور حطیم کے حصہ کو حسب سابق باہر رکھا

گیا۔ ۷۳ھ میں یہ تغیر ہوا اس کے بعد سے بیت اللہ شریف ایک عرصہ تک اسی حال پر رہا کہ اس کی تین جانبیں حضرت ابن زبیر کی تعمیر سے تھیں اور حطیم کی جانب حجاج کی تعمیر سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اب تک اصل تعمیر یہی ہے آئندہ کے تغیرات مرمتیں ہیں مستقل تعمیریں نہیں ہیں۔

جب بنی امیّہ کا عہد حکومت اختتام پزیر ہوا ان کی جگہ عباسی خلافت کا آغاز ہوا تو ان کے ایک خلیفہ مہدی نے ارادہ کیا کہ اس عمارت کو گرا کر پھر کعبہ کو اپنی اصلی بنیادوں پر تعمیر کرے اس نے اس بارے میں حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ۔ سے مشورہ کیا اس عالم ربانی نے ایسا کرنے سے منع فرمادیا اور اسکی وجہ یہ بیان فرمائی۔ انّی اخشی أن تتخذھا الملوک لعبۃ۔

(سیرت جلیبہ ج ا ص ۱۸۲)

میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں اسطرح کعبہ مقدسہ بادشاہوں کا کھلونا بن جائے۔ یعنی جس کا جی چاہے گا کعبہ کی پہلی عمارت کو گرا کر اپنے نام سے نئی عمارت بنانے لگے۔ اس طرح اس کا تقدس مجروح ہوگا۔ خلیفہ مہدی نے حضرت امام مالک رحمہ اللہ کی رائے کے سامنے سر جھکا دیا اور آج تک کعبہ کی وہی عمارت قائم ہے۔

تعمیر سلطان احمد ترکی

۱۰۲۱ھ میں سلطان احمد ترکی نے چھت تبدیل کی اور دیواروں میں جہاں بوسیدگی آگئی تھی اس کی مرمت کرائی میزاب الرحمۃ کو درست کیا یہ درحقیقت پوری تعمیر کی تجدید نہیں بلکہ اصلاح و مرمت ہے۔

تعمیر سلطان مراد خان

۲۰ شعبان ۱۰۳۹ھ جمعرات کے دن بعد نماز عصر مکہ مکرمہ اور اس کے گرد ونواح اتنی شدید موسلا دھار بارش ہوئی کہ جسکی نظیر تاریخ میں پہلے نہیں ملتی جس کے سبب ایک زبردست سیلاب آیا سیلاب کا پانی مسجد کے اندر داخل ہوگیا۔ کعبہ معظّمہ کا اکثر حصہ منہدم ہوگیا اہل مکہ کے اکثر گھر بھی تباہ ہوگئے مسجد حرام میں بہت سارے لوگ خصوصًا بچے پانی میں ڈوب گئے۔ جب یہ خبر وزیر محمد باشا کو ملی تو علماء کرام کی ایک میٹنگ طلب کی علماء نے بالاتفاق کعبہ معظّمہ کی عمارت کو جلد تعمیر کرنے کا مشورہ دیا علامہ حلبی فرماتے ہیں ان علماء کرام کی مجلس مشاورت میں میں بھی شامل تھا میں نے اس بارے میں ایک عمدہ رسالہ لکھکر وزیر محمد باشا کی خدمت میں پیش کیا وزیر محمد باشا نے برموقع رسالہ پاکر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اس رسالے کا ترکی زبان میں ترجمہ کرا کے سلطنت ترکیہ کے اس دور کے بادشاہ سلطان مراد خان کو ارسال کیا۔ چنانچہ سلطان مراد خان کے حکم سے ۹۶۶ سال بعد کعبہ معظّمہ کی تعمیر نو کی گئی۔

(سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۱۷۲)

اس کو بعض مؤرخین صرف ترمیم بتاتے ہیں اور بعض تعمیر جدید۔

علامہ طاہر کردیؒ لکھتے ہیں۔

ھی العمارۃ الأخیرۃ الی یومنا ھذا (التاریخ القدیم ج ۳ ص ۲۰۳)

(سلطان مراد خان کی تعمیر کردہ) یہی عمارت ہمارے زمانے تک قائم چلی آرہی ہے۔

سعودی دور حکومت میں عمارت کعبہ کی تجدید

سلطان مراد عثمانی ترکی نے کعبہ معظّمہ کی تعمیر کا جو کام کرایا تھا اس کو ۳۷۵ سال کی طویل مدت گزر چکی تھی اور اب عمارت کی ایسی حالت تھی کہ اس کی تجدید وترمیم ضروری تھی۔ اسلئے سعودی حکومت نے حکم دیا کہ کعبہ معظّمہ کی تجدید وترمیم کی جائے چنانچہ محرم ۱۴۱۷ھ میں یہ کام شروع ہو کر چھ ماہ میں مکمل ہوا۔ بنیادوں کو مزید مضبوط کیا گیا۔ شاذوران کی مرمت کی گئی۔ دیواروں کی بیرونی جانب کو ہموار کیا گیا۔ دیواروں کے پتھروں کے درمیان سے پرانا مسالہ نکال کر نیا سیمنٹ مسالہ لگایا گیا۔ دونوں چھتوں کو از سر نو تعمیر کیا گیا تینوں ستونوں کو نئی لکڑی سے بنایا گیا۔ اس وقت کعبہ معظّمہ کی لمبائی ۱۴ میٹر ملتزم کی سمت کی لمبائی ۱۲،۸۴ میٹر اور حطیم کی سمت لمبائی ۱۱،۲۸ میٹر۔ اور رکن یمانی وحطیم کی سمت ۱۱،۱۲ ارکن یمانی اور حجر اسود کی لمبائی ۱۱،۵۲ میٹر ہے حجر اسود مطاف کی زمین سے ڈیڑھ میٹر کی بلندی پر ہے دروازہ زمین سے دو میٹر بلند ہے۔

☆☆☆

عصمت انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام

انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا گناہوں سے معصوم ہونا ضروری ہے۔ گناہوں سے معصوم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ انبیاء گناہ پر قدرت رکھنے کے باوجود گناہوں سے اجتناب کا ملکہ ومہارت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا فرمودہ فطرت سلیم اور وعدہ حفظ الٰہی کی بناء پر گناہوں کی رغبت اور ان کے تصور سے بھی منزّہ ہوتے ہیں۔ حفظ الٰہی کے وعدہ کے سبب ان سے گناہوں کا صدور ممکن ہی نہیں، شرعاً محال ہے۔

انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہر وقت ایسا مضبوط ترین اور قریب ترین رابطہ رہتا ہے کہ ہر وقت اللہ کی طرف سے ان کی مدد و تائید ہوتی ہے ان کے تمام اعمال خطا سے پاک اور صواب و درست ہوتے ہیں۔ اور وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ترجمان اور اس کی رضا کے مظہر ہوتے ہیں۔ انبیائے کرام قوانین کی تقویم اور شریعت کی تشکیل پر مامور ہوتے ہیں۔ اس لیے انبیاء کرام کا گناہوں سے معصوم ہونا نہایت ہی ضروری و لازم ہے۔

اگر نبوت کی حقیقت سے عصمت کو الگ کر لیا جائے تو انبیائے کرام کے لائے ہوئے دین کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ نہ ہی دین کا کوئی مفہوم قابل تسلیم رہ جاتا ہے۔ ان کی فطرت ہی حق و باطل کا معیار ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

انا انزلنا معهم الكتاب والميزان . (سورہ الحدید. آیت نمبر ۲۵)

ہم نے ان کے ساتھ کتاب و میزان کو اتارا .

یہ میزان انبیائے کرام کی وہ فطرت صالحہ ہوتی ہے جو خیر وشر کی معیار ہوتی ہے۔حق اور مزاج نبوت مترادف ہوتے ہیں۔حق وصداقت جب مجسم بن کر سامنے آتے ہیں تو پیکر نبوت بن جاتے ہیں۔

من رأنی فقد رأالحق جس نے مجھے دیکھا اس نے بلاشبہ حق کو دیکھا کا اعلان اس کا واضح ثبوت ہے۔

کفر کے سوا گناہوں کی دو قسمیں ہیں۔صغائر و کبائر ان میں سے ہر ایک کے دو حال ہیں ۔ یا ان کا صدور عمداً ہو گا یا سہواً یہ کل چار قسمیں بن جاتی ہیں۔ پھر ان چاروں اقسام میں سے ہر ایک قبل از بعثت یا بعد از بعثت ہو گی۔انبیاء علیہم السلام سے کبائر کا صدور بعد از بعثت خواہ عمداً ہو یا سہواً، شرعا محال ہے ۔اور قبل از نبوت اکثر مشائخ کے نزدیک محال نہیں ۔اسی طرح عمداً بعد از نبوت صغائر کا صدور بھی محال ہے۔ سہواً میں اختلاف ہے۔اکثر مشائخ جواز (یعنی امکان) کے قائل ہیں۔لیکن جو صغائر خسّت ودناءت کا موجب ہوں انبیاء کرام علیہم السلام سے ان کا صدور ممکن نہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمہور اہل سنت کے نزدیک انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام اپنی نبوت کے زمانہ میں کبائر سے مطلقاً اور صغائر سے عمداً معصوم ہوتے ہیں۔

شرح مقاصد میں علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ عصمت انبیاء کرام کی بحث میں رقمطراز ہیں۔

والمذهب عندنا منع الكبائر بعد البعثة مطلقا والصغائر عمدا لا سهواً لكن لا يصرون ولا يقرون بل ينبهون فيتنبهون وذهب امام الحرمين منا وابوهاشم من المعتزله الیٰ تجويز الصغائر عمداء لنا انه لو صدر عنهم الذنب لزم الامور كلها منتفية.

(شرح مقاصد ج ۲ ص ۱۹۳ مطبوعه دارالمعارف نعمانیه لاهور)

ترجمہ: ہمارا مذہب یہ ہے کہ انبیائے کرام سے بعثت کے بعد کبائر کا صدور مطلقاً اور صغائر کا عمداً ممنوع ہے۔ البتہ سہواً صغائر کا صدور ممکن ہے۔

لیکن اس پر انبیائے کرام برقرار نہیں رکھے جاتے۔ انہیں فوری تنبیہ کی جاتی ہے تو وہ متنبہ ہو جاتے ہیں ہم (اہل سنت) میں سے امام الحرمین اور معتزلہ میں سے ابو ہاشم انبیاء کرام سے صغائر کے قصداً صدور کے قائل ہیں۔ لیکن ہماری دلیل یہ ہے کہ اگر ان سے گناہ کا صدور ممکن ہو تو پھر بہت سارے ایسے امور لازم آئیں گے جو باطل اور منتفی ہیں۔

علامہ عبدالعزیز پر ہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح عقائد کی شرح نبراس میں عصمت انبیاء کی بحث کے تحت فرماتے ہیں۔

بقیٰ ههنا تنبیهان التنبیه الاول المذکور فی کلام الشارح وهو مذهب عامة المتکلمیں و خالفهم جمهور جمع من العلماء فذهبوا الیٰ العصمة عن الصغائر والکبائر قبل الوحی وبعده وهو مختار ابی المنتهی، شارح الفقه الاکبر والشیخ عبدالحق المحدث الدهلوی وقال بعض المشائخ زلات الانبیاء یسبب زیادة قربهم الیٰ الله تعالیٰ سبحانه و فی تفسیر النسفی ان آئمة سمرقند لا یطلقون اسم الزلة علیٰ افعال الانبیاء لانها نوع ذنب ویقولون فعل الفاضل وترک المفضول فعوتبوا علیه لان ترک الا فضل منهم کترک الواجب من الغیر وقال امام الائمة الشیخ ابو منصور الماتریدی الانبیاء احق بالعصمة من الملائکة لان الامم مأمورون بالاتباع للانبیاء لاالملائکة. (النبراس ص ۳۸۴ مطبوعه مکتبه حقانیه ملتان)

یعنی اس مقام پر دو قسم کی تنبیہ کرنی مقصود ہے۔

پہلی بات جس پر تنبیہ کرنی مقصود ہے۔ وہ یہ ہے کہ شارح کے کلام میں جو کچھ

مذکور ہوا ہے۔ وہ جمہور علماء متکلمین کا مذہب ہے۔ جبکہ علماء کی ایک بڑی جماعت نے جمہور متکلمین کی اس بارہ میں مخالفت کی ہے ان کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام وحی سے قبل اور وحی کے بعد صغائر اور کبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ یہ مذہب فقہ اکبر کے شارح علامہ ابوالمنتہی اور شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث رحمہما اللہ تعالیٰ دہلوی کا مختار ہے۔ بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام کی لغزشیں ان کے لیے قرب الٰہی میں اضافے کا باعث ہوتی ہیں۔

تفسیر نسفی میں ہے کہ آئمہ سمرقند انبیائے کرام کے افعال پر لغزش کا اطلاق نہیں کرتے کیونکہ لغزش بھی ایک قسم کا گناہ ہے اور وہ اس کے بجائے کہتے ہیں کہ نبی نے فاضل عمل (بہتر عمل) کیا اور افضل عمل (زیادہ بہتر عمل) کو چھوڑا کیونکہ انبیائے کرام کا افضل کو ترک کرنا ایسا ہے جیسے غیر نبی کا واجب کو ترک کرنا۔ امام الائمہ شیخ ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں انبیائے کرام فرشتوں کی بہ نسبت عصمت کے زیادہ مستحق ہیں۔ کیونکہ لوگ انبیاء کرام کی اتباع پر مامور ہیں نہ کہ فرشتوں کی اتباع پر۔

لہٰذا وہ ہستیاں جن کی اتباع کرنی واجب ہے۔ ان کا گناہوں سے معصوم ہونا زیادہ ضروری ہے بہ نسبت ان کے جن کی اتباع لازم نہیں۔

حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کا مختار مذہب

علامہ پرہاروی فرماتے ہیں:

واختار القاضی عیاض عصمتھم بعد الوحی عن کل صغیرۃ و کبیرۃ ونسب الیٰ طائفۃ من المحققین وقال قد اختلف فی عصمتھم قبل النبوۃ والصحیح انشاء اللّٰہ تعالیٰ تنزیھھم من کل عیب انتھیٰ کلام القاضی وزبدۃ مستدلاتھم ان النبی واذا نھی عما فعل صار مطعنا للناس و کان فعلہ

عذرا للعوام.

یعنی قاضی عیاض کا مختار مذہب یہ ہے کہ انبیائے کرام بعداز وحی ہر صغیرہ وکبیرہ گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ اور اسے محققین علماء کی ایک جماعت کا مذہب قرار دیا۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں قبل از نبوت انبیائے کرام کے گناہوں سے معصوم ہونے میں اختلاف پایا جاتا ہے، صحیح مذہب انشاءاللہ یہ ہے کہ انبیاء ہر عیب سے منزہ و پاک ہیں۔

ان حضرات کے استدلالات کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی جب ایسے عمل سے لوگوں کو منع کرے گا جو عمل وہ خود کر چکا ہے تو لوگ نبی پر طعن کریں گے اور نبی کا ایسا فعل عوام کے لیے عذر بن جائے گا یعنی عوام کہیں گے اگر ہم نے یہ کام کیا تو کیا ہوگا نبی سے بھی تو ایسا کام صادر ہو چکا ہے۔

عصمت انبیاء کرام پر دلائل

انبیاء کرام کے گناہ کبیرہ سے مطلقا اور صغیرہ سے عمداً معصوم ہونے پر جو دلائل علماء کرام نے قائم فرمائے ہیں ان کا علامہ عبدالعزیز فرہاروی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

استدل الامام الرازی وأتباعه علیٰ عصمة الانبیاء عن الکبیرة مطلقا والصغیرة عمداً بوجوہ احدھا قوله تعالیٰ لا ینال عھدی الظّٰلمین. والمذنب ظالم لا یقال المراد عھد الامامة لانا نقول لو سلم فعھد النبوة اولیٰ. ثانیھا وجوب اتباعھم فی اقوالھم وافعالھم وثالثھا یلزم ان یضاعف عذابھم کما قال اللہ تعالیٰ یا نساء النبی من یات منکن بفاحشة مبینة یضاعف لھا العذاب ضعفین. رابعھا الفاسق مردود الشھادة فیلزم تکذیبھم، خامسھا الامر بالمعروف والنھی عن المنکر واجب او ندب

فیکون زجرھم مشروعا وھو باطل اجماعا لقولہٖ تعالیٰ ان الذین یوذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ ، سادسھا العاصی یستحق العذاب بالنصوص وکون النبی یستحقہ باطل اجماعا، السابع قولہ تعالیٰ ولقد صدق علیھم ابلیس ظنہ فاتبعوہ الا فریقا من المومنین ، فان خرجت الانبیاء عن الفریق لزم تفضیل غیرھم لقولہٖ تعالیٰ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم الثامن قد ذم اللہ سبحانہ وتعالیٰ الذین یامرون الناس بالبر وینھون انفسھم وکون النبی مذموماً باطل اجماعا ، التاسع قولہ تعالیٰ بعد ذکر الانبیاء انھم کانوا یسارعون فی الخیرات، والجمع المعرف باللام عام فیعم کل خیر من فعل وترک، العاشر قولہ تعالیٰ حکایۃ عن ابلیس لأغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین، وقال فی ابراھیم واسحق ویعقوب انا اخلصنٰھم وفی یوسف انہ من عبادنا المخلصین، وبعض ھٰذہ الوجوہ ان خص بعض المطلوب لکن مجموعھا یدل علیہ بل بعضھا یعطی العصمۃ عن الصغیرۃ سھوا فتأمل. (النبراس ص ۳۸۵، مطبوعہ مکتبہ حقانیہ ملتان)

یعنی امام رازی اوران کے متبعین نے انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے گناہ کبیرہ سے مطلقا اور گناہ صغیرہ سے قصداً معصوم ہونے پر چند وجوہ سے استدلال کیا ہے جوحسب ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لا ینال عھدی الظٰلمین . (البقرۃ آیت ۱۲۴)

میرا وعدہ ظالموں کونہیں پہنچتا۔

عہد سے مراد منصب نبوت ہے گناہ کا مرتکب ظالم ہوتا ہے اور ظالم منصب نبوت کا اہل نہیں ہوسکتا،لہٰذا انبیاء کا گناہ گار ہونا محال ہے۔اس پر یہ اعتراض وارد نہیں

ہوسکتا کہ آیت کریمہ میں عہد سے مراد منصب امامت ہے کیونکہ اگر عہد سے مراد منصب امامت تسلیم بھی کیا جائے تو بھی منصب نبوت، منصب امامت سے اعلیٰ وافضل ہے جب ظالم منصب امامت کا اہل نہیں ہوسکتا تو وہ منصب نبوت کا بدرجہ اولیٰ اہل نہیں ہوگا۔

۲۔ انبیاء کرام کی اقوال وافعال میں اتباع واجب ہے۔ اگر کسی نبی سے گناہ صادر ہوتو اس کی اتباع بھی کرنی پڑے گی اور گناہ حرام ہونے کی وجہ سے نبی کی اتباع بھی حرام ہوگی۔ اور نبی کی اتباع کا حرام ہونا قطعاً باطل ہے لہٰذا نبی سے گناہ کا صادر ہونا بھی باطل ہے۔

۳۔ انبیاء سے گناہ کا صدور ہوتو لازم آئیگا کہ انکے گناہ کا عذاب تمام گناہگاروں کے عذاب سے زیادہ ہو۔ کیونکہ جس قدر مرتبہ بلند ہوتا ہے اسی قدر عذاب کا استحقاق زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کی ازواج مطہرات سے فرمایا:

یا نساء النبی من یأت منکن بفاحشة مبینة یضاعف لها العذاب ضعفین .

(الاحزاب آیت نمبر ۳۰)

اے نبی کی بیبیو! جو تم میں صریح حیا کے خلاف کوئی جرأت کرے اس پر اوروں سے دونا عذاب ہوگا۔

نبی کے حق میں یہ متصور نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا نبی سے گناہوں کا صدور بھی نہیں ہوسکتا۔

۴۔ فاسق مردود الشہادت ہوتا ہے اگر انبیائے کرام سے گناہ کا صادر ہونا ممکن ہوتو ان کی شہادت کو رد کرنا ممکن ہوگا اس طرح انبیاء کی تکذیب لازم آئے گی جو قطعاً باطل ہے۔ لہٰذا انبیاء سے گناہ کا صادر ہونا بھی قطعاً باطل ہے۔

۵۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب یا مستحب ہے۔ انبیاء کرام سے گناہ کا صدور ہوتو انہیں ٹوکنا پڑے گا اور یہ ایذا ہے۔ انبیاء کرام کو ایذا پہنچانا قطعاً

حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

الذین یؤذون الله ورسولهٗ لعنهم الله . (الاحزاب، ایت : ۵۷)

بیشک جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے۔

۶۔ گناہگار کا مستحق عذاب ہونا نصوص سے ثابت ہے اور اگر نبی سے گناہ صادر ہو تو نبی کا مستحق عذاب ہونا لازم آئے گا اور نبی کا مستحق عذاب ہونا اجماعاً باطل ہے۔ لہٰذا نبی سے گناہ کا صادر ہونا بھی طابل ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ولقد صدق علیهم ابلیس ظنهٗ فاتبعوه الا فریقا من المومنین.(سبا آیت : ۲۰)

اور بے شک ابلیس نے انہیں اپنا گمان سچا کر دکھایا تو وہ اس کے پیچھے ہو لیے مگر ایک گروہ کہ مسلمان تھا۔

اگر انبیاء کرام سے گناہ کا صدور ممکن ہو تو انبیائے کرام اس گروہ سے خارج ہو جائیں گے تو غیر انبیاء کا انبیاء پر افضل ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ان اکرمکم عندالله اتقاکم . (الحجرات آیت : ۱۳)

بے شک اللہ کے ہاں تم میں عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور غیر انبیاء کا انبیاء سے افضل ہونا باطل ہے۔ لہٰذا انبیاء سے گناہ کا صادر ہونا بھی باطل ہے۔

۸۔ اللہ نے ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیں اور اپنے آپ کو بھول جائیں۔ اور نبی کا مذموم ہونا اجماعا باطل ہے۔ لہٰذا انبیاء سے گناہوں کا صدور بھی باطل ہوگا۔

۹۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے ذکر کے بعد ارشد فرمایا:

انهم يسارعون فى الخيرات. (آل عمران، آیت: ۱۱۴)

اور وہ نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔

الخیرات جمع معرف باللام ہے اور ایسی جمع عموم کے لیے ہوتی ہے لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہر خیر خواہ وہ فعل (کرنا) ہو یا ترک (چھوڑنا) ہو میں جلدی کرتے ہیں اب اس میں ترک گناہ بھی شامل ہوگا۔ کیونکہ گناہ کا ترک بھی خیر ہے۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ شیطان کی حکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لأغوينهم اجمعين الا عبادك منهم المخلصين. (صٓ. آیت ۴۲)

میں ان سب کو گمراہ کردوں گا مگر ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب علیہم السلام کے متعلق فرمایا: **انا اخلصنٰهم** (ص۴۶)

ہم نے انہیں خالص فرمایا۔

اور حضرت یوسف کے بارے میں فرمایا:

وانه من عبادنا المخلصين. (یوسف، آیت: ۲۴)

اور وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔

معلوم ہوا کہ انبیاء کرام اللہ کے مخلص بندے ہیں اور اللہ کے مخلص بندوں پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

ان مذکورہ دلائل میں سے بعض مطلوب کے بعض حصے کے ساتھ خاص ہیں۔ لیکن ان کا مجموعہ مطلوب پر دلیل ہے۔ بلکہ بعض دلائل سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام سہواً بھی گناہ صغیرہ سے معصوم ہوتے ہیں۔

امام عارف ربانی سیدی عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب

امام شعرانی رحمہ اللہ اپنی کتاب الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر میں انبیاء کرام کی عصمت پر بحث کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

المبحث الحادی والثلاثون فی بیان عصمة الانبیاء علیهم الصلاة والسلام عن کل حرکة وسکون او قول او فعل ینقص مقامهم الاکمل وذالک لدوام عکوفهم فی حضرة الله تعالیٰ الخاصة فتارة یشهدونه تعالیٰ و سبحانه وتارة یشهدون انه یراهم ولا یرونه ولا یخرجون ابدا عن شهود هٰذین الامرین ومن کان مقامه کذالک لا یتصور فی حقه مخالفة قط حقیقة وانما هی مخالفة صوریة کما سیأتی بیانه انشاء الله تعالیٰ وتسمی هٰذه حضرة الاحسان ومنها عصمة الانبیاء وحفظ الاولیاء، فالاولیاء یدخلون ویخرجون والانبیاء مقیمون فیها.

یعنی اکتیسویں بحث انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا ہر ایسی حرکت وسکون اور ہر ایسے قول یا عمل سے معصوم ہونے کے بیان میں ہے جو ان کے مقام اکمل کی تنقیص کا باعث ہو۔ انبیاء کرام کا معصوم ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ خاص میں حاضر رہتے ہیں۔ کبھی تو ان کا حضور بایں طور ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور کبھی اس بات کا یقین رکھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا ہے اور وہ اس ذات کو نہیں دیکھ رہے انبیاء کرام ان دو امور کے شہود سے کبھی بھی خارج نہیں ہوتے اور جن نفوس قدسیہ کا ایسا مقام ہو ان کے بارے میں کسی حقیقی مخالفت کا کبھی بھی تصور نہیں کیا جا سکتا، ہاں وہ صوری مخالفت ہو سکتی ہے اس قرب خاص کو ''حضرۃ الاحسان'' کہا جاتا ہے جس میں انبیائے کرام کی عصمت اور اولیاء کرام کی

گناہوں سے حفاظت ہوتی ہے۔ اولیاء کرام اس میں داخل بھی ہوتے ہیں اور خارج بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اس میں ہمیشہ مقیم رہتے ہیں۔

آئمہ اصول کا موقف

امام شعرانی عصمت انبیائے کرام کے بارے میں آئمہ اصول کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال آئمة الاصول الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام کلهم معصومون لا یصدر عنهم ذنب ولو صغیرة سهوا ولا یجوز علیهم الخطاء فی دین الله قطعا وفاقا للاستاذ ابی اسحاق الاسفرائینی وابی الفتح الشهر ستانی والقاضی عیاض والشیخ تقی الدین السبکی وغیرهم.

(الیواقیت والجواهر ج: ۲ ص ۲ تا ۳ مطبوعه مصر)

یعنی آئمہ اصول نے فرمایا کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام معصوم ہیں ان سے کسی قسم کا گناہ صادر نہیں ہوتا حتیٰ کہ سہواً بھی گناہ صغیرہ صادر نہیں ہوتا اور ان سے اللہ تعالیٰ کے دین میں خطا کا صدور قطعاً ممکن نہیں۔ اس میں ان کا استاذ ابو اسحٰق اسفرائینی، علامہ ابوالفتح شہرستانی، امام قاضی عیاض اور امام تاج الدین سبکی وغیرہم سے اتفاق ہے۔

علماء اصول کی ایک جماعت کا موقف

امام شعرانی علمائے اصول کی ایک جماعت کا موقف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

وقال جماعة من علماء الاصول الانبیاء الذین لم یرسلوا معصومون قطعا من غیر خلاف ومن قال فیهم غیر ذالک فعلیه خروج من عهدته بین یدی

اللہ تعالیٰ وبین یدیھم فان بدایۃ النبوۃ توخذ من بعد انتھاء الولایۃ فمن أین فتعقل الواحد منا اسم ذنوب الانبیاء. وقد قالوا حسناب الابرار سئیات المقربین فافھم والزم الادب واجب عن الانبیاء علیھم السلام جھدک کل من کان فی حجاب عن مقامھم وای فائدۃ لتجریح من عدّلہ اللہ تعالیٰ ھل یثاب احد علیٰ ذالک لا واللہ بل ذلک الی الاثم اقرب.

(الیواقیت والجواھر ج ۲ ص ۳)

یعنی علماء اصول کی ایک جماعت نے فرمایا:

وہ انبیاء کرام جو مرسل نہیں وہ بھی بغیر کسی اختلاف کے یقیناً گناہوں سے معصوم ہیں اور جو شخص ان کے بارے میں عصمت کے سوا کسی اور چیز کا قائل ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کی جانب سے عائد ہونے والی ذمہ داری سے خارج ہونا لازم آتا ہے کیونکہ نبوت کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں ولایت کی انتہاء ہوتی ہے۔

پس کوئی کیسے انبیاء کرام کے حق میں گناہ کے نام تک کا سوچ سکتا ہے۔

حالانکہ اہل حق کہتے ہیں:

حسنات الابرار سئیات المقربین

یعنی صالحین کی نیکیاں مقربین بارگاہ الٰہی کے لیے سیئات کا درجہ رکھتی ہیں۔

پس تم سمجھو اور دامن ادب کو تھام لو۔ ہر وہ شخص جو انبیاء کرام کے مقام ارفع سے غافل و ناواقف ہو اس کو اپنی پوری کوشش سے جواب دو۔ ان ہستیوں کے بارے میں جرح کرنے میں کیا فائدہ ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے خود تعدیل فرمائی ہے؟ کیا اس پر کسی کو ثواب ملے گ؟ اللہ کی قسم ثواب نہیں ملے گا بلکہ اس کا یہ طرز گناہ کے زیادہ قریب ہے۔

شیخ ابو طاہر قزوینی کا مذہب

حضرت امام شعرانی عصمت انبیاء کرام کے بیان میں حضرت شیخ ابو طاہر قزوینی کا قول یوں نقل فرماتے ہیں۔

قال الشیخ ابو طاهر القزوینی فی الباب الخامس والثلاثین من کتاب سراج العقول یجب تنزیه الانبیاء علیهم الصلاة والسلام عن کل ما یتبادر الیٰ افهامنا من ذکر خطایاهم، فان خطایاهم لا ذوق لنا فیها وان الله تعالیٰ لما اصطفیٰ الانبیاء فی سابق علمه للنبوة واداء الرسالة رشحهم فی مبادی امورهم وحماهم من مکائد الشیطان وصفیٰ سرائرهم من الکدورات وشرح صدورهم بنوره وزین بالاخلاق الجمیلة وطهرهم عن الرجس والرذائل کما روی فی الصحیح ان الجبریل اتیٰ الیٰ النبی صلی الله علیه وسلم وهو یلعب مع الصبیان فاخذه وصرعه و شق عن قلبه فاستخرج منه شبه علقة وقال هٰذا حظ الشیطان منک ثم غسله فی طست من ذهب من ماء زمزم ثم لامه وعاد کما کان فی مکانه.

(الیواقیت والجواهر ج: ۲، ص ۳)

یعنی: شیخ ابو طاہر قزوینی کتاب سراج العقول کے ۳۵ ویں باب میں فرماتے ہیں: انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ہر اس عیب سے جو ان کی خطا کے ذکر سے ہمارے ذہنوں میں آسکتا ہے سے منزّہ و پاک سمجھنا واجب ہے کیونکہ ہمیں ان کی خطا کا ذوق (ادراک) حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم قدیم میں انبیاء کرام علیہم السلام کو جب نبوت وادائے رسالت کے لیے منتخب فرمالیا تو انہیں اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لیے ان کی مقدس حیات کے تمام امور کے آغاز میں ہی اس فریضہ کے لیے تیار اور مزین فرمالیا اور ان کے باطن کو تمام کدورات سے پاک فرمایا اور ان کے

سینوں کو اپنے نور سے معمور فرمایا اور ان کو اخلاق جمیلہ سے مزین فرمایا اور انہیں ہر قسم کی آلودگی اور رذائل سے پاک رکھا۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ حضرت جبرائیل امین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے (یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن کا عالم تھا) آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حضرت جبرائیل امین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کو لٹا کر آپ کے قلب انور کو شق کیا اور قلب انور سے منجمد خون کی مانند کوئی چیز نکالی اور کہا کہ آپ کی ذات میں اگر شیطان کے لیے کوئی حصہ ہو سکتا تھا تو وہ یہ تھا۔ (جو میں نے نکال کر پھینک دیا) پھر آپ کو سونے کے ایک طشت میں زمزم کے پانی سے نہلایا اور اس کے بعد آپ کے سینہ اقدس کو سی دیا اور وہ پہلی حالت میں آ گیا۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا مذہب

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں: وآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معصوم است از ذنوب کبیرہ وصغیرہ عمدا وسہوا مذہب مختار اینست وہمچنیں انبیاء علیہم السلام ودر کتب کلام این را تفصیل است وحق ہمیں اجمال است۔

(مدارج النبوۃ ج: ا ص ١٦٦، مطبوعہ کانپور)

یعنی:۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گناہ صغیرہ وکبیرہ سے عمداً اور سہواً ہر طرح معصوم ہیں اور ایسے ہی دیگر انبیاء کرام علیہم السلام بھی علم کلام کی کتب میں اس کی تفصیل ہے لیکن حق اسی اجمال میں ہے (جو میں نے بیان کر دیا ہے)

ڈاکٹر سعید رمضان البوطی کہتے ہیں

ڈاکٹر سعید رمضان البوطی اپنی کتاب الکبریٰ الیقینیات الکونیۃ میں انبیائے

کرام علیہم السلام کی صفات لازمہ کے عنوان کے تحت عصمت انبیاء کی بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ان الذنوب تختلف فی خطورها فاما اخطرها وهو الکفر فهم معصومون عنه قبل النبوة وبعدها بالاجماع اما تعمد ارتکاب الکبائر فهو ایضا محال علیهم قبل النبوة وبعدها.

یعنی:۔ گناہ اپنی ممنوعیت میں مختلف ہیں ان میں سب سے زیادہ ممنوع کفر ہے۔انبیائے کرام قبل از نبوت اور بعد از نبوت کفر سے بالاجماع معصوم ہیں اور کبائر کا ارتکاب بھی قصداً انبیائے کرام پر قبل از نبوت اور بعد از نبوت بالاجماع محال ہے۔

نیز فرماتے ہیں:

وحسبک ان تعلم وتعتصد بان الانبیاء معصومون عن الکفر والکبائر قبل البعثة وبعدها قطعا ومعصومون عن الصغائر فیما ذهب الیه الجمهور.

(الکبریٰ الیقینیات الکونیة وجود الخالق ووظیفة المخلوق مطبوعه دار الفکر بیروت، ص ۲۰۳)

یعنی:۔ تمہارے لیے اتنا یقین و اعتقاد رکھنا کافی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کفر و کبائر سے قبل از بعثت اور بعد از بعثت قطعاً معصوم ہوتے ہیں اور جمہور کے مذہب کے مطابق صغائر سے بھی معصوم ہوتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کی تصریح

مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی قرآن کریم کی آیت:

لا تقربا هٰذه الشجرة فتکونا من الظٰلمین

کی تفسیر کے تحت بیان کرتے ہیں:

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے

کھانے سے منع کیا گیا تھا۔اس پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے۔ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کرے اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اس درخت سے کھالیا جو بظاہر گناہ ہے۔حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلا اور نقلا ثابت ہے۔آئمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ ان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں۔وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے۔اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال وافعال سے امن اٹھ جائے گا اور وہ قابل اعتماد نہیں رہیں گے۔جب انبیاء ہی پر اعتماد واطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔

(معارف القرآن ج ۱ ص ۱۹۵ مطبوعہ ادارہ المعارف کراچی)

☆☆☆

انبیاء کرام علیہم السلام کے سہو و نسیان کی حیثیت

نسیان کا مفہوم:

نسیان کا لغوی معنیٰ بھول جانا ہے۔ اس لغوی مفہوم کے پیش نظر بعض کج فہم لوگ انبیاء کرام اور دیگر عرفاء و کاملین کے نسیان و سہو کو بھی عام لوگوں کے نسیان پر قیاس کر کے ایسے نتائج اخذ کرتے ہیں جو مقام نبوت کے قطعاً مناسب نہیں ہوتے حالانکہ اہل اللہ کا نسیان و سہو دراصل قرب الٰہی کا اعلیٰ مقام ہوتا ہے اور عوام الناس کا نسیان ان کی خطا اور بھول ہوتی ہے جبکہ مقربین بارگاہ الٰہی یاد الٰہی میں ہمہ وقت اس طرح مشغول رہتے ہیں کہ ان کی نظروں سے تمام حجابات اٹھ جاتے ہیں اور انہیں جلوہ محبوب نصیب ہو جاتا ہے۔ محبوب کے اس جلوے میں اپنی ہستی کو گم کر کے ہر چیز بھول جاتے ہیں۔ اس حالت میں انہیں اپنے وجود کا بھی احساس تک نہیں رہتا یہی استغراق محبین کا مقام نسیان و سہو کہلاتا ہے۔

عام انسانوں کو نسیان حافظے کی کمزوری سے لاحق ہو جاتا ہے اس لحاظ سے اہل اللہ کے سہو و نسیان اور عام لوگوں کے سہو و نسیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے، کوتاہ نظر و کج فہم لوگ انبیاء و رسول اور عرفاء کے سہو و نسیان کو اپنے نسیان پر محمول کر لیتے ہیں اور ان کے نسیان کو حافظے کی کمزوری والا نسیان کہہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ان اہل اللہ کے حال میں اور ہمارے حال میں کتنا فرق ہے۔ نسیان کی لفظی مشارکت سے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان سے بھی غلطی، بھول اور جھول واقع ہوا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم دنیا کی محبت میں بھولتے ہیں اور وہ اللہ کی محبت میں بھولتے ہیں۔ ہمارا بھولنا نقص اور ان کا بھولنا کمال، ہمارا بھولنا غفلت اور ان کی بھول اطاعت ہے، ہماری بھول بہک جانا اور انکی بھول پالینا ہے، ہماری بھول خطا ہوتی ہے اور ان کی بھول لقاء

ہوتی ہے، ہمارا نسیان حافظے کی کمزوری ہوتی ہے جبکہ مقربین بارگاہ الٰہی کا نسیان وسہو مشاہدہ حق ہے۔

ہمیں نسیان کی حالت میں جو کچھ یاد ہوتا ہے اور سامنے ہوتا ہے وہ بھی بھول جاتا ہے اور وہ حالت نسیان میں ہوں تو سب کچھ بھول کر اپنے مقصود کو پا لیتے ہیں۔ اور جو کچھ نظر نہیں آتا ہے اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہم حالت نسیان میں سب کچھ کھو دیتے ہیں جبکہ اللہ والے نسیان میں بہت کچھ پا لیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسیان کی حیثیت

رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسیان وسہو تشریعی حیثیت رکھتا ہے اور امت مسلمہ کے لیے سنت کا درجہ رکھتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نماز میں سہو لاحق ہو گیا تھا اس کی تحقیق یہ ہے کہ نماز پڑھتے وقت آپ یاد الٰہی میں اس قدر محو ہوئے کہ افعال نماز سے آپ کی توجہ ہٹ گئی اور بجائے چار کے پانچ رکعات پڑھا دیں۔ جبکہ ہمارا بھولنا حافظے کی کمزوری کی وجہ سے ہوتا ہے اور عموما اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہم دنیاوی معاملات میں مستغرق ہو جاتے ہیں اور افعال نماز میں توجہ نہیں رہتی۔

ہمارا بھولنا نقص وعیب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھولنا کمال اور امت کے حق میں رحمت وسنت ہے۔

حضرت امام مالک روایت کرتے ہیں: انی لانسی او انسی لاسن

(موطا امام مالک مع تنویر الحوالک ص ۱۱۹ مطبوعہ بیروت)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بھولتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں تاکہ کوئی سنت قائم ہو۔

اور قاضی عیاض روایت کرتے ہیں:

لست انسی ولکن انسی . (نسیم الریاض ص ۱۵۵ ج ۴)

میں بھولتا نہیں ہوں لیکن بھلا دیا جاتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سہو ونسیان کے متعلق قاضی عیاض فرماتے ہیں؛

فی حقه علیه الصلوٰة والسلام سبب افادة علم و تقریر شرع. (نسیم الریاض ج ۴ ص ۱۵۵)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسیان احکام شرعیہ کی تعلیم اور امتوں کو مسائل شرعیہ کی آگاہی اور ان کے علم میں اضافے کے لیے ہوتا ہے۔

علامہ اسماعیل حقی اپنی تفسیر روح البیان مصری ج ۷ ص ۴۰۹ پر لکھتے ہیں:

وما نقل من سهوه علیه الصلوٰة والسلام فی بعض الامور فهو لیس کسهو سائر الخلق.

یعنی بعض امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو کے متعلق جو نقل کیا گیا ہے تو آپ کا سہو عام مخلوق کے سہو کی طرح نہ تھا۔ جو غفلت سے ہوتا ہے۔ بلکہ حاشاه عن ذٰلک بل سهوه تشریع لأمته.

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ بالاتر ہے آپ کے لیے عام مخلوق کی طرح سہو ہونا ناممکن۔ بلکہ آپ کا سہو تشریعی ہوتا تھا۔ یعنی امت کی تعلیم کے لیے ہوتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہیں اسی لیے آپ کا ہر عمل امت کے لیے ہے۔ اسی طرح آپ کا سہو بھی امت کی تعلیم و تبلیغ کی خاطر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں نہ بھولتے اور سجدہ سہو نہ کرتے تو آپ کی نمازیں ہو جاتیں لیکن آپ کی امت نماز میں سہو لاحق ہونے کی صورت میں نماز کیسے مکمل کرتی؟

اور سجدہ سہو کے مسائل کا علم کیسے ہوتا؟ اور اگر آپ خود نہ بھولتے زبانی سہو کے مسائل بتا دیتے تو پھر بھی ہر کام کی ادائیگی کے لیے آپ کا اسوہ حاصل نہ ہوتا اور سجدہ سہو کرتے ہوئے شرف بالاقتداء سے محروم ہوتے۔

چنانچہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

در حقیقت آں متضمن حکمت بالغه الٰهی عز شانه است در باعثیت تشریع احکام و دریافت سعادت اقتداء به پیغمبر علیه الصلوٰة والسلام و مجرد تشریع حکمت نیست زیرا که تشریع بے آں ممکن است چنانکه گفتی هر که سهو کند سجده سهو بروئے لازم است چنانکه در صورت شک بیاید ولیکن ایں نکته باضمیمه دریافت سعادت تمام می شود و فرمود آنحضرت صلی الله علیه وسلم فراموشی داده می شوم من تاسنت گردانم. (مدارج النبوت ج ۱ باب دهم در انواع عبادات، ص ۴۴۳ مطبوعه کانپور)

یعنی:۔ درحقیقت یہ سہو ونسیان حق تعالیٰ عز اسمہ کی حکمت بالغہ کو متضمن ہے اس کی بدولت امت کو گونا گوں تشریع احکام اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور محض تشریع ہی اس کی حکمت نہیں اس لیے کہ اس کے بغیر بھی تشریع احکام ممکن ہے۔ مثلاً آپ فرمادیتے جو سہو کرے اس پر سجدہ سہو لازم ہے۔ جیسا کہ شک کی صورت میں آئیگا لیکن یہ نکتہ اقتداء کی سعادت حاصل ہونے کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھلا دیا گیا تاکہ اس بھولنے میں بھی سنت بناؤں۔ اور اس کی جزاء وثواب شروع ہو جائے۔

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سہو ونسیان عام لوگوں کے سہو ونسیان کی طرح نہ تھا بلکہ آپ کا یہ عمل امت کے لیے تشریع احکام اور امت کو مسائل سہو کی تعلیم

کے علاوہ امت کو سہو کی صورت میں سجدہ سہو کی ادائیگی میں شرف اقتداء بخشنے اورانہیں اس عمل کی ادائیگی میں ثواب وجزاء کے مستحق قرار پانے کی حکمت پر بھی مبنی تھا۔

اموراعتقادیہ وتبلیغیہ میں رسول اللہ ﷺ نسیان سے پاک ہیں

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ امور تبلیغیہ میں رسول اللہ ﷺ پرسہو ونسیان جائز نہیں۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ رشد و ہدایت کی تبلیغ فرمائیں اورکوئی غلط بات بتلادیں۔ البتہ دنیاوی معاملات میں اور عبادات میں بعض اوقات آپ پرنسیان طاری ہوجاتا ہے۔ لیکن علی الفور اللہ تعالیٰ آپ کوامر واقعیہ سے آگاہ کردیتا ہےاوراس پر بھی اجماع ہے کہ اموراعتقادیہ میں آپ پرنسیان نہیں آسکتا۔
(شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۳۷ از علامہ غلام رسول سعیدی)

شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں

بداں کہ سهو و نسیان بر حضرت پیغمبر صلی الله علیه وسلم در اقوال در آنچه متعلق است باخبار و ابلاغ جائز نیست باتفاق.

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پرسہو ونسیان ان اقوال میں جو اخبار اور تبلیغ سے متعلق ہیں باتفاق جائز نہیں۔ (مدارج النبوت ج اول ص ۴۴۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سہو نادر الوقوع تھا

جن امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سہو ونسیان جائز ہے اس کے متعلق بھی علماء کرام نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ وہ نادرالوقوع تھا یعنی آپ سے بہت کم، کبھی کبھار واقع ہوتا تھا۔ کیونکہ سہو ونسیان کا کثرت وقوع عیب ونقص ہے جو حافظے کی کمزوری اور دماغی خلل کی وجہ سے ہوتا ہے۔ انبیاء کرام ہرعیب ونقص سے مبرا ومنزہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ علامہ خفاجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ولٰکن لیس نسیانه صلی الله علیه وسلم وسهوه علی سبیل التکرار بکثرة وقوعه منه ولا الاتصال باستمرار ذالک لان مثله غیر محمود عند الطبائع السلیمه بل وقوعه منه صلی الله علیه وسلم علیٰ سبیل الندور وقلة الوقوع والنادر لاحکمالهٗ. (نسیم الریاض ج ۴ ص ۱۵۶)

یعنی:۔ جن امور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سہو ونسیان واقع ہونا جائز ہے اس سہو ونسیان میں بھی کثرت وتکرار نہ تھا اور نہ ہی اس میں دوام کی وجہ سے اتصال تھا۔ کیونکہ اس طرح کا سہو طبائع سلیمہ کے ہاں ناپسندیدہ ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا وقوع نادر وقلیل تھا اور نادر کے لیے کوئی حکم نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا کہ جن امور میں آپ سے سہو ونسیان کا وقوع جائز ہے ان میں بھی کثرت وقوع وتکرار اور دوام واتصال نہ تھا بلکہ بہت کم کہیں واقع ہوا ہے کیونکہ اس کی کثرت اور دوام دماغی امراض اور حافظہ کی کمزوری کی بناء پر ہوتا ہے اور انبیاء کرام عیب ونقص سے پاک ہوتے ہیں چنانچہ علامہ خفاجی کہتے ہیں:

لان النسیان نقص فی الجملة ولذاعدّه الاطباء من الامراض الدماغیه. (نسیم الریاض)

یعنی: نسیان فی الجملہ عیب ہے اسی لیے اطباء نے اس کو دماغی امراض میں شمار کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سہو ونسیان کا وقوع نادر وشاذ تھا۔ جہاں کہیں اس کا وقوع ہوا ہے وہ تشریع وارشاد امت کی حکمت کے پیش نظر ہوا ہے اسی لیے آپ کے حق میں یہ سہو ونسیان مدح ہے چنانچہ علامہ خفاجی کہتے ہیں:

وهی فی حقه باعتبار ما فیها من عبارة الارشاد للعباد ولذا قال بعض

مشائخنا من الحنفیه ان ھٰذا السجدة سجدة سهو للامة وسجدة شکر له ﷺ و مدح فی حقه وان لم یمدح بها سواه ککونه امیا. (نسیم الریاض)

یعنی:۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت نسیان باعتبار ارشاد امت آپ کے لیے نقص وعیب سے بعید ہے اسی لیے بعض ہمارے حنفی علماء نے فرمایا کہ ہے یہ سجدہ آپ کی امت کے لیے سجدہ سہو ہے اور آپ کے لیے سجدہ شکر ہے اور آپ کے حق میں مدح ہے۔ اگرچہ آپ کے سوا کسی کے لیے مدح نہیں جیسے آپ کا اُمّی ہونا آپ کے لیے مدح ہے لیکن کسی دوسرے کے لیے مدح نہیں ہے۔

انبیاء کرام کی قوت حافظہ

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ ترین قوت حافظہ سے نوازا ہے۔ اسی لیے تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کی شہادتوں پر فیصلہ دے گا۔ قیامت میں ہر نبی امت کے موافق یا مخالف شہادت دیں گے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کرام کے حق میں بھی گواہی دیں گے اور اپنی امت کے حق میں بھی اور اپنی امت کی شہادت پر بھی شہادت دیں گے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فکیف اذا جئنا من کل امة بشهید و جئنابک علیٰ ھٰؤلاء شهیدا.

(سورہ النساء آیت ۔ ۴۱)

اور کیسی ہوگی جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور اے محبوب تمہیں ان سب پر گواہ بنا کر لائیں گے۔

اس آیت کریمہ سے یہ بات خوب واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو ایسا قوی حافظہ عطا فرمایا ہے کہ ہزار ہا سال گزر جانے بلکہ اپنے وصال فرما جانے

کے باوجود کوئی چیز نہیں بھولتے۔ اگر یہ حضرات بھول جانیوالے ہوتے تو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے حضور شہادت کیسے دیتے؟ بخلاف عام انسانوں کے کہ وہ پرانی باتیں بھول جاتے ہیں۔ قیامت کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اسی لئے عام انسانوں کے اعمال کی تحریرات کتابوں کی شکل میں قیامت کے روز انہیں دی جائیں گی اور ان سے کہا جائیگا

اقراء کتابک (سورہ اسراء) اپنا نامہ اعمال پڑھ لے

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شہادتیں کتابیں دیکھ کر نہ ہونگی بلکہ خود ان کی یاد پر ہونگی اور ان کی اپنی یاداتنی معتبر ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ان کی شہادتوں پر ہوگا۔ انبیاء کرام قیامت میں ہر شخص کو پہچانیں گے۔ ہر شخص کی ذات، اس کے حالات اور ہر شخص کی صفات کو پہچانتے ہونگے کیونکہ اس معرفت و پہچان کے بغیر گواہی ناممکن ہے۔ تو غور کرلو کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان کس شان کی ہوگی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حافظہ کس قدر اعلیٰ وقوی ہوگا۔ جس رب نے انہیں از آدم تا قیامت ہر انسان پر اتنا بڑا ذمہ دار گواہ بنایا ہے انہیں اس کے لائق قوت حافظہ بخشی اور انہیں سارے عالم کے ہر ظاہر و باطن کی معرفت و پہچان سے نوازا۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل قوت حافظہ میں اضافہ

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں کہ ابو ہریرۃ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت حدیثیں روایت کرتا ہے اللہ جانتا ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں سودا سلف بیچنے میں مشغول رہتے تھے اور برادران انصار بھی اپنے کاموں میں مشغول ہوتے تھے اور میں مسکین آدمی ہونے کی وجہ سے پیٹ بھر جانے کے بعد ہر وقت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں حاضر رہتا تھا۔ ایک دن آپ نے فرمایا تم میں سے جو شخص بھی گفتگو کے دوران جب تک میں اپنی باتیں ختم نہ کرلوں اپنا کپڑا بچھالے اور پھر وہ اپنے اس کپڑے کے دامن کو اپنے سینے کے ساتھ لگالے تو اسے کوئی بات بھی نہ بھولے گی اس پر عمل کرتے ہوئے میں نے بھی اپنی چادر کا دامن بچھالیا ان دنوں میرے پاس اس چادر کے سوا کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا جب بات ختم ہوئی تو میں نے اس چادر کو اپنے سینے کے ساتھ لگالیا۔

پھر فرماتے ہیں:

فوالذی بعثه بالحق ما نسیت من مقالته ذالک الٰی یومی هٰذا .

(متفق علیه . مشکوٰۃ شریف ص ۵۳۵)

قسم ہے اس ذات کی جس نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا پھر آج تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات نہیں بھولا۔

۲۔ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ قرآن یاد کرتا ہوں تو بھول جاتا ہوں آپ نے فرمایا اس طرح نماز پڑھ کر یہ دعا مانگو۔ حضرت علی فرماتے ہیں میں نے اس طرح کیا اور فائدہ ہو گیا اور جا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ پہلے چار چار آیتیں یاد کرتا تھا اور اب چالیس آیتیں یاد کر لیتا ہوں۔ پہلے بات بھول جاتا تھا اور اب حرف حرف یاد رہتا ہے۔

(ترمذی ابواب الدعوٰت ج ۲ ص ۱۹۶.۹۷)

۳۔ حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کا عامل مقرر فرمایا انہوں نے وہاں سے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے یہ مرض پیدا ہو گیا ہے کہ نماز میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا پڑھتا ہوں آپ نے بلا کر ان کے سینہ پر ہاتھ مبارک مارا اور منہ میں دم کیا پھر یہ حالت بالکل زائل ہو گئی۔

غور فرمائیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کو

جس آقاء دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ ان کے حافظہ کی قوت میں اتنا اضافہ ہو رہا ہے کہ انہیں کوئی بات نہیں بھولتی اور انہیں نسیان لاحق ہونے کا عارضہ ہمیشہ کے لیے زائل ہو جاتا ہے۔ تو وہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم جو دوسروں کو باذن اللہ قوت حافظہ عطا فرمانے والے ہیں ان کی اپنی قوت حافظہ کس درجہ عالی شان اور کس قدر قوی ہوگی؟

خلاصہ بحث: سابقہ بحث سے درج ذیل امور ثابت ہوئے۔

۱۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے سہو و نسیان کو عام انسانوں کے نسیان کی طرح سمجھنا نادانی و کج فہمی ہے۔

۲۔ نبی کا سہو و نسیان تشریعی حیثیت رکھتا ہے جو نبی کے حق میں کمال و باعث مدح ہے۔

۳۔ عام انسانوں کو نسیان غفلت اور دنیا کی محبت میں انہماک و اضمحلال بشریت وغیرہ کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے جبکہ نبی کو سہو و نسیان انوار الٰہی کے مشاہدہ اور رب کی محبت کی بناء پر لاحق ہوتا ہے۔

۴۔ نبی اکرم ﷺ کو امور اعتقادیہ اور تبلیغیہ میں سہو کا وقوع ناممکن ہے۔

۵۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیاوی معاملات اور عبادات میں کبھی کبھار سہو کا وقوع ممکن ہے۔

۶۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سہو نادر الوقوع (بہت کم واقع ہونے والا) ہے۔ جس میں نہ کثرت ہوتی ہے اور نہ ہی تکرار و اتصال ہوتا ہے۔ کیونکہ کثیر الوقوع نسیان غیر محمود ہے۔ جس کا سبب امراض دماغیہ، حافظہ کی کمزوری ہوتا ہے جبکہ اللہ کے نبی اس قسم کے امراض و عیوب سے منزہ و مبرہ اور پاک ہوتے ہیں۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو اتنا قوی اور مضبوط حافظے کا مالک بنایا ہے کہ وہ بعد از وصال بھی کوئی چیز نہیں بھولتے۔ اسی لیے تو کل قیامت کے روز ان کی شہادت ان کی اپنی یاد کی بناء پر بغیر کسی تحریر وغیرہ کے ہوگی۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کے اذن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دوسروں کو قوت حافظہ بخشتے ہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات خوب واضح ہوئی کہ نبی کے نسیان کو کسی صورت میں بھی عام انسانی نسیان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عام انسانی نسیان عیب و نقص ہے اور نبی کا نسیان کمال و باعث مدح ہے۔ اسی لیے علماء کرام و مشاہیر اسلام نے ہر اس شخص کے بارے میں مرتکب توہین نبوت ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا ہے جو آپؐ کے نسیان کے سبب آپ کا مرتبہ گھٹانے اور عار دلانے کے درپے ہو چنانچہ فرماتے ہیں:

وکذالک اقول حکم من غمصه او عیره برعایة الغنم او بالسهو اوالنسیان او السحر او ما اصابه من جرح اوهزیمة لبعض جیوشیه او اذی من عدوه اوشدة من زمنه او بالمیل الیٰ نسائه فحکم هٰذا کله لمن قصد به له النقص القتل. (الشفاء . نسیم الریاض ج ۴ ص ۳۴۸)

یعنی ایسا ہی حکم ہے اس شخص کا جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ گھٹائے بسبب بکریاں چرانے یا سہو و نسیان کی وجہ سے یا جادو کے اثرات سے متاثر ہونے کی وجہ سے یا آپ کو پہنچنے والے کسی زخم کی وجہ سے یا آپ کے لشکر کے ہزیمت اٹھانے یا دشمن کی ایذا رسانیوں کی وجہ سے یا زمانے کی شدت اور مشقت کی وجہ سے جو اذیت آپ کو اٹھانی پڑی یا ازواج مطہرات کی طرف طبعی میلان کی وجہ سے ان تمام صورتوں میں اس قسم کی خرافات بکنے والے کے لیے یہ حکم ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے بشرطیکہ یہ الفاظ تنقیص کے طور پر کہے ہوں۔

بارگاہ نبوت کے تمام فیصلے حق ہیں

بارگاہ رسالت مآب ﷺ سے صادر ہونے والے تمام فیصلے مبنی برحق ہوتے ہیں۔ جن میں قطعاً کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ نبی کا ذریعہ علم وحی الٰہی ہوتا ہے اور علم کا یہ وسیلہ قطعاً بے خطا اور لاریب ہوتا ہے اور ہر قسم کے شک وشبہ سے منزہ ہوتا ہے اسی لیے مذہب کی بنیاد اسی پر ہوتی ہے لیکن خود وحی پر ایمان اور وحی کے وجود کا اعتراف نبی کے ارشاد واعتماد پر مبنی ہوتا ہے اور نبی کی ذات پر اعتماد کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس ذات کو معصوم مانا جائے اور اس کے قول وفعل اور علم وعمل کی سچائی اور درستی پر کامل یقین ہو اور نبی پر اس درجہ کے کامل یقین کو ایمان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نبی کا علم قطعاً صحیح، نبی کے پیش کردہ حقائق قطعاً درست اور نبی کا ہر فیصلہ سراپا حق و صواب ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس میں کسی بھی غلطی کا گمان نہیں ہوتا۔ نظام کائنات کے اصول وقوانین چاہے بدل جائیں لیکن علم نبوت کی صحت میں فرق نہیں آسکتا۔ نبی کے تمام اعمال بھی نبی کے علم کی طرح بے خطا اور درست ہوتے ہیں۔ چنانچہ

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ

(وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے یہ تو ایک وحی ہے جو ان کی طرف نازل کی جاتی ہے)

کے تحت مفسر قرآن پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

بعض علماء کی رائے ہے کہ ھو کا مرجع صرف قرآن کریم نہیں بلکہ قرآن کریم اور جو بات حضور علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے نکلتی ہے وہ سب وحی ہے وحی کی دو قسمیں ہیں جب معانی اور کلمات سب منزل من اللہ ہوں اسے وحی جلی کہتے ہیں جو قرآن کریم کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اور جب معانی کا نزول تو من جانب اللہ ہو لیکن ان کو الفاظ کا جامہ حضور علیہ السلام نے خود پہنایا ہو اسے وحی خفی یا وحی غیر متلو کہا

جاتا ہے جیسے احادیث طیبہ بعض علماء نے ان آیات کے پیش نظر حضور کے اجتہاد کا انکار کیا ہے۔ یعنی حضور علیہ السلام کوئی بات اپنے اجتہاد سے نہیں کہتے بلکہ جو ارشاد ہوتا ہے وہ وحی الٰہی کے مطابق ہوتا ہے لیکن جمہور فقہاء نے حضور علیہ السلام کے اجتہاد کو تسلیم کیا ہے اور ساتھ ہی تصریح فرمائی ہے کہ یہ اجتہاد بھی باذن اللہ ہوا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ خود ہی اس اجتہاد کی پاسبانی کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام جو بات بذریعہ اجتہاد فرماتے ہیں وہ بھی عین منشائے خداوندی ہوا کرتی ہے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

ان اللّٰہ اذا سوغ لہ علیہ الصلوٰۃ والسلام الاجتھاد ما یسند الیہ وحیا لانطقا عن الھویٰ (روح المعانی)

کتب احادیث میں حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص کا یہ واقعہ منقول ہے وہ کہتے ہیں میرا یہ دستور تھا کہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے جو کچھ سنتا وہ لکھ لیا کرتا۔ قریش کے بعض احباب نے مجھے اس سے منع کیا اور کہنے لگے تم حضور علیہ السلام کا ہر قول لکھ لیا کرتے ہو۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہیں۔ کبھی غصے میں بھی کوئی بات فرما دیا کرتے ہیں چنانچہ میں نے لکھنا بند کر دیا بعد میں اس کا ذکر بارگاہ رسالت میں ہوا۔ اور میں نے سلسلہ کتابت بند کرنے کی وجوہ بیان کیں تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما خرج منی الا الحق

اے عبداللہ تم میری ہر بات کو لکھ لیا کرو اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے میری زبان سے کبھی کوئی بات حق کے سوا نہیں نکلی۔ (ضیاء القرآن ج:۵ ص ۱۱)

اسی آیہ کریمہ کے تحت مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کوئی بات اپنی زندگی کے اس نجی پہلو میں بھی کبھی خلاف حق نہیں نکلتی تھی۔ بلکہ ہر وقت ہر حال میں آپ کے اقوال وافعال ان حدود کے اندر محدود رہتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبرانہ اور متقیانہ زندگی کے لیے آپ ﷺ کو بتا دی تھیں۔ اس لیے درحقیقت وحی کا نور ان میں بھی کارفرما تھا۔ یہی وجہ ہے جو بعض صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہوئی ہے۔ مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ ایک موقع پر حضور نے فرمایا:

لا اقول الا حقا میں کبھی حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا۔

کسی صحابی نے عرض کیا: فانک تداعبنا یا رسول الله

یارسول اللہ کبھی کبھی آپ ہم سے ہنسی مذاق بھی تو کر لیتے ہیں۔ فرمایا:

انی لا اقول الا حقا فی الواقع میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔

مسند ابو احمد اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں جو کچھ بھی رسول اللہ کی زبان مبارک سے سنتا تھا وہ لکھ لیا کرتا تھا۔ تاکہ اسے محفوظ کرلوں۔ قریش کے لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا اور کہنے لگے تم ہر بات لکھتے چلے جاتے ہو۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہیں کبھی غصے میں بھی کوئی بات فرما دیتے ہیں اس پر میں نے لکھنا چھوڑ دیا بعد میں اس بات کا ذکر میں حضور ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا:

اکتب فوالذی نفسی بیده ما خرج منی الا الحق

تم لکھے جاؤ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میری زبان سے کبھی کوئی بات حق کے سوا نہیں نکلتی۔ (تفہیم القرآن ج ۵ ص ۱۹۵)

جب یہ ثابت ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن اقدس سے ادا ہونے

والی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی تو یہ بھی ثابت ہوا کہ آپ کے کسی فیصلے کا غلط ہونا بھی محال ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ آپ بشریت کی وجہ سے ایک کا حق دوسرے کو دے دیں۔ آپ بشر تو ہیں لیکن بشریت کے جملہ عیوب سے پاک ہیں۔ غصے میں غلط اور ناحق بات کہہ دینا بشریت کا عیب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پاک ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا کہ میری زبان اقدس سے ناحق بات نہیں نکلتی۔ ہر ایماندار کو اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان و قسم پر یقین ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلوں کے حق ہونے کی قرآنی دلیل ناطق سورہ نساء میں فرمان باری تعالیٰ ہے:

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلمو تسلیما. (النساء ۶۵)

اے حبیب تمہارے رب کی قسم وہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بہ سر تسلیم کر لیں۔

مما قضیت میں ما عموم کے لیے ہے جس کا مطلب یہ ہے جب تک آپ کے ہر فیصلے کو حق سمجھ کر تسلیم نہ کرے کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ سے کوئی غلط فیصلہ ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ اگر آپ سے ناحق فیصلہ ہونا ممکن ہو تو ناحق کو حق سمجھنا ایمان کا مدار ہو جائے گا اور ناحق کو حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ دونوں باتیں محال ہیں تو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے لیے ناحق فیصلہ کرنا بھی محال ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

انما انا بشر وانه ياتيني الخصم فلعل بعضهم ان يكون ابلغ من بعض فاحسب انه صادق فأقضي له فمن قضيت له بحق مسلم فانما هي قطعة من النار فليحملها او يذرها . (مسلم شریف، کتاب الاقضیہ)

میں بشر ہوں میرے پاس کوئی شخص مقدمہ لاتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے دعویٰ کو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح پیش کرے۔ میں اس کو سچا گمان کرلوں۔ پھر بالفرض میں اس کے حق میں فیصلہ کردوں، پس جس شخص کے لیے میں دوسرے مسلمان کے حق کا فیصلہ کردوں تو وہ آگ کا ٹکڑا ہے۔ وہ اسے اٹھالے یا چھوڑ دے۔

اس حدیث پاک سے یہ نتیجہ نکالنا جائز نہیں کہ حضور ﷺ کے فیصلے بھی بعض وقت ناحق ہوسکتے ہیں کیونکہ اس حدیث میں فمن قضيت له بحق مسلم۔ (جس کیلئے میں دوسرے مسلمان بھائی کے حق کا فیصلہ کردوں)

جملہ شرطیہ ہے اور من متضمن شرط ہے اور شرط کبھی تعلیق بالمحال کے لیے بھی آیا کرتی ہے۔ یعنی ایک ناممکن چیز کو فرض کر کے اس پر جزا مرتب کردی جاتی ہے چنانچہ قرآن کریم میں فرمان الٰہی ہے:

قل ان كان للرحمان ولد فانا اول العابدين . (زخرف : ۸۱)

تم کہہ دو بفرض محال رحمان کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے عبادت کرنے والا میں ہوتا۔

اب کوئی اس آیت کریمہ سے یہ مفہوم نکالے کہ اللہ کے لیے اولاد ہوسکتی ہے تو یہ اس کی بدترین جہالت ہوگی کیونکہ اس جگہ تو تعلیق محال کے طور پر ایسا فرمایا گیا ہے نہ کہ امکان اولاد کو ثابت کرنے کے لیے۔ حدیث مذکور میں بھی تعلیق

بالمحال کے طور پر فرمایا گیا ہے۔ فمن قضیت له بحق مسلم میں، من متضمن شرط اور شرط تعلیق بالمحال کے لیے ہے۔

اس کا مطلب ہے۔ یہ محال ہے کہ میں ایک کا حق دوسرے کو دے دوں محض اس لیے کہ میں بشر ہوں۔ محض اس لیے کہ کسی کی چرب لسانی اور خوش بیانی سے متاثر ہو جاؤں۔ یہ محال ہے۔ لیکن اگر بالفرض میں ایسا کر بیٹھوں تو سمجھ لو کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے ناحق فیصلہ کرنا ممکن ہی نہیں اور یہ حدیث جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تعلیم امت کے لیے ہے قیامت تک لوگ اپنے مقدمات فیصلہ کروانے کے لیے حاکم کے پاس لے جائیں گے تو آپ فرماتے ہیں کہ تم جو مقدمات لے کر حاکموں کے پاس جاتے ہو اور پھر حاکم کسی ایک کا حق دوسرے کو دیدے وہ آگ کا ٹکرا ہے لہٰذا وہ اس کو قبول نہ کرے بلکہ اصل مالک کو لوٹا دے۔

امام نووی نے اس حدیث کا ایک مطلب یہ بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر اپنے اجتہاد کے محض شہادت یا قسم کی بناء پر جو فیصلہ کریں اور اس ظاہری شہادت کی وجہ سے بالفرض باطن کے خلاف فیصلہ کر دیں اس فیصلہ کو غلط نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ آپ کو جس بنیاد پر فیصلہ کرنے کا مکلّف کیا گیا ہے وہ شہادت یا قسم ہے اور اس لحاظ سے یہ فیصلہ صحیح ہے اور اگر گواہوں نے جھوٹی گواہی دی تو یہ ان کا گناہ ہے فیصلہ میں کوئی قصور نہیں۔ (شرح نووی)

معلوم ہوا کہ نبی کے فیصلہ کو کسی صورت میں بھی ناحق تصور نہیں کیا جا سکتا۔ نبی کا فیصلہ بہر صورت حق وصواب ہی ہوتا ہے۔

حدیث پاک میں ارشاد ہے:

اشفعوا فلتوجروا ویقضی اللہ علی لسان رسولہ ماشاء

(صحیح بخاری، کتاب الادب، ج ۲ ص ۸۹۱)

سفارش کیا کرو تمہیں اجر دیا جائے گا اور اللہ اپنے رسول کی زبان سے وہی فیصلہ کرواتا ہے جو چاہتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جائز سفارش کرنے پر اجر ملے گا اگر چہ رسول اللہ ﷺ کسی کی سفارش وغیرہ سے متاثر ہو کر فیصلہ نہیں فرماتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے حق ہی فیصلہ کرواتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کی زبان سے وہی فیصلہ کرواتا ہے جو حق وصواب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو بشری عیوب ونقائص سے پاک رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کے تمام اقوال وافعال کو باطل کی آمیزش سے پاک رکھتا ہے۔

علامہ خفاجی فرماتے ہیں:

فلا یصدر عنہ(صلی اللہ علیہ وسلم)ما یخالف الواقع لا عمدا ولا غیرہ لعصمۃ اللہ لہ فی اقوالہ وافعالہ کلھا. (نسیم الریاض . ج ۴ ص ۸۱)

یعنی رسول اللہ ﷺ سے قصداً اور بغیر قصد کے کوئی امر خلاف واقع صادر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے تمام اقوال وافعال میں معصوم بنایا ہے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

فلا یصدر عنہ امر یخالف ما فی نفس الامر لانہ معصوم فی اقوالہ و افعالہ.

(نسیم الریاض ج ۴ ص ۲۶۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفس الامر کے خلاف کوئی امر صادر نہیں ہوتا کیونکہ آپ اپنے اقوال وافعال میں معصوم ہیں۔

حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ میں بندہ مقرب کا ہاتھ بنتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے، میں اس کے پاؤں بنتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے، میں اس کی آنکھیں بنتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کے کان بنتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔

(صحیح بخاری)

پس جن کے حواس اور اعضاء و جوارح اس حد تک مظہر قوت ربانیہ ہوں اور اللہ تعالٰی ان کی قوت کو اپنی قوت اور ان کی حرکت کو اپنی حرکت قرار دے تو پھر بھلا وہاں کسی غلطی اور لغزش کا امکان کیسے ہوسکتا ہے؟ محفوظیت کا یہ مقام نبی کے غلاموں کو بھی نبی کے فیض صحبت سے اور توجہ سے حاصل ہو جاتا ہے تو پھر بھلا جس کے غلاموں کو محفوظیت کا یہ مقام عالٰی نصیب ہو جاتا ہے تو اس ہستی کی اپنی عصمت و رفعت کا کیا حال ہوگا۔

اجتہاد نبوی

شبلی نعمانی حضرت شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے اجتہاد نبوی کے متعلق لکھتے ہیں:

پیغمبروں کا یہ اجتہاد عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطاء و غلطی سے یکسر پاک و منزہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے خطاء و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے اسی لیے ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے۔

پیغمبرانہ اجتہاد کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکہ نبوت الہام، القاء حکمت ربانی، فہم نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور اجتہاد نبوی میں عملا کوئی فرق نہیں ہے۔ کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوت علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ جس کو اللہ تعالٰی خاص پیغمبر کے سینہ میں

ودیعت رکھتا ہے۔اس لیے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں۔ (سیرت النبی ج ۴ ص ۷۵ مطبوعہ الفیصل لاہور)

شبلی نعمانی اجتہاد نبوی کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی عمر تیئس سال ہے ان پورے تیئس سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کیے۔مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہین جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکم دینی، شریعت ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے۔اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین اور شریعت میں آپ کے پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطاء اور غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

(سیرت النبی ج ۴ ص ۷۵)

اجتہاد نبوی میں خطاء سے کیا مراد ہے؟

جو حضرات اجتہاد نبوی میں خطا کے امکان کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس خطاء کا کیا معنیٰ ہے اس پر علامہ شبلی نعمانی روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا۔یا استقراء تام نہیں ہوتا۔تمثیل پوری نہیں ہوتی، علت مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہاد نبوی میں نہیں ہیں۔کیونکہ اجتہاد نبوی نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا ہے نہ وہ غور وفکر، نظر واستدلال اور استقراء وتمثیل کے منطقی اور

اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نور رسالت، فہم نبوت، حکم ربانی اور شرح صدر پر مبنی و وقائم ہوتا ہے جن میں یہ بیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں۔ اسی لیے لفظ ''اجتہاد'' جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں کہ آپ نے جو پہلو اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین فرمائی۔

اس قسم کی جو چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا اس کا منشاء ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

عقیدہ توسل کی شرعی حیثیت

بعض لوگ مسلمانوں کے عقیدہ توسل کو شرک قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرب الٰہی کے لیے کسی کو وسیلہ سمجھنا بھی شرک ہے۔ مشرکین بھی اپنے بتوں کو وسیلہ سمجھتے تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان کا مقولہ ذکر فرمایا کہ:

وما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى (الزمر ۳)

یعنی ہم بتوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین عرب بھی اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا وسیلہ مانتے تھے اور مسلمان بھی انبیاء و اولیاء کو قرب الٰہی کا وسیلہ مانتے ہیں۔ وہ مشرک اور یہ مومن؟ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

ازالہ ءشبہہ:

اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ مشرکین کے توسل اور ایک مسلمان کے توسل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مشرکین غیر اللہ کی عبادت کے جواز کے لیے توسل ڈھونڈتے تھے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے۔ جبکہ مسلمان بزرگان دین کا توسل تقرب الٰہی کیلئے ڈھونڈتے ہیں۔ نہ تو ان کی عبادت کرتے ہیں نہ ہی انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ مشرکین اپنے بتوں کو محض وسیلہ بنانے کی وجہ سے مشرک نہیں ہوئے، بلکہ ان کی عبادت کرنے کی وجہ سے مشرک قرار پائے۔ جیسا کہ ان کے اسی مقولہ میں "وما نعبدهم" کے الفاظ موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے بتوں کی عبادت کا اقرار کرتے تھے۔ مسلمان الحمدللہ انبیاء کرام اور اولیاء عظام کو صرف

قربِ الٰہی کا وسیلہ مانتے ہیں۔ کوئی مسلمان کسی نبی ولی کو عبادت کا مستحق نہیں مانتا اور مومن انبیاء و اولیاء کو اللہ کے محض بندے اور محبوبانِ خدا مانتے ہیں اور خدا کے اذن و عطا سے وسیلہ و شفیع مانتے ہیں، نہ ان کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ان کو اللہ کی ربوبیت میں شریک مانتے ہیں۔ انبیاء و اولیاء سے توسل کو شرک ثابت کرنے کے لیے اس آیت سے استدلال نہایت لغو اور باطل ہے اور محض جہالت اور قرآن کریم کی آیات کی غلط تفسیر ہے۔ اس آیت کریمہ میں دراصل شرک کو بطور وسیلہ لانے کی نفی کی گئی ہے اور اس سے روکا گیا ہے۔ مشرکین اپنے شرک کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے دلیل توسل کا سہارا لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دلیل جواز کو رد فرمایا کہ میری بارگاہ کا تقرب شرک کے عمل سے تلاش کرنا جائز نہیں۔ میرے تقرب کے لیے اس کو وسیلہ بناؤ جس کو میں پسند کرتا ہوں۔

توسل کا مفہوم

توسل کا لغوی و شرعی معنی بیان کرتے ہوئے محقق اہل سنت، شرف ملت استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری رحمہ اللہ تعالیٰ سابق شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور فرماتے ہیں۔

لغت میں کسی شئی کو مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا توسل کہلاتا ہے۔ شرعی طور پر ایسی چیز کو دعا کی قبولیت کا ذریعہ بنانا جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قدر و منزلت رکھتی ہو توسل ہے۔ بارگاہ الٰہی میں اعمال صالحہ اور ذوات صالحہ دونوں ہی مقبول و محبوب ہیں۔ لہٰذا دونوں کو وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ (ندائے یارسول اللہ۔ ص ۴۷)

قرآن وسنت سے توسل کا جواز

انبیاء واولیاء اوران کے تبرکات سے توسل قرآن وسنت سے ثابت ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

یا ایھا الذین اٰمنو اتقو اللہ و ابتغو الیہ الوسیلۃ (المائدۃ ۳۵)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو۔

علماء اسلام فرماتے ہیں کہ بارگاہ الٰہی میں وسیلہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو اس کے ہاں مقرب ہو۔ خواہ وہ اعمال صالحہ ہوں یا صاحب وجاہت و مقام اشخاص۔ کیونکہ آیت میں مطلق وسیلے کا ذکر ہے۔ اسمیں توسل کو اعمال کے ساتھ مخصوص کرنا سخت زیادتی ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے اور یہ تخصیص کیسے درست ہوگی حالانکہ ذوات فاضلہ اپنے سے صادر ہونے والے اعمال سے افضل ہوتیں ہیں۔ آیت کریمہ میں ایک اور دلیل بھی اس تخصیص سے مانع ہے اور وہ یہ کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیا ہے اور تقویٰ اچھے اعمال کا بجالانا اور برے اعمال سے بچنے کا نام ہے۔ اگر توسل سے مراد بھی اعمال صالحہ ہی ہوں تو آیت کریمہ میں تاکید ہوگی اور یہ ضابطہ ہے کہ تاسیس کو تاکید پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا توسل سے مراد مطلق ذریعہ لینا ہی بہتر ہے۔ (شفاء الفواد بزیارت خیر العباد مترجم: ص۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲ از شیخ محمد علوی مالکی)

مفتی محمد شفیع صاحب اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا ذریعہ بنے وہ انسان کے لیے اللہ کے قریب ہونے کا وسیلہ ہے اور اس میں جس طرح ایمان و عمل صالح داخل ہیں اسی طرح انبیاء و صالحین کی صحبت و محبت بھی داخل ہے کہ وہ بھی رضا الٰہی کے اسباب میں سے تھے۔ اور اسی لیے ان کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا درست ہوا۔ جیسا حضرت عمر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قحط کے زمانے میں حضرت عباس کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور ایک اور روایت میں رسول کریم ﷺ نے ایک نابینا صحابی کو اس طرح دعا مانگنے کی تلقین فرمائی۔

اللھم انی اسالک اتوجه الیک بنبیک محمد نبی الرحمة.

(معارف القرآن ۳، ۱۲۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاء ھم ما عرفوا کفروا به فلعنة الله علی الکٰفرین. (البقرة)

اور وہ (یہود) اس سے پہلے کفار کے خلاف (قرآن اور نبی آخر الزمان کے وسیلہ سے) فتح طلب کرتے تھے، پھر جب وہ پہچانے ہوئے ان کے پاس تشریف لے آئے تو انہوں نے ان کے ساتھ کفر کیا۔ پس اللہ تعالیٰ کی لعنت کافروں پر۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ خیبر کے یہود نے بنو غطفان سے قتال کیا اور شکست کھائی جس کے بعد یہود نے اس دعا کے ساتھ ان سے دوبارہ قتال کیا۔

انا نسألک بحق النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجه لنا فی آخر الزمان ان تنصرنا علیھم (قرطبی ۲/۲۷)

اے اللہ! ہم اس نبی امی کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتے ہیں جنہیں آخری زمانے میں ہمارے لیے پیدا کرنے کا تو نے وعدہ فرمایا، ہماری دعا تجھ سے یہی ہے کہ ہمارے دشمنوں پر تو ہماری مدد فرما۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب وہ اس دعا کے ساتھ قتال

کرتے تھے تو بنی غطفان کو شکست دیا کرتے تھے۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کیا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جآء وک فاستغفروا الله واستغفرلهم الرسول لو جدو الله توابا رحيما . (النساء ٦٤)

اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب! تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، مہربانی پائیں گے۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ بارگاہ الٰہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اور آپ کی شفاعت دعا کی قبولت وحاجت وکار برآری کا ذریعہ ہے۔

آیت میں ظلم، ظالم، زمان ومکان کسی قسم کی قید نہیں، ہر قسم کا مجرم ہر زمانے میں خواہ کسی قسم کا جرم کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آجائے اور جاء وک میں یہ قید نہیں کہ وہ مدینہ طیبہ میں ہی آئے بلکہ ان کی طرف توجہ کرنا یہ بھی ان کی بارگاہ اقدس میں حاضری ہے۔ اگر مدینہ منورہ کی حاضری ہو جائے تو زہے نصیب۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت حضرت علامہ مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادیؒ لکھتے ہیں۔

سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف کے بعد ایک اعرابی روضہ اقدس پر حاضر ہوا اور روضہ شریف کی خاک پاک اپنے سر پر ڈالی اور عرض کرنے لگا یارسول اللہ! جو آپ نے فرمایا ہم نے سنا اور جو آپ پر نازل ہوا اس میں یہ آیت بھی ہے "ولو انهم

اذظلموا" میں نے بے شک اپنی جان پر ظلم کیا ہے اور میں آپ کے حضور میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی بخشش چاہنے حاضر ہوا ہوں، تو میرے رب سے میرے گناہ کی بخشش کرائیے۔ اس پر قبر شریف سے ندا آئی کہ تیری بخشش کی گئی۔ (تفسیر خزائن العرفان)

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

اس سے چند مسائل معلوم ہوئے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض حاجت کے لیے اس کے مقبولوں کو وسیلہ بنانا ذریعہ کامیابی ہے۔

۲۔ اور قبر پر حاجت کے لیے جانا بھی جاء وک میں داخل اور خیر القرون کا معمول ہے۔

۳۔ مقبولان حق مدد فرماتے ہیں اور ان کی دعا سے حاجت روائی ہوتی ہے۔

(تفسیر خزائن العرفان: ترجمہ کنز الایمان)

حدیث پاک میں ہے:

اصاب الناس قحط فی زمن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فجاء رجل الی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ﷺ استسق اللہ لامتک فانهم قد هلکو فاتاه رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام فقال ائت عمر فاقراه السلام واخبره انهم مسقون وقل له الکیس الکیس فاتی الرجل عمر فاخبره، فبکی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ثم قال یا رب ما آلوا الا ما عجزت عنہ. (وفاء الوفاء ص. ۱۳۷۴)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں قحط ہوا تو ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ انور پر حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے اللہ تعالیٰ سے بارش طلب فرمائیے لوگ ہلاک ہو رہے ہیں، اس

کے بعد اس شخص کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عمر کے پاس جا کر ان کو سلام پہنچا دو اور یہ خبر دو کہ بارش ہوگی اور یہ بھی کہو کہ ہوشیاری سے کام لیں۔ اس شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پیغام پہنچایا، حضرت عمرؓ رو پڑے اور عرض کرنے لگے' اے میرے رب! میں کوتاہی نہیں کرتا مگر جس سے میں عاجز ہوں۔

علامہ سمہودی کہتے ہیں:

رواہ البیھقی عن الاعمش عن ابی صالح عن مالک الدارو رواہ ابن ابی شیبہ بسند صحیح عن مالک الدار . (وفاء الوفاء . ۱۳۷۴)

اس حدیث کو بیہقی نے اعمش کے طریق سے روایت کیا ہے اور انہوں نے ابو صالح سے روایت کیا ہے اور انہوں نے مالک الدار سے اور ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ مالک الدار سے روایت کیا ہے اور یہ صحابی کون تھے۔ اس بارہ میں علامہ سمہودیؒ کہتے ہیں:

روی سیف فی الفتوح الذی رای فی المنام بلال بن الحارث المزنی احد الصحابة رضی اللہ تعالیٰ عنہ.

سیف نے فتوح میں روایت کیا ہے کہ جس شخص نے خواب میں زیارت کی تھی وہ بلال بن حارث مزنی صحابی رضی اللہ عنہ تھے۔ اس کے بعد علامہ سمہودی کہتے ہیں:

ومحل الاستشھاد و طلب الاستسقاء عنہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی البرزخ ودعائہ لربہ فی ھذہ الحالة غیر ممتنع وعلمہ بسوال من یسالہ قدور دفلا مانع من سوال الاستسقاء وغیرہ منہ ، کما کان فی الدنیا.

(وفاء الوفاء . ۱۳۷۲)

اور محل استشہاد آپ سے پانی کے لیے دعا کی درخواست کرنا ہے اس حال میں

کہ آپ برزخ میں تشریف فرمائیں اور آپ کا اس حال میں دعا کرنا ممنوع نہیں اور سوال کرنے والے کے سوال کا علم بھی ثابت ہے۔لہٰذا آپ سے طلب باران اور اس کے علاوہ کسی چیز کا سوال کرنے میں کوئی ممانعت نہیں جیسا کہ دنیا میں آپ سے کسی چیز کا سوال کرنا منع نہیں، ایسے ہی بعد از وصال بھی آپ سے سوال کرنا منع نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے بعد از وصال توسل و استغاثہ اور استشفاع اور ندا جائز اور سلف کا معمول ہے اور جس کے جواز پر صحابہ کرام کا اجماع ہے جسے حضرت عمر فاروق جیسے جلیل القدر صحابی کی تائید وتصویب بھی حاصل ہے۔

امام ابن جریر اور حافظ ابن کثیر کے نزدیک یہ واقعہ ۱۷ ہجری کے اواخر اور سنہ ۱۸ ہجری کی ابتداء کا جبکہ ابن خلدون فرماتے ہیں یہ واقعہ سنہ ۱۸ ہجری میں پیش آیا۔

جب حضرت عمر نے حضرات صحابہ کرام سے بیان کیا اور فرمایا کہ:

فان بلال بن الحارث یزعم ذیه وذیت

کہ بلال یوں یوں کہتے ہیں تو صحابہ کرام نے بیک زبان فرمایا:

صدق بلال　　　　بلال سچ کہتے ہیں۔

(تاریخ طبری جلد ص ۹۹ البدایه والنهایه ج ۴ ص ۹۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے وصال سے تقریبا صرف آٹھ سال کے بعد ہی پیش آیا اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد موجود تھی۔خواب دیکھنے والے کوئی معمولی شخص نہ تھے بلکہ حضرت بلالؓ بن حارث مزنی مشہور ومعروف صحابی تھے۔یہ معاملہ نرے خواب کا نہیں بلکہ اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے خلیفہ راشد کی تائید وتصویب حاصل ہے:

علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الرشدین من بعدی اور اقتدوا بالذین من

بعدی ابی بکر و عمر

کے تحت اس عمل کا سنت ہونا ورنہ مستحب اور اقل درجہ جواز واضح ہے۔ اس واقعہ کو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیگر صحابہ کرام سے بیان فرمایا تو انہوں نے صدق بلال کہہ کر اس کی تائید فرمائی اس سے صحابہ کرام کا ایک گونا اجماع ثابت ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ سے بعد از وصال توسل و استغاثہ اور نداء کے جواز پر بلاشبہ بہترین دلیل ہے۔

حدیث میں آیا ہے حضرت آدم علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ توسل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا کی۔

اے میرے رب! تیری بارگاہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ دیتا ہوں، مجھے معاف فرما۔

اللہ تعالیٰ نے آپ سے پوچھا کہ تم نے انہیں کیسے پہچانا؟ حالانکہ میں نے ان کو دنیا میں پیدا ہی نہیں کیا، اس پر حضرت آدم نے کہا جب تو نے مجھے پیدا فرمایا تو میں نے سر اٹھایا اور عرش کے چاروں کناروں پر لکھا ہوا پایا:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

پس مجھے یقین ہو گیا، اللہ نے اپنے نام کے ساتھ اس نام کو متصل فرمایا جو تمام مخلوق میں زیادہ محبوب ہے۔ اس پر اللہ نے فرمایا۔

صدقت یا آدم انہ لا حب الخلق الی ادعنی بحقہ قد غفرت لک لولا محمد ما خلقتک

اے آدم! تو نے سچ کہا، واقعتاً وہ مجھے تمام مخلوق سے محبوب ہے۔ آپ ان کے واسطہ سے دعا کریں میں معاف کر دوں گا۔ اگر محمد نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا نہ کرتا۔

امام حاکم لکھتے ہیں: هٰذا الحديث صحيح الاسناد

اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (شفاء الفواد مترجم ۲۸۲) (المستدرک ج ۲ ص ۶۷۲)

حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک نابینا صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں کہ میرے لیے بینائی کی دعا فرمایئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں اور چاہو تو صبر کرو اور صبر تمہارے لیے بہتر ہے انہوں نے عرض کیا دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت ادا کرو اور پھر دعا مانگو:

اللهم انی اسألک واتوجه اليک بمحمد نبی الرحمة يا محمد انی توجهت بک الی ربی فی حاجتی هذه تقضی لی اللهم شفعه فی .

(ابن ماجه ۱۰۰) (صحيح ابن خزيمه ج ۲ ص ۲۲۵، ۲۲۶)

اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف نبی رحمت محمد ﷺ کے وسیلہ سے متوجہ ہوتا ہوں۔

یا محمد! میں آپ کے وسیلے سے اپنی اس حاجت میں اپنے رب کی طرف توجہ کرتا ہوں، تا کہ پوری کر دی جائے۔ اے اللہ! میرے حق میں حضور کی شفاعت قبول فرما۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کافی عرصہ بارش کا سلسلہ منقطع رہا تو حضرت عمر نے حضرت عباس کا دامن پکڑ کر بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔

مولا! ہم تیرے نبی کے وسیلے سے بارش مانگتے تھے، آج تیرے نبی کے چچا کے وسیلے سے بارش مانگ رہے ہیں۔ بارش عطا فرما۔ چنانچہ بارش ہوگئی۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

ان عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه كان اذا قحطوا استسقیٰ بالعباس

بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ فقال اللھم انا کنا نتوسل الیک بنبینا صلی اللہ علیہ وسلم فسقینا واما نتوسل الیک بعم نبیک فاسقنا فیسقون

یعنی جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو حضرت عمر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے وسیلے سے بارش کی دعا کرتے اور عرض کرتے یا رب! ہم تیری بارگاہ میں تیرے نبی کے محترم چچا کا وسیلہ پیش کرتے ہیں تو ہمیں سیراب فرما، تو انہیں بارش عطا کر دی جاتی۔ (صحیح بخاری۔۱۳۵۱)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اللہ کی بارگاہ میں جس طرح اعمال صالحہ کا وسیلہ پیش کرنا جائز ہے اسی طرح ذوات صالحہ کا وسیلہ پیش کرنا بھی جائز ہے۔ اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ کیونکہ حضرت عمر نے یہ عمل صحابہ کرام کے اجتماع میں کیا اور کسی نے انکار نہیں فرمایا۔

حضرت عمر کا حضرت عباس کے وسیلہ سے دعا مانگنے میں یہ حکمت تھی کہ آپ یہ بتانا چاہتے تھے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پیش کرنا جائز ہے ایسے ہی آپ کے خاندان اور دیگر اہل خیر وصلاح کا وسیلہ پیش کرنا بھی جائز ہے۔

حافظ ابن حجر، علامہ عینی اور قاضی شوکانی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ویستفاد من قصة العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ استحباب الاستشفاع باھل الخیر والصلاح واھل بیت النبوۃ . الخ. (فتح الباری ۳۵۱۲)

اور حضرت عباس کے قصہ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اہل خیر وصلاح اور خاندان نبوت کے افراد کے ساتھ طلب شفاعت مستحب ہے۔

اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ وسیلہ بھی درحقیقت رسول اللہ ﷺ ہی کا وسیلہ ہے۔ آپ کی برکت اور آپ سے تعلق ہی کی وجہ سے دعا قبول ہوئی۔

علامہ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں:

فهذا دعوة مستجابة ببركة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم

اس دعا کی قبولیت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہوئی۔

(طبقات السبكى ٢،٩٠)

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدد سے جن دو یتیم بچوں کی گرتی ہوئی دیوار بنائی تھی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے قرآن پاک میں فرمایا:

وكان ابوهما صالحا (الكهف) ان بچوں کا باپ نیک تھا۔

اس لیے ان پر رب کا یہ کرم ہوا کہ ان کی گرتی ہوئی دیوار اللہ کے دو مقبول بندوں کے ذریعے بنوادی گئی۔ تفسیر کبیر میں اسی آیت کے تحت ہے:

يدل على ان صلاح الاباء يفيد العناية باحوال الابناء.

یعنی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ باپ دادا کی صالحیت اولاد کو لطف و کرم کا فائدہ دیتی ہے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ محمد بن المکندر رفرماتے ہیں:

ان الله يحفظ لصلاح العبد ولده وولد ولده و عترته وعشيرته واهل دويرات حوله فى حفظ الله مادام فيهم . (تفسير مظهرى. ٦،٧)

یعنی اللہ تعالیٰ بندے کی نیکی کی بدولت اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور اس کے عزیز و اقارب اور اس کے خاندان کے لوگوں کی حفاظت فرماتا ہے اور اس کے پڑوس کے رہنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت و پناہ میں رکھتا ہے۔ جب تک وہ نیک بندہ ان کے پڑوس میں موجود رہتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اہل خیر وصلاح کے وسیلہ اور ان کی برکت سے ان کی اولاد اور خاندان کے لوگوں کی حفاظت ہوتی ہے اور ان کے پڑوسیوں پر بھی اللہ کی عنایت رہتی ہے۔

بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آرہا تھا، وہ جہاد میں اس کو سامنے رکھتے تھے

اور اس کی بدولت دشمن پر فتح یاب ہوتے تھے۔ اس صندوق میں کیا تھا، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فيه سكينة من ربكم وبقية مما ترك ال موسىٰ وال هارون. (البقرة)

جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلوں کا چین وسکون ہے اور حضرت موسیٰ وہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں۔ تفسیر کبیر میں ہے:

اذا حضرو القتال قدموه بين ايديهم يستفتحون به على عدوهم .
(تفسیر کبیر ٦، ٨٨)

یعنی بنی اسرائیل جہاد کرتے تو اس تبرکات والے صندوق کو سامنے رکھتے اور اس کے وسیلے سے دشمنوں پر فتح کی دعا مانگتے تھے۔

مفتی شفیع دیوبندی اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آرہا تھا اس میں تبرکات تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کے۔ بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے۔ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا۔ (معارف القرآن ١، ٦٠٦)

ان تبرکات میں کیا چیزیں تھیں ان کے متعلق مفسرین فرماتے ہیں کہ ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور پارچات اور حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ تھا۔ سعودی عرب کی حکومت کی جانب سے شائع کردہ قرآن مجید کے اردو ترجمہ ومختصر تفسیر میں اسی آیت کے تحت ہے:

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء وصالحین کے تبرکات یقیناً باذن اللہ اہمیت وافادیت رکھتے ہیں۔ (القرآن الکریم وترجمہ معانیہ وتفسیر الی اللغۃ الاردویۃ ١٠٥)

معلوم ہوا کہ وفات یافتہ بزرگوں کے تبرکات کا وسیلہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں سے فائدہ پہنچانے کا سبب ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

فلما جاء البشیر القاہ علی وجھہ فارتد بصیرا (یوسف ۹۶)

پھر جب خوشی سنانے والا آیا اس نے وہ کرتا (یعقوب علیہ السلام) کے منہ پر ڈالا اسی وقت ان کی آنکھیں پھر آئیں۔

اس آیت کے تحت حضرت مفتی احمد یار خان صاحب فرماتے ہیں۔

بزرگوں کے تبرکات ان کے جسم سے چھوئی ہوئی چیزیں بیماروں کی شفا' دافع بلا' مشکل کشا ہوتی ہیں تو خود وہ حضرات یقیناً دافع بلا' مشکل کشا ہیں۔ رب تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام سے فرمایا۔

ارکض برجلک ھذا مغتسل بارد وشراب (۴۲)

اپنا پاؤں زمیں پر رگڑ اس سے پانی کا چشمہ پھوٹے گا۔ اسے پیو اور غسل کرو شفا ہوگی

ثابت ہوا کہ بزرگوں کے پاؤں کا دھوون بھی شفا ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے وسیلہ شفا بنایا گیا۔

کیا ندا شرک ہے؟

انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء عظام رحمہم اللہ سے توسل و استغاثہ کے منکرین ندائے غیر اللہ کو مطلقاً شرک قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ندا دعا ہے اور دعا عبادت ہے اور عبادت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے لئے جائز نہیں۔ ندا کے عبادت ہونے پر اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے۔

الدعاء ھو العبادۃ ہے۔

نیز فرمایا گیا۔ الدعاء مخ العبادۃ دعا عبادت کا مغز ہے۔

اس استدلال کے بعد یہ لوگ قرآن کریم کی وہ تمام آیات جو بتوں اور مشرکوں

کی مذمت میں نازل ہوئی ہیں کو انبیاء کرام واولیاء عظام سے توسل واستغاثہ اور ندا کو جائز سمجھنے والے مسلمانوں پر چسپاں کر کے انہیں مشرک قرار دیتے ہیں۔

لیکن ان کا ندا کو دعا اور ہر دعا کو عبادت قرار دینا ایک مفروضہ ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں جس حدیث پاک سے استدلال کر رہے ہیں ان کا یہ استدلال علمی میزان کے مطابق درست نہیں۔ اس لئے کہ "الدعا هو العبادة" میں ھو ضمیر فصل ہے اور علماء معانی و بلاغت کی تصریح کے مطابق ضمیر فصل اور تعریف خبر مسند کے مسند الیہ پر مقصور و محصور ہونے کا فائدہ دیتی ہے۔ مثلاً "الله هو الرزاق" کا معنی ہوگا اللہ ہی رزاق ہے۔ اور اسکے سوا کوئی رزاق نہیں۔ اسی طرح "الدعاء هو العبادة" کا مطلب ہوگا کہ عبادت دعا میں منحصر ہے یعنی عبادت سوائے دعا کے کچھ اور نہیں۔ اسی معنی کی تائید قرآن کریم کی آیت کر رہی ہے:

ما یعبوا بکم ربی لولا دعاؤکم (الفرقان. ۷۷)

میرے رب کے ہاں تمہاری کچھ قدر نہیں۔ اگر تم اسے نہ پوجو۔

اللہ کے ہاں انسان کی قدر و قیمت اور فضیلت و عظمت اس کی معرفت و اطاعت اور عبادت کی وجہ سے۔ ورنہ انسانوں کو چوپایوں پر بھی فضیلت حاصل نہ ہوتی۔ حج، نماز، روزہ، زکوۃ، شہادت، تلاوت، ذکر اطاعت وغیرہ تمام اعمال دعا ہی ہیں۔ اس اعتبار سے عبادت دعا میں محصور ہے۔

حدیث کے اس معنی کے اعتبار سے ندا کو منکرین کے زعم کے مطابق دعا کی ایک قسم تسلیم کرنے کے باوجود بھی ندا کا عبادت ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ دعا عبادت سے عام ہے۔

شبہ: بعض علماء بلاغت کی رائے کے مطابق تعریف خبر جیسا مسند الیہ پر مقصور ہونے کا فائدہ دیتی ہے، ایسے ہی کبھی مسند الیہ کے مسند پر محصور ہونے کا فائدہ بھی دیتی ہے۔ اس اعتبار سے حدیث پاک کا مطلب ہوگا دعا عبادت ہی ہے۔ لہٰذا جب دعا

عبادت ہوئی اور ندا دعا کی ایک قسم تو ندا بھی عبادت ہوئی اور عبادت اللہ کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں۔

ازالہ شبہ: یہ استدلال اس وقت درست ہوسکتا ہے جب الدعاء پر داخل الف لام استغراق یا جنس کے لیے ہو۔ حالانکہ وہ جنس و استغراق کے معنی میں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ بدیہی بات ہے کہ ہر دعا عبادت نہیں کیونکہ دعا کا لفظ عبادت کے علاوہ بہت سارے معنوں میں آتا ہے۔

لفظ دعا قرآنِ پاک میں مختلف معانی کیلئے مستعمل ہے:

یہ لفظ خود قرآن حکیم میں اپنے اصل مادہ کے ساتھ مختلف صیغوں کی شکل میں متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

ا۔ عبادت

قرآن کریم میں کئی مقامات پر دعا کا لفظ عبادت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

۱. قل انما ادعوا ربی ولا اشرک به احدا (الجن ۲۰)

فرما دیجئے میں اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتا۔

۲. وان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احداً (الجن ۱۸)

اور بیشک مسجدیں اللہ ہی کی ہیں تو اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔

۳. ومن اضل ممن يدعوا من دون الله من لا يستجيب له الی يوم القيمة وهم عن دعائهم غفلون (الاحقاف ۵)

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کے سوا کی عبادت کرے جو قیامت تک اس کی نہ سنیں اور انہیں ان کی پوجا کی خبر تک نہیں۔

۴. والذين يدعون من دون الله لا يخلقون شيأ وهم يخلقونَ اموات غير احياء. (النحل ۲۰،۲۱)

اور جو اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، وہ کچھ نہیں بناتے وہ خود بنائے ہوئے ہیں۔ مردے ہیں زندہ نہیں۔

۵. هو الحی لا اله الا هو فادعوه مخلصین له الدین الحمد لله رب العلمین قل انی نهیت ان اعبد الذین تدعون من دون الله .(المومن ۶۵،۶۶)

وہی زندہ ہے اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں تو اس کی عبادت کرو اور اسی کے بندے ہو کر سب خوبیاں اللہ کو جو سارے جہان کا رب، تم فرماؤ میں منع کیا گیا ہوں کہ ان کی عبادت کروں جنکی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔

۲۔ دعا مانگنا

قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

۱. ادعوا ربکم تضرعا و خفیة. (الاعراف)

اپنے رب سے دعا کرو گڑگڑاتے اور آہستہ۔

۲. واذا رکبوا فی الفلک دعوا الله مخلصین له الدین. (العنکبوت ۶۵)

پھر جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ سے دعا مانگتے ہیں دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔

۳. اجیب دعوة الداع اذا دعان (البقرة ۱۸۶)

میں دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے۔

۴. هنالک دعا زکریا ربه (آل عمران ۳۸)

وہاں ذکریا علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی

۵. ادعونی استجب لکم (المومن ۶۰)

مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔

ان آیات میں دعا کا اصطلاحی معنی مراد ہے۔ یعنی خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں دعا مانگنا اور اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا۔

۳۔ تمنا کرنا

لفظ دعا قرآن کریم میں تمنا و آرزو کرنے کے معنی مین بھی استعمال ہوا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون (حٰم السجدہ ۳۱)

وہاں (جنت میں) جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہو گی۔

اس آیت کریمہ میں دعا پکارنے اور عبادت کے معنی میں نہیں، بلکہ خواہش و آرزو کے معنی میں ہے۔

۴۔ مدد طلب کرنا

قرآن کریم میں لفظ دعا استعانت کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔

وادعوا شھداء کم من دون اللہ (البقرۃ. ۲۳)

اپنے سارے ہمنواؤں کو بلالو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو۔

(تفہیم القرآن)

۵۔ پکارنا اور بلانا

قرآن مجید میں لفظ دعا پکارنے اور بلانے کے معنی میں بھی آیا ہے درج ذیل آیات کریمہ میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱. **والرسول یدعوکم فی اخرکم** (آل عمران ۱۵۳)

اور دوسری جماعت میں رسول تمہیں پکار رہے تھے۔

۲. **ثم ادعھن یاتینک سعیا** (البقرۃ ۲۶۰)

اے ابراہیم! انہیں بلاؤ وہ آپ کے پاس چلے آئیں گے پاؤں سے دوڑتے۔

قال ربی انی دعوت قومی لیلا و نهارا فلم یزدھم دعائی الا فرارا

عرض کی اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات دن بلایا۔ میرے بلانے سے انہیں بھاگنا ہی پڑا

لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا. (النور ۶۳)

رسول کے پکارنے کو آپس میں ایسا نہ ٹھہراؤ جیسا تم میں ایک دوسرے کو پکارتا ہے۔

ولتکن منکم امة یدعون الیٰ الخیر (آل عمران ۱۰۴)

اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے کہ بھلائی کی طرف بلائے۔

ان آیات میں لفظ دعا پکارنے اور بلانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پہلی اور دوسری میں حضور علیہ السلام اور حضرت ابراہیمؑ کے پکارنے کا ذکر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے صحابہ کو پکارنے اور حضرت ابراہیم کا ذبح کیے گئے جانوروں کو پکارنے کا ذکر ہے اور تیسری آیت میں حضرت نوح کا اپنی قوم کو دن رات راہ ہدایت کی طرف بلانے کا ذکر ہے اور چوتھی میں صحابہ کرام کو بارگاہ نبوت میں ندا کے آداب سکھائے جا رہے ہیں اور آخری آیت میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو بھلائی کی طرف لوگوں کو بلانے کا حکم فرمایا گیا ہے۔

۶۔ قول

دعا کا لفظ کبھی قول کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

دعوا ھم فیھا سبحانک اللھم وتحیتھم فیھا سلام واخر دعواھم ان الحمد للہ رب العالمین. (یونس ۱۰)

وہاں ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی سبحان اللہ اور ان کا باہمی سلام یہ ہوگا السلام علیکم اور ان کی اخیر بات ہوگی۔ الحمد للہ رب العالمین

اس آیت کریمہ میں دونوں جگہ دعا قول یعنی بات کرنے کے معنی میں ہے۔

اس سابقہ ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ دعا متعدد معنوں میں آتا ہے۔ اس کو ہر جگہ ندا یا عبادت کے معنی میں ہی منحصر سمجھنا جہالت و نادانی ہے۔

نیز الدعا هو العبادة پر اگر الف لام استغراق یا جنس کے لیے ہو تو پھر باہم ایک دوسرے کو پکارنا بھی کفر ہوگا، حالانکہ منکرین توسل بھی ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہاں پر الف لام عہدی ہے اور حدیث میں دعا سے مراد اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا ہے نہ کہ مطلق دعا۔ اور اللہ سے دعا مانگنے کا عبادت ہونے میں کیا شک ہے۔ اللہ سے سوال کرنا اعظم العبادات میں سے ہے۔ حدیث میں دعا سے مراد مطلق دعا قطعاً نہیں ورنہ ہر قسم کی ندا و پکار جائز نہ ہوتی۔ الدعا ھو العبادۃ ایسے ہی ہے جیسے حدیث میں الحج عرفۃ ہے یعنی حج وقوف عرفہ ہے۔ حالانکہ حج میں دیگر ارکان بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حج کا رکن اکبر وقوف عرفہ ہے۔ ایسے ہی دعا کئی طرح کی ہے۔ لیکن دعا کا بہترین فرد وہی دعا ہے جو عبادت ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے جو دعا مانگی جاتی ہے۔ حدیث میں دعا کو عبادت اس لیے فرمایا گیا تاکہ دعا کرنے والا خشوع و خضوع کرے اور اپنی عاجزی و تذلل کا اظہار کرے کیونکہ عبادت خضوع و تذلل کا نام ہے۔

لہٰذا حدیث مذکور میں دعا سے مراد دعا کا اصطلاحی معنی ہے۔ یعنی خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے مانگنا نہ کہ مطلق دعا کیونکہ علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر طلب ادنیٰ کی اعلیٰ سے ہو تو اس کو سوال کہا جاتا ہے اور اگر طلب اللہ سے ہو تو اس کو دعا کہا جاتا ہے اور طلب اعلیٰ کی ادنیٰ سے ہو تو اسے امر کہا جاتا ہے۔

ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے بھی طلب ہو تو اس کو دعا نہیں کہا جائیگا۔

جب غیر خدا سے طلب کو دعا نہیں کہا جاتا تو پھر ایسی طلب بدرجہ اولیٰ بمعنی عبادت بھی نہ ہوگی۔ کیونکہ جب وہ دعا نہ ہوگی تو عبادت نہ ہوگی۔

ندا و دعا میں فرق ہے

ندا کو دعا قرار دینا اہل علم کی تصریحات کے خلاف ہے۔ علمائے اسلام نے ندا اور دعا کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مخلوق اگر مخلوق سے کوئی شئے طلب کرے تو اسکو شریعت اسلامیہ اور مسلمانوں کے عرف دونوں میں دعا نہیں کہا جاتا

چنانچہ مصباح الانام وجلاء الظلام میں دعا و ندا کے درمیان مغائیرت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

فاما قوله انه دعاء فكذب و بهتان وانما هو نداء والنداء غير الدعا لان الطلب اذا كان من مخلوق لمخلوق فلا يسمى دعاء لا شرعا ولا عرفا بين المسلمين كما نص عليه الامام المحدث زين العابدين العراقى الشافى والامام العلامه ابن رشد المالكي وشيخ الاسلام زكريا الانصارى الشافعي و غيرهم من الائمة الاعلام .

یعنی ندا کو ناجائز قرار دینے والے کا یہ کہنا کہ ندا دعا ہے، یہ کذب و بہتان ہے۔ ندا ندا ہی ہے۔ ندا غیر دعا ہے کیونکہ طلب اگر مخلوق کی مخلوق سے ہو تو اس کو نہ شرعا دعا کہا جاتا ہے نہ مسلمانوں کے درمیان جاری عرف میں جیسا کہ امام محدث زین الدین عراقی شافعی اور امام علامہ ابن رشد مالکی اور شیخ الاسلام زکریا انصاری شافعی وغیرہ ائمہ اعلام رحمہم اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی ہے۔

معلوم ہوا کہ دعا ہر جگہ ندا کے معنی میں نہیں اور نہ ہی ہر دعا عبادت ہے۔

اگر چہ بعض اوقات دعا کا لفظ ندا کے معنی میں آتا ہے جس کی سابقہ صفحات میں وضاحت کی جا چکی ہے۔ لیکن اس کو عبادت نہیں کہا جاتا اور نہ ہی ہر دعا عبادت ہے۔ اگر ہر ندا دعا ہوتی اور ہر دعا عبادت ہوتی تو پھر ہر ندا ممنوع ہوتی۔ زندوں اور وفات یافتہ میں سے کسی کو بھی پکارنا جائز نہ ہوتا۔

عبادت صرف وہی ندا ہو گی جہاں پکارنے والا جس کو پکار رہا ہے۔ اس کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا ہو اور اس کو مستحق عبادت سمجھتا ہو۔ شرک میں مبتلا کرنے والی چیز درحقیقت غیر اللہ کی الوہیت کا اعتقاد اور غیر اللہ کے موثر حقیقی ہونے کا عقیدہ یا اس کو مستحق عبادت ماننا ہے۔ ورنہ کسی کے لیے الوہیت، تاثیر حقیقی یا استحقاق عبادت کا عقیدہ رکھے بغیر مجرد ندا نہ شرک ہے اور نہ عبادت۔ جس کو پکارا جا رہا ہے وہ خواہ زندہ ہو یا وفات یافتہ، غائب ہو یا حاضر، جاندار ہو یا بے جان، ہر صورت میں مجرد ندا نہ شرک ہے اور نہ عبادت۔ بہت ساری احادیث میں اموات اور جمادات کے لیے ندا وارد ہے۔ لہٰذا مطلقاً ہر ندا دعا ہے اور دعا عبادت ہے کہنا کسی طور پر بھی صحیح نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر وفات یافتہ اور زندہ ہر دونوں کو پکارنا ناجائز ہوتا۔ اس لیے کہ غیر موثر ہونے میں وفات یافتہ اور زندہ دونوں برابر ہیں، نہ زندہ کو کسی امر میں تاثیر حقیقی حاصل ہے اور نہ ہی وفات یافتہ کو۔ کوئی مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے بھی نہ الوہیت کا اعتقاد رکھتا ہے، نہ ہی اس کے لیے کسی قسم کی تاثیر حقیقی کا عقیدہ رکھتا ہے۔

شبہ: منکرین ندا و توسل کی جانب سے یہ شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ زندہ کو پکارنا تو جائز ہے۔ اسلیئے کہ وہ مطلوب پر قدرت رکھتا ہے جب کہ وفات یافتہ اور جمادات کو تو کوئی قدرت حاصل نہیں۔ وہ تو عاجز ہیں کسی بھی کام کو کرنے کے ان میں طاقت نہیں، لہٰذا اس فرق کے پیش نظر زندہ سے تو ندا جائز اور وفات یافتہ و جمادات سے ناجائز ہے

ازالۂ شبہ: اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کا زندہ کے بارے میں یہ عقیدہ

رکھنا کہ وہ بعض اشیاء پر قدرت رکھتا ہے اس عقیدہ کو مستلزم ہے کہ بندہ اپنے افعال اختیاریہ کا خالق ہے اور یہ اعتقاد فاسد اور مذہب باطل ہے۔ کیونکہ اہل سنت کا مذہب ہے کہ بندوں اور ان کے افعال کا خالق صرف اللہ ہی ہے۔ بندے کو صرف کسب ظاہری میں دخل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: واللہ خلقکم وما تعملون (الصافات:۹۶)
اللہ نے پیدا کیا تمہیں اور تمہارے اعمال کو

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللّٰہ خالق کل شئی (الزمر:۶۲)
اللہ ہر چیز کا خالق ہے

لہٰذا زندہ و وفات یافتہ اور جمادات سب خالق نہ ہونے اور تاثیر حقیقی حاصل نہ ہونے میں برابر ہیں۔ موثر حقیقی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

توحید کے منافی و مخالف جو چیز ہے وہ غیر اللہ کے لیے تاثیر و الوہیت یا استحقاق عبادت کا اعتقاد رکھنا ہے اور ان امور کا کسی کے لیے اعتقاد رکھے بغیر صرف ندا میں کوئی حرج نہیں۔ نہ ہی یہ ناجائز و حرام ہے اور نہ ہی عقیدہ توحید کے منافی۔

احادیث سے ندا کا ثبوت

بہت ساری احادیث میں وفات یافتگان و جمادات کے لیے ندا وارد ہے۔ جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

۱۔ بینائی سے محروم صحابی کے واقعہ والی وہ حدیث جسے عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

اس حدیث میں: یا محمد انی اتوجہ بک الیٰ ربک
(اے محمد! تیرے رب کی بارگاہ میں میں تیرے وسیلہ سے حاضر ہوں) کے الفاظ وارد ہیں۔ اور صحابہ کرام اس دعا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد

بھی استعمال فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن حنیف نے حضرت عثمان غنی ذوالنورین کے دور خلافت میں ایک شخص کی حاجت برآری کے لیے اس دعا کی تعلیم دی۔ اس دعا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ توسل اور بعد از وصال آپ سے طلب مدد کے لیے ندا موجود ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی حضرت بلالؓ بن حارث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور پر حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں:

یا رسول اللہ استسق لامتک (البدایہ:۹۱/۱)

یارسول اللہ! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا فرمائیے

اس حدیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد وصال خطاب وندا اور طلب مدد موجود ہے۔

۳۔ زیارت قبور کے حوالے سے جو احادیث وارد ہیں ان میں کثیر تعداد میں ایسی احادیث موجود ہیں۔ جن میں اہل قبور سے خطاب وندا موجود ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

مر النبی صلی الله علیه وسلم بقبور بالمدینة فاقبل علیهم بوجهه فقال السلام علیکم یا اهل القبور یغفر الله لنا ولکم انتم سلفنا و نحن بالاثر.

(ترمذی ج ۱ ص ۱۲۵)

نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں کچھ قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ نے ان کی طرف منہ کر کے فرمایا "اے اہل قبور! تم پر سلامتی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری بخشش فرمائے، تم ہمارے پیش رو ہو اور ہم تمہارے ساتھ آ کر ملنے والے ہیں"۔

۴۔ حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبور کی زیارت کرنے والے کو یہ دعا سکھایا کرتے تھے۔

السلام علیکم اهل الدیار من المومنین والمسلمیں وانا ان شاء الله بکم

للاحقون نسال الله لنا و لكم العافية .(صحیح مسلم شریف : ۱۴۱ /۳)

اے گھر والے مومنین و مسلمیں! تم پر سلامتی ہو اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو بیشک ہم تمہارے ساتھ ضرور آ ملنے والے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنی اور تمہاری عافیت طلب کرتے ہیں۔

۵۔ نماز میں پڑھا جانے والا تشہد جو حدیث سے ثابت ہے جس کو ہر مسلمان نماز میں پڑھتا ہے اور کہتا ہے "السلام علیک ایها النبی و رحمة الله و بر کاته" اس میں نداء موجود ہے۔

۶۔ قحط سالی کے زمانہ جس کو عام الرمادہ بھی کہا جاتا ہے، میں حضرت بلالؓ بن حارث نے ایک بکری ذبح کی تو اسے کمزور و لاغر پا کر کہنے لگے۔

وامحمداه، وامحمداه اے محمد! اے محمد!

۷۔ صحیح روایت میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جب مسیلمہ کذاب کے ساتھ جہاد فرمایا تو اس جہاد میں ان کا شعار وامحمداه! وامحمداه! (اے محمد! اے محمد!) تھا۔

۸۔ شفا قاضی عیاض میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا پاؤں سو گیا تو انہیں کہا گیا کہ اس شخصیت کو پکاریں جو آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اس پر آپ نے وامحمداه! (اے محمد!) کہنا شروع کر دیا۔ اسی وقت پاؤں ٹھیک ہو گیا اور چلنے لگے۔ (مصباح الانام:۲۰۰)

۹۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا انفلتت دابة احدكم بارض فلاة فليناد عباد الله احبسوا فان لله عباداً يجيبونه.

جب تم میں سے کسی کا جانور کسی صحرا میں چھوٹ جائے تو اس کو چاہیے کہ عباد اللہ کو پکارے کہ روکو! بیشک اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جو اس کو جواب دیں گے یعنی

اس کی مدد کریں گے۔

۱۰۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا ضل احدکم شیأ او اراد عونا وھو بارض لیس فیھا انیس فلیقل یا عباد اللہ اعینونی وفی روایۃ اغیثونی فان للہ عبادا لا ترونھم

جب تم میں سے کوئی کسی شئے کو گم کر دے یا مدد چاہے اور وہ ایسی جگہ پر ہے جہاں اس کا کوئی واقف کار نہیں تو اس کو چاہیے کہ یوں کہے "یا عباد اللہ اعینونی" اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔ اور دوسری روایت میں ہے اغیثونی "میری مدد کرو"

بے شک اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے بندے ہیں جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے ہو۔

دیکھئے: ان میں غائب کو ندا ہے۔ (ادلۃ جواز التوسل السید احمد بن زینی دحلان مفتی مکہ)

۱۱۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی اطلاع پا کر آپ کے پاس آئے تو آپ کی جبین مبارک کو بوسہ دے کر رونے لگے اور کہنے لگے:

بابی وامی طبت حیا ومیتا اذکرنا یا محمد عند ربک

میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ موت وحیات ہر دو حالتوں میں پاکیزہ ہیں۔ یا رسول اللہ! ہمیں اپنے رب کے ہاں یاد فرمائیے۔ (ادالہ جواز التوسل: ۲۰۱)

۱۲۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیتے ہوئے یہ کہنے لگے۔

وانبیاہ' واصفیاہ' واخلیلاہ

اے اللہ کے نبی! اے اللہ کے پسندیدہ! اے اللہ کے خلیل!

۱۳۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق آئے اور آپ کو بوسہ دے کر رونے لگے اور کہنے لگے۔

والذی نفسی بیدہٖ رحمۃ اللہ علیک یا رسول اللہ ما اطیبک حیا و میتا.

(البدایہ: ۵:۲۱۳)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یا رسول اللہ! آپ پر اللہ کی رحمت ہو، آپ موت وحیات ہر دو حالتوں میں کتنے پاکیزہ ہیں۔

۱۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور آپ نے خطاب فرمایا' آپ کے خطاب کے بعد حضرت عمر کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا یقین ہوا تو روتے ہوئے کہنے لگے۔

بابی انت وامی یا رسول اللہ لقد کان لک جزع تخطب الناس علیہ فلما کثروا اتخذت منبرا لتسمعھم حن الجذع لفراقک حتی جعلت یدک علیہ فسکت فامتک اولی بالحنین علیک حین فارقتھم بابی انت وامی یا رسول اللہ لقد بلغ من فضیلتک عندہ ان بعثک آخر الانبیاء وذکرک فی اولھم فقال واذا اخذنا من النبیین میثاقھم و منک ومن نوح وابراھیم و موسی وعیسیٰ الایہ. بابی انت وامی یا رسول اللہ لقد بلغ من فضیلتک عندہ ان اھل النار یودون ان یکونوا اطاعوک و ھم بین اطباقھا یعذبون یا لیتنا اطعنا اللہ والرسول بابی انت وامی یا رسول اللہ اتبعک فی قصر عمرک ما لم یتبع نوحافی کبر سنہ وطول عمرہ. (ادلہ جواز التوسل: ۲۰۱)

یعنی میرے ماں باپ آپ پر فدا یا رسول اللہ! آپ کھجور کے ایک خشک تنے پر تشریف فرما کر لوگوں کو خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو آپ نے ممبر کا انتخاب فرمایا۔ آپ کے فراق میں تنے کے رونے کی آواز سنی گئی۔ حتیٰ کہ آپ نے اس پر اپنا دست اقدس رکھا تو وہ خاموش ہو گیا۔ آپ کی امت آپ کے فراق میں تنے سے زیادہ رونے کی حقدار ہے۔ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا! اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ آپ کو تمام انبیاء کے آخر میں مبعوث فرمایا اور آپ کا ذکر سب سے پہلے کیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: واذ اخذنا من النبیین میثاقھم و منک (الآیۃ)

یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کی شان اللہ کے ہاں اتنی بلند ہے کہ جہنمی لوگ عذاب کی حالت میں بھی تمنا کریں گے کہ کاش! انہوں نے آپ کی اتباع کی ہوتی اور کہیں گے "یا لیتنا اطعنا اللہ و الرسولا" یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا! آپ کی مختصر عمر کے باوجود لوگوں کی اتنی کثیر تعداد نے آپ کی اتباع کی حضرت نوح علیہ السلام کو کبر سنی اور طوالت عمر کے باوجود متبعین کی اتنی تعداد میسر نہ ہوئی۔

حضرت علامہ سید احمد بن زینی دحلان فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو بہت سارے آئمہ دین نے روایت کیا ہے۔ قاضی عیاض نے شفاء میں اور علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اور امام غزالی نے احیاء العلوم میں اور ابن الحاج نے المدخل میں روایت فرمایا ہے۔ (ادلۃ جواز التوسل۔۲۰۱)

حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر کے ان الفاظ پر غور کریں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد از وصال توسل کیا اور کئی مرتبہ خطاب کیا اور کئی مرتبہ یارسول اللہ یا محمد کے ساتھ ندا کی۔

۱۵۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یوں کہا:

یا ابتاہ اجاب ربا دعاہ، ابتاہ جنۃ الفردوس ماواہ، یا ابتاہ الیٰ جبریل ننعاہ۔
(صحیح بخاری: ۲، ۲۸۲)

اے میرے ابا جان! جنہوں نے اپنے رب کی دعوت کو قبول فرمالیا۔ اے میرے ابا جان! جنت الفردوس جن کا ٹھکانہ ہے۔ اے میرے ابا جان! جن کے وصال کی خبر ہم حضرت جبریل کو دیں گے۔

دیکھیئے! اس حدیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کو نداء دینا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے۔

۱۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے وصال پر ایک قصیدہ مرثیہ نظم کیا۔ جس کا مطلع یہ ہے:

الا یا رسول اللہ انت رجائنا و کنت بنا برا و لم تک جافیا

یارسول اللہ! آپ ہماری امید تھے اور آپ ہم پر شفیق تھے۔ آپ جفا فرمانے والے نہ تھے۔ (ادلہ جواز التوسل: ۲۰۱)

یہ قصیدہ صحابہ کرام کی موجودگی میں پڑھا گیا اور انہوں نے سنا لیکن کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ بعد از وصال ندا و خطاب کو جائز سمجھتے تھے۔

۱۷۔ فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے تدفین میت کے بعد تلقین کے استحباب کی تصریح فرمائی ہے۔ تلقین کے الفاظ میت کو ندا و خطاب پر مشتمل ہیں۔

علامہ سید طحطاوی حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وتلقینہ بعد الدفن حسن و استحبہ الشافعیۃ لما من ابی امامۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ اذا مات احدکم فسویتم علیہ التراب فلیقم احدکم علی رأس القبر ثم لیقل یا فلان ابن فلانۃ فانہ یسمع و لایجیب ثم لیقل یا فلان ابن فلانۃ فانہ یستوی قاعدا ثم لیقل یا فلان ابن فلانۃ فانہ یقول ارشدنا یرحمک اللہ ولکنکم لا تسمعون فیقول اذکر ماخرجت علیہ من الدنیا شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وشھادۃ ان محمد رسول اللہ و انک رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا وبالقرآن اماما۔ الخ.

(حاشیہ الطحطاوی علی مراقی الفلاح : ۳۳۸)

اور میت کو تلقین اچھا عمل ہے۔ شافعی علماء نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث کی بناء پر مستحب قرار دیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے

ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کو موت آجائے' تم اس پر مٹی ڈال چکو تو تم میں سے ایک آدمی قبر کے سر کی جانب کھڑا ہو جائے اور پھر کہے۔ اے فلاں فلانی عورت کے بیٹے! پس وہ میت اس کی بات کو سن رہا ہے' لیکن جواب نہیں دیتا۔ پھر تلقین کرنے والا کہے۔ اے فلاں فلانی عورت کے بیٹے! تو میت سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر تلقین کرنے والا کہے' اے فلاں فلانی عورت کے بیٹے! تو میت کہتا ہے اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ ہماری رہنمائی کریں۔ لیکن تم میت کی بات کو نہیں سن سکتے ہو۔ اس کے بعد تلقین کہنے والا کہے۔ اس عہد کو یاد کر جس پر تیرا دنیا سے انتقال ہوا ہے۔ یعنی لا الہ الا اللہ کی شہادت اور اللہ کے رب ہونے اور اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے اور قرآن کے رہنما ہونے پر راضی تھا۔

تلقین میت کے جو الفاظ حدیث مذکور میں مروی ہیں وہ بھی ندا میت وخطاب میت پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا نداء کو مطلقاً ناجائز کہنا کسی طور پر بھی درست نہیں۔ اس پوری بحث سے یہ بات خوب آشکار و واضح ہوئی کہ ندا کو دعا سمجھنا اور ہر دعا کو عبادت سمجھنا ایک مفروضہ ہے اور اس مفروضے کی بناء پر نداء غیر اللہ کو شرک قرار دینا قول فاسد اور مذہب باطل ہے۔

وللّٰہ الحمد علی ذالک وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہٖ محمد و آلہ واصحابہ اجمعین.

نورانیت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشریت و نورانیت دونوں سے نوازا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کامل بشر بھی اور کامل نور بھی ہیں۔ بشریت اور نورانیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں ہیں اور یہ دونوں شانیں بے مثال ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو ان دونوں شانوں سے اس لیے نوازا تا کہ کائنات کے تمام طبقات آپ سے مستفیض ہو سکیں۔

بشر اس لیے بنایا تا کہ انسان آپ کی سیرت طیبہ سے رہنمائی حاصل کریں اور نور اس لیے بنایا کہ نورانی مخلوق آپ سے فیض یاب ہو۔

نور کی تعریف:

جو ظاہر بنفسہ ہو اور مظہر لغیرہ ہو اسے نور کہتے ہیں یعنی خود روشن اور دوسروں کو روشن کرے۔

نور کی اقسام: نور کی دو قسمیں ہیں۔

نور حسی: جو دیکھنے میں آئے جیسے بجلی، چراغ، دھوپ وغیرہ کی روشنی۔

نور معنوی: جو آنکھ کے دیکھنے سے محسوس تو نہ ہو مگر عقل کہے کہ یہ روشنی ہے جیسے علم، ہدایت وغیرہ۔

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت حسی بھی تھی اور معنوی بھی آپ کی نورانیت کو صحابہ نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا جس کا ہم آئندہ تذکرہ کریں گے۔

نورانیت مصطفیٰ کا ثبوت قرآن حکیم سے

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین . (المائدہ ۱۵)

یعنی بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور آیا اور روشن کتاب آئی۔

اس آیت کریمہ میں تمام مفسرین کرام نے (ماسوائے چند معتزلہ کے)

نور سے مراد حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی لی ہے۔

اسی آیت کریمہ کے تحت حضرت عبداللہ ابن مسعود سے مروی ہے کہ:

قد جاء کم من اللہ نور رسول یعنی محمداً

بے شک تمہارے پاس اللہ کا نور آیا یعنی رسول جن کا اسم گرامی محمد ہے۔

۲۔ امام جلال الدین سیوطی کہتے ہیں اس آیت کریمہ میں نور سے مراد حضور ﷺ ہیں اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔

قد جاء کم من اللہ نور ھو النبی ﷺ و کتاب قرآن . (جلالین)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور آیا حضور ﷺ کی ذات اقدس ہے اور کتاب آئی اس سے مراد قرآن مجید ہے۔

۳۔ علامہ محمود آلوسی کہتے ہیں:

قد جاء کم من اللہ نور ای عظیم وھو نور الانوار والنبی المختار ﷺ

(روح المعانی)

یعنی تمہاری طرف اللہ کا نور آیا جو عظیم ہے اور اس سے مراد نبی مختار کی ذات اقدس ہے جو تمام انوار کا سرچشمہ ہے

۴۔ امام رازی کہتے ہیں:

المراد بالنور محمد ﷺ وبکتاب القرآن.

یعنی نور سے مراد حضرت محمد ﷺ اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔

۵۔ تفسیر صادی میں اسی آیت کریمہ کے تحت ہے:

قولہ ھو النبی ای سمی نور لانہ ینور البصائر ویھدیھا الرشاد لانہ اصل کل نور حسی و معنوی.

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں حضور ﷺ کو نور اس لیے فرمایا کہ آپ بصارتوں کو نورانی کرتے ہیں اور کامیابی کی جانب ہدایت دیتے ہیں اور اس لیے کہ حضور ﷺ ہر حسی اور معنوی نور کی اصل ہیں۔

٦۔ تفسیر مدارک میں ہے:

او النور محمد ﷺ لانه يهتدى به كما سمى سراجا

نور سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں اس لیے کہ آپ سے ہدایت ملتی ہے جیسے کہ رب نے انہیں سراج فرمایا ہے۔

آیت نمبر ۲ **الله نور السمٰوٰت والارض مثل نوره كمشكوٰة فيها مصباح المصباح في زجاجة .** (النور ۳۵)

یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے طاق میں چراغ ہو اور وہ چراغ شیشے کے فانوس میں ہو۔

اس آیت کریمہ میں مثل نورہ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت کعب، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ ابن زبیر، سعید ابن جبیر، ضحاک رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور ﷺ کی ذات اقدس مراد لی ہے۔

تفسیر مظہرہ میں اسی آیت کے تحت ہے:

قال سعيد ابن جبير والضحاک هو محمد ﷺ (المظهرى ج ٦، ٥٢٢)

امام خازن اور بغوی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے حضرت کعب سے اس ضمن میں سوال کیا: **اخبرنى عن قوله تعالىٰ مثل نوره كمشكوٰة**

مجھے اللہ تعالیٰ کے ارشاد مثل نورہ کمشکوٰۃ کے بارے میں بتائیں کہ اس سے کیا مراد ہے؟ حضرت کعب نے جواباً فرمایا

هٰذا مثل ضربه الله لنبيه ﷺ فالمشكوٰة صدره والزجاجة قلبه والمصباح فيها النبوة توقد من شجرة مباركة هى شجرة النبوة. (الخازن جلد ۵ ص ٦۵)

یعنی آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے متعلق ایک مثال بیان فرمائی مشکوٰۃ سے مراد آپ کا سینہ اقدس ہے اور زجاجۃ سے مراد آپ کا قلب اطہر ہے

اور مصباح سے مراد صفت نبوت ہے جو شجر نبوت سے روشن ہے معلوم ہوا کہ کعب بن احبار اور ابن جبیر کے نزدیک آیت کریمہ میں نورہ سے مراد حضور ﷺ ہیں۔

قال سهل ابن عبدالله المعنى الله هادى السموات والارض ثم قال مثل نور محمد ﷺ اذا كان مستودعا فى الاصلاب كمشكوٰة صفتها كذا واراد بالمصباح قلبه والزجاجة صدره اى كانه كوكب درى لما فيه من الايمان والحكمة يوقد من شجرة مباركة اى من نور ابراهيم عليه الصلوٰة والسلام وضرب المثل بالشجرة المباركة وقوله يكاد زيتها يضىء اى تكاد نبوة محمد ﷺ تبين للناس قبل كلامه كهذا الزيت
(الشفاء جلد ۱ ص ۲۱)

یعنی سہل بن عبداللہ کہتے ہیں کہ اس کا معنیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمیں وآسمانوں کا ہادی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نور محمد ﷺ کی مثال بیان فرمائی ہے جبکہ آپ آباو اجداد کی پشتوں میں تھے اس صفت کے حامل طاقچہ سے مصباح سے مراد آپ کا قلب اطہر ہے زجاجہ سے مراد آپ کا سینہ اقدس ہے گویا وہ ایک روشن ستارہ ہے اس لیے کہ اس میں ایمان وحکمت ہے۔ (جو مبارک درخت سے روشن ہے) اس سے مراد نور ابراہیم سے روشن ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان یکاد زیتہا یضیء سے مراد حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا لوگوں کے سامنے عنقریب ظاہر ہونا ہے۔ یعنی آپ کی نبوت لوگوں پر عنقریب ظاہر ہوگی اگرچہ آپ کلام بھی نہ کریں۔

آیت ۳: يا ايها النبى انا ارسلنك شاهداً و مبشراً و نذيراً و داعياً الى الله باذنه وسراجاً منيرا. (الاحزاب ۴۶)

یعنی اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کو شاہد اور بشارت دینے والا اور ڈرسنانے والا اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن کرنے والا آفتاب بنا کر بھیجا۔

اس آیت میں اللہ نے حضور ﷺ کو سراج منیر فرمایا۔ سراج عربی لغت میں آفتاب یا چراغ کو کہا جاتا ہے اور منیر کے معنی ہیں دوسروں کو روشن کرنے والا۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی ذات اقدس ایک ایسے چراغ کی طرح ہے جو خود ہی روشن نہیں بلکہ ہر سو نور و روشنی کی سوغات تقسیم کرتا ہے۔ حضرت امام رازی حضور ﷺ کے حق میں لفظ سراج کے استعمال کی حکمتیں یوں بیان فرماتے ہیں

ولم یقل انه شمس مع انها اشهر اضائة من السراج لفوائد منها ان الشمس نور لا یوخذ منها شئی والسراج یوخذ منه انوار کثیرة.
(تفسیر کبیر، ج ۱۶ ص۲۲۷)

آیت مذکورہ میں آپ کے حق میں سراج فرمایا گیا ہے شمس نہ فرمایا گیا حالانکہ سورج کی روشنی چراغ کی روشنی سے زیادہ ہوتی ہے اس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ شمس کا نور اخذ نہیں کیا جا سکتا بخلاف چراغ کے کیونکہ اس سے انوار کثیرۃ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ علامہ قسطلانی کہتے ہیں:

فهو السراج الكامل فی الاضاة ولم یوصف بالوهاج المنیر هو الذی ینیر من غیر احراق بخلاف الوهاج (المواهب اللدینیه، ج ۳ ص ۱۷۱)

یعنی آپ روشنی میں سراج کامل ہیں آپ کو صفت وھاج (جلانے والا) کے ساتھ متصف نہیں فرمایا بلکہ منیر فرمایا گیا ہے کیونکہ منیر اس کو کہا جاتا ہے جو اشیاء کو روشن کرے مگر جلائے نہیں بخلاف وہاج کے کہ وہ روشنی کے ساتھ حرارت بھی دیتا ہے۔

آیت ۴:۔ والنجم اذا هوی. (النجم ۔ ۱)

سورۃ نجم کی اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو روشن ستارہ کہہ کر قسم فرمائی ہے۔ علامہ آلوسی امام جعفر الصادقؓ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قال جعفر الصادقؓ النجم هو النبی ﷺ وھو یته نزوله من السماء لیلة المعراج ۔ (روح المعانی ج ۲۷ ص ۴۵)

النجم سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے اور ھوی سے مراد آپ کا معراج سے واپس تشریف لانا ہے ھــویٰ کا معنی چونکہ نزول کے علاوہ عروج وصعود بھی ہے اسی لیے علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

وجوز علی ھٰذا ان یراد بھویتهٗ صعودهٗ و عروجه علیه الصلوٰة والسلام الیٰ منقطع الأ ین. (روح المعانی ۲۷ ص ۴۵)

یعنی نجم سے مراد آپ کی ذات اقدس ہے اور ھــوی سے آپ کا لامکاں تک تشریف لے جانا بھی مراد ہوسکتا ہے یعنی لفظ ھــویٰ میں آپ کے آنے اور جانے دونوں کی قسم کھائی گئی ہے۔

علامہ قاضی ثناءاللہ صاحب امام جعفر صادقؓ کے قول پر دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ان ارید بـالـنـجـم محمد ﷺ وبھویته نزوله من السماء لیلة المعراج فلا شک ان نـزول مـحـمـد بـعد عروجه لھدایة الخلق نعمة جلیلة من الله لا نظیرلهٗ . (المظھری ح ۹ . ص ۱۰۳)

اگر نجم سے مراد آپ ﷺ کی ذات اقدس اور ھوی سے مراد آپ کا معراج سے واپس تشریف لانا مراد ہوتو (جیسا کہ امام جعفر صادق کا قول ہے) پھر قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا اتنے عروج کے بعد مخلوق کی ہدایت ورہبری کے لیے تشریف لانا بے شک اللہ تعالیٰ کی ایسی بڑی نعمت ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔

نورانیت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم احادیث کی روشنی میں

۱. عن ابی اسحاق قال سئل رجل عن البراء ابن عازب اکان وجہ رسول اللہ ﷺ مثل السیف قال لا بل مثل القمر.

(شمائل ترمذی ص ۳ صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۳)

ابو اسحاق سے روایت ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک تلوار کی طرح تھا؟ انہوں نے فرمایا نہیں بلکہ چاند کی طرح تھا۔

۲. عن عائشةؓ ان رسول اللہ ﷺ دخل علیها مسروراً تبرق اساریر وجهه.

(بخاری ج ۱ ص ۵۹۲)

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ خوش و مسرور ہو کر میرے پاس تشریف لائے دراں حالیکہ حضور ﷺ کی پیشانی مبارک کے خطوط چمک رہے تھے۔

۳. عن کعب بن مالک قال فلما سلمت علی رسول اللہ ﷺ وهو یبرق وجهه من السرور کان رسول اللہ ﷺ اذا سر استنار وجهه کانه قطعة من القمر. (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۲)

کعب ابن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے جب رسول اللہ ﷺ پر سلام عرض کیا تو آپ کا چہرہ انور فرحت و سرور سے چمک رہا تھا اور حضور ﷺ جب خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ انور ایسا چمکنے لگتا تھا گویا کہ وہ چاند کا ٹکڑا ہے۔

۴۔ مواہب اللدنیہ میں امام قسطلانی نقل کرتے ہیں:

وقال ابو هریرة واذا ضحک ﷺ یتلا لؤفی الجدار ای یضئی فی الجدر

بضم الجیم والدال جمع الجدار وھو الحائط ای یشرق نورہ علیھا اشراقا کاشراق الشمس علیھا. (مواھب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۷۱)

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ جب حضورﷺ مسکراتے تھے تو حضور کا نور دیواروں پر چمکتا تھا اس حدیث کو امام بزار اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔ امام قسطلانی حدیث کے معنی بیان کرتے ہیں کہ حضورﷺ کا نور دیواروں پر ایسا چمکتا اور روشن ہوتا تھا جیسے سورج کی روشنی دیوار پر پڑتی ہے اور چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

۵۔ احکام ابن القطان میں منجملہ ان روایات کے جو ابن مرزوق نے ذکر کی ہیں حضرت علی بن الحسین یعنی حضرت امام زین العابدین سے روایت ہے اور انہوں نے اپنے والد امام حسینؓ سے اور انہوں نے اپنے والد حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا کہ ہم آدم علیہ السلام کے پیدائش سے چودہ ہزار برس پہلے اپنے رب کے حضور میں ایک نور تھے۔ (نشر الطیب ص ۷۔ رسالہ نور از مفتی احمد یار خان نعیمیؒ)

۶۔ محدث ابن جوزی نقل کرتے ہیں حضرت حلیمہ سعدیہ فرمایا کرتی تھیں۔

اذا ارضعتہ فی المنزل استغنی بہ من المصباح

جن دنوں میں حضورﷺ کو دودھ پلایا کرتی ان دنوں مجھے گھر میں چراغ کی ضرورت نہ ہوتی۔

چنانچہ ایک دن مجھ سے خولہؓ نے پوچھا کہ کیا تم گھر میں رات کو آگ جلائے رکھتی جو جس سے تمہارے گھر میں روشنی رہتی ہے تو میں نے جوابا کہا:

لا واللہ اوقد نارا ولکنہ نور محمدﷺ

اللہ کی قسم میں آگ نہیں جلاتی بلکہ یہ نور محمدﷺ کی روشنی ہے۔

(المیلاد النبوی ص ۵۴ از محدث ابن جوزی)

۷۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی شمائل محمدیہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت حلیمہ سے مروی ہے:

وما كنا نحتاج الى السراج يوم اخذناه لان نور وجهه كان انور من السراج فاذا احتجنا الى السراج فى مكان جئنا به فتنورت الامكنة ببركته ﷺ

(المظهرى ج ٦ ص ٥٢٨)

جس دن سے ہم آپ ﷺ کو اپنے گھر لائے اس دن سے ہمیں چراغ گھر میں جلانے کی حاجت نہ رہی کیونکہ آپ کے چہرہ اقدس کا نور چراغ سے زیادہ منور تھا جب کبھی ہمیں کسی جگہ چراغ کی ضرورت ہوتی تو ہم آپ ﷺ کو اٹھا کر وہاں لے جاتے آپ کی برکت سے وہ تمام جگہ روشن ہو جاتی۔

۸۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

لما كان يوم الذى دخل فيه رسول الله ﷺ المدينة اضاء منها كل شئى.

(ترمذى ج ٢ ص ٢٠٣)

جس دن آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ کی برکت سے تمام شہر کی ہر شیئ روشن ہوگئی۔

۹۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوت میں ایک نعتیہ قصیدہ پیش کیا۔ جس میں دو شعر یہ بھی تھے:

وانت لما ولدت اشرقت الارض وضاءت بنورک الافق

فنحن فى ذالک الضياء و فى النور سبيل الرشاد نحترق

جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے نور سے زمیں اور آسمان کے کنارے چمک گئے پس ہم اسی نور اور روشنی میں ہیں اور اس سے ہدایت کے راستے طے کر رہے ہیں۔

(نشر اطيب از تهانوى صاحب ص ٨)

۱۰۔ ہندابن ابی ہالہ فرماتے ہیں:

كان رسول الله ﷺ فحما مفحما يتلاء و وجهه تلاء لو القمر ليلة البدر.

حضورﷺ عظیم اور معظم تھے آپ کا چہرہ انور ایسا چمکتا اور روشنی دیتا تھا۔ جیسے چودہویں رات میں چاند چمکتا ہے۔

اسی حدیث میں آگے چل کر فرماتے ہیں: له نور يعلوه

حضور کی بنی مبارک کا نور بنی مبارک پر یا آپ کی ذات مقدسہ کا نور ذات پاک پر غالب رہتا۔ (شمائل ترمذی ص۲)

اس حدیث کی شرح میں علامہ شیخ ابراہیم بیجوریؒ فرماتے ہیں "یتلالؤ" کے معنی روشن ہونے اور چمکنے کے ہیں جیسے موتی چمکتا ہے اور تلالو القمر ليلة البدر کے معنی یہ ہیں کہ حضورﷺ کا چہرہ انور اس طرح چمکتا ہے جیسے چودہویں رات میں چاند چمکتا ہے۔ (مقالات کاظمیؒ)

۱۱۔ جابرابن سمرۃؓ فرماتے ہیں:

رائيت رسول الله ﷺ فی ليلة اضحيان وعليه حلة حمراء فجعلت انظر اليه والى القمر فهو عندى احسن من القمر.

(شمائل ترمذی ص ۲ ، سنن دارمی ج ۱ ص ۱۰)

میں نے ایک دفعہ چاندنی رات میں حضورﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ پر سرخ رنگ کا (دھاری دار) حلہ تھا۔ میں حضورﷺ کو بھی دیکھتا اور چاند پر بھی نظر کرتا تو حضورﷺ میرے نزدیک چاند سے زیادہ حسین تھے۔

علامہ بیجوریؒ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انما كان ﷺ احسن لان ضوئه يغلب علىٰ ضوء القمر بل وعلىٰ ضوء

الشمس ففی روایة لابن المبارک و ابن الجوزی لم یکن له ظل ولم یقم مع شمس قط الا غلب ضوئه علی ضوء الشمس ولم یقم مع سراج قط الاغلب ضوئه علی ضوء السراج .

(المواھب اللدنیه علی شمائل الحمدیه ص ۳۰ مطبوعه مصر)

حضورﷺ چاند سے زیادہ حسین اس لیے تھے کہ حضورﷺ کی روشنی چاند کی روشنی بلکہ سورج کی روشنی پر بھی غالب رہتی تھی۔ کیونکہ سیدنا ابن مبارک اور ابن جوزی کی روایت میں آیا ہے کہ حضورﷺ کا سایہ نہ تھا۔ اور حضورﷺ سورج کے سامنے کبھی کھڑے نہیں ہوئے مگر حضورﷺ کی روشنی سورج کی روشنی پر غالب ہو جاتی تھی۔ اسی طرح چراغ کے سامنے بھی حضورﷺ کبھی کھڑے نہیں ہوئے مگر چراغ کی روشنی پر بھی رسول اللہﷺ کی روشنی غالب رہتی تھی۔ (ظل النبی از علامہ احمد سعید کاظمیؒ)

۱۲۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

قال کان رسول اللہ ﷺ افلج الثّنیتین اذا تکلم رئ کالنور یخرج من بین ثنایاہ . (شمائل ترمذی ص ۳، دارمی ج ۱ ص ۱۰)

فرماتے ہیں کہ حضورﷺ جب گفتگو فرماتے تو آپ کے مبارک دانتوں کے درمیان جھریوں سے نور یا نور کی مانند کوئی چمکدار چیز نکلتی ہوئی دیکھی جاتی تھی۔

علامہ بیجوریؒ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

حدیث کے یہ معنی ہیں کہ نور کی طرح صاف شفاف چیز چمکتی ہوئی دیکھی جاتی تھی جو حضورﷺ کے نورانی دانتوں کے درمیان سے نکلتی تھی۔ یہاں یہ احتمال بھی ہے کہ ''کالنور'' میں کاف زائد ہو اور تفخیم کے لیے بڑھا دیا گیا ہو اس تقدیر پر نور حسی تھا جو حضور کے دندان مبارک کے درمیان سے بطور ظہور معجزہ چمکتا تھا۔ (ظل النبی)

۱۳۔ مطالعہ المسرات میں علامہ ابن سبع سے منقول ہے:

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یضی البیت المظلم من نورہ

تاریک گھر حضور کے نور سے روشن ہوتا تھا۔ (مطالعہ المسرات ص)

۱۴۔ محدث ابن جوزی حضور کے اول الخلق اور نور ہونے کے متعلق ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اول ما خلق اللہ نوری و من نوری خلق جمیع الکائنات

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا فرمایا اور میرے نور سے تمام کائنات کی تخلیق فرمائی۔ (المیلاد النبوی از محدث ابن جوزی ص ۲۲)

۱۵۔ علامہ حلبی انسان العیون المعروف سیرت حلبیہ میں ایک روایت نقل کرتے ہیں:

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سال جبریل فقال یا جبریل کم عمرت من السنین فقال یا رسول اللہ لست اعلم غیر ان فی الحجاب الرابع نجما یطلع فی کل سبعین الف سنۃ مرۃ رایتہ اثنین و سبعین الف مرۃ فقال یا جبریل و عزۃ ربی جل جلالہ انا ذلک الکوکب۔

(سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۴۹، روح البیان)

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جبریل امیں سے دریافت فرمایا کہ اے جبریل یہ بتاؤ کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ حضرت جبریل نے عرض کیا عمر کا تو مجھے صحیح اندازہ نہیں لیکن اتنا یاد ہے (ساری کائنات کے پیدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حجابات عظمت میں سے) چوتھے حجاب عظمت میں ایک نورانی ستارہ چمکا کرتا تھا اور وہ ستر ہزار سال کے بعد ایک مرتبہ چمکتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں وہ نورانی ستارہ بہتّر ہزار مرتبہ دیکھا ہے۔ حضور فرمانے لگے مجھے رب ذوالجلال کی عظمت وشان کی قسم ہے وہ چمکنے والا ستارہ میں ہی تھا۔

۱۶۔ امام دارمیؒ نے حضرت ربیعؓ بنت معوذ بن عفراء سے روایت کی ہے:

قالت یا بنی لو رائیته رایت الشمس طالعة . (سنن دارمی ص ۱۰)

اے میرے بیٹے تم اگر رسول ﷺ کو دیکھتے تو سورج طلوع ہوتا دیکھتے۔

۱۷۔ ترمذی، احمد، بیہقی، ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے۔

کان الشمس تجری فی وجهه (شمائل الترمذی)

گویا سورج آپ کے چہرے میں چمکتا تھا۔

۱۸۔ امام ابوسعید نیشاپوری نے حضرت کعب الاحبار سے روایت کی ہے کہ جب نور محمدی حضرت عبدالمطلب کو ملا تو ان کے جسم سے مشک کی خوشبو آتی تھی۔ اور نور محمدی ان کی پیشانی سے چمکتا تھا۔ حضرت عبدالمطلب اس وقت ایسے مقبول الدعا تھے کہ مکہ والے ان کو سامنے رکھ کر بارش کی دعا کرتے تو فوراً بارش آتی تھی۔ اس نور کی وجہ سے ابرہہ کے ہاتھیوں نے عبدالمطلب کو سجدہ کیا۔ (مواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۵)

۱۹۔ ابونعیم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ ولادت کی شب پیدائش کے وقت حضرت آمنہؓ نے ایسا نور محمدی دیکھا کہ مشرق ومغرب ان پر ظاہر ہو گئے۔ پھر حضور ﷺ کی پیدائش ہوئی اور پیدا ہوتے ہی سجدہ کیا۔ (مواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۱)

۲۰. قال ابن عمر ما رائیت احدا انجد ولا اجود ولا اشجع ولا اضؤو اوضاء من رسول الله صلی الله علیه وسلم

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہ کسی کو سخی دیکھا نہ زیادہ بہادر نہ زیادہ روشن چہرے والا۔ (سنن دارمی ج ۱ ص ۱۰)

۲۱۔ امام بخاریؒ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں:

وکان یقول فی دعائه اللهم اجعل فی قلبی نورا و فی بصری نورا و فی سمعی نورا و عن یمنی نورا و عن یساری نورا و فوقی نورا و تحتی نورا و امامی نورا و خلفی نورا واجعل لی نورا. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۳۴)

رسول اللہ ﷺ نماز تہجد کی دعا میں فرماتے تھے اے اللہ میرے دل میں نور کر دے اور میری بصر میں نور کر دے اور میری سماعت میں نور کر دے اور میرے دائیں نور کر دے اور میرے بائیں نور کر دے اور میرے اوپر نور کر دے اور میرے نیچے نور کر دے اور میرے آگے نور کر دے اور میرے پیچھے نور کر دے اور میرے لئے نور کر دے۔

اس روایت کی شرح میں ملا علی قاری نے لکھا کہ اس دعا میں نور کے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں یعنی نور حسی بھی اور نور ہدایت بھی۔ (مرقاۃ ج۳ ص۱۲۵)

۲۲۔ علامہ ابن جوزی نقل کرتے ہیں:

عن ابن عباسؓ لم یکن لرسول الله ﷺ ظل ولم یقم مع شمس قط الاغلب ضوئه ضوء الشمس ولم یقم مع سراج قط الاغلب ضوئه علیٰ ضوء السراج. (الوفاء باحوال المصطفیٰ ج ۱ ص ۴۰۷)

حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ تھا آپ جب بھی سورج کے سامنے کھڑے ہوتے تو آپ کا نور سورج کی روشنی پر غالب رہتا اور آپ جب چراغ کے سامنے کھڑے ہوتے تو آپکا نور چراغ کے نور پر غالب رہتا۔

۲۳۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت ہے:

قال کان وجه رسول الله ﷺ کدارة القمر

(الوفاء ج ۱ ص ۴۰۷ مطبوعه مکة نوریه فیصل آباد)

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور چاند کی ٹکیا کی طرح تھا۔

۲۴۔ امام عبد الرزاق نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت کی ہے:

قال قلت یا رسول الله ﷺ بابی انت وامی اخبرنی عن اول شئی خلقه

اللہ تعالیٰ قبل الاشیاء قال یا جابر ان اللہ قد خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نورہ فجعل ذٰلک النور یدور بالقدرہ حیث شاء اللہ (الخ)

(مواھب اللدینہ ج ۱ ص ۹ السیرت الحلبیہ ج ۱ ص ۵۰، نشر الطیب ص ۵)

حضرت جابر فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے بتائیے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کیا چیز پیدا فرمائی آپ نے فرمایا اے جابر بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا فرمایا۔ پھر وہ نور مشیت ایزدی کے مطابق جہاں چاہتا سیر کرتا رہا۔

خلاصہ بحث

مذکورہ تمام احادیث سے حضور ﷺ کا اول خلق ہونا اور آپ کا نور معنوی کے علاوہ نور حسی ہونا بھی ثابت ہوا صحابہ کرام کو آپ کے جسم مقدس کی نورانیت محسوس ہوتی تھی اس لیے وہ حضور ﷺ کے چہرہ انور کو سورج، چاند وغیرہ بتا کر سمجھاتے اور اسی طرح آپ کے جسم اقدس کا سایہ نہ ہونا اور آپ کی روشنی کا سورج و چراغ کی روشنی پر غالب رہنا، تاریک جگہوں کا آپ کے نور سے روشن ہونا، دندان مبارک سے روشنی کا نکلنا اور آپ کے چہرہ انور کی روشنی سے دیواروں کا چمکنا وغیرہ اس بات کو واضح کر رہی ہیں کہ آپ ﷺ کی نورانیت حسی بھی تھی۔

نورانیت مصطفیٰ کے متعلق علماء کے اقوال

حضور نبی اکرم ﷺ کی نورانیت کا عقیدہ اہل اسلام میں ہمیشہ سے مسلم رہا ہے جس میں کبھی بھی کوئی اختلاف نہیں رہا اس سلسلہ میں ہم ذیل میں علمائے اسلام کے

چند اقوال اختصاراً پیش کرتے ہیں جو اس بات پر دلیل ہیں کہ نورانیت مصطفیٰ کا عقیدہ اہل اسلام کے ہاں ہمیشہ سے رہا ہے اس میں کسی غیر اسلامی فکر کی آمیزش ہرگز نہیں پائی جاتی اکابر علماء اسلام نے حضور ﷺ کی شان نورانیت کو اپنی اپنی مایہ ناز تصنیفات میں نمایاں طور پر بیان کیا ہے اہل اسلام میں سے کسی نے بھی رسول اللہ ﷺ کی اس شان وفضیلت کے بیان کو شرک یا غیر اسلامی فکر قرار نہیں دیا اور نہ ہی کسی نے اس کو اسلام میں غیر اسلامی کاشت شدہ پودا قرار دیا ہے بلکہ سیرت کے قدیم مستند ذخیروں میں نورانیت مصطفیٰ کے باب کو اولین اور نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ کتب سیرت کے مطالعہ کرنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں۔

امام ابوالحسن اشعری کا قول

مطالع المسرات شرح دلائل الخیرات میں آپ کا قول ہے کہ:

انه تعالیٰ نور لیس کالانوار وروح النبویة القدسیة لمعة من نوره والملائکته اشرار تلک الانوار وقال ﷺ اول ما خلق الله نوری و من نوری خلق کل شئی وغیره مما فی معناه. (المطالع المسرات ۱۲۷ مصری)

اللہ تعالیٰ نور ہے مگر دوسرے نوروں کی طرح نہیں اور نبی ﷺ کی روح اقدس اس نور کی تابش ہے اور فرشتے ان نوروں کے پھول ہیں حضور ﷺ فرماتے ہیں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا اور میرے نور سے ہر چیز پیدا فرمائی اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث ہیں جن کا مضمون ایک ہی ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ کا قول: حضرت ملا علی قاری ''موضوعات کبیر'' میں ص ۸۶ پر فرماتے ہیں:

اما نوره علیه السلام فهو فی غایته من الظهور شرقاً و غرباً و اول ما خلق

الله نوری و سماه فی کتابه نوراً

لیکن نبی اکرم ﷺ کا نور مشرق و مغرب میں خوب چمک رہا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں نور فرمایا۔

امام بوصیریؒ کا قول

امام بوصیری قصیدہ بردہ میں فرماتے ہیں:

فانک شمس فضل هم کواکبها　　یظهرن انوارها للناس فی الظلم

یا رسول اللہ ﷺ آپ بزرگی کے سورج ہیں اور باقی سارے نبی اس سورج کے ستارے ہیں جو حضور ہی کا نور تاریکیوں میں لوگوں میں پھیلاتے ہیں۔

امام احمد قسطلانی کا قول

امام احمد بن محمد قسطلانی مواہب اللدنیہ میں فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کا نور پیدا کیا اس نور کو حکم دیا کہ تمام انبیاء کرام کے نوروں کو دیکھے چنانچہ رب نے حضور ﷺ کے نور سے تمام کے نور ڈھانپ لیے انہیں رب نے گویائی بخشی وہ تمام کہنے لگے:

یا ربنا من غشینا نوره فقال الله تعالیٰ هٰذا نور محمد بن عبدالله.

اے ہمارے رب کس کے نور نے ہم کو ڈھانپ لیا تو رب نے فرمایا: یہ محمد بن عبداللہ کا نور ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

علامہ قاضی عیاض مالکیؒ کا قول

انه کان لاظل لشخصه فی شمس ولا قمر لانه کان نوراً.　　(شفاء)

آپ کے جسم اقدس کا سایہ چاند اور سورج کی روشنی میں نہ پڑتا تھا کیونکہ آپ نور تھے۔

امام جلال الدین سیوطی کا قول

امام جلال الدین سیوطیؒ خصائص کبریٰ میں فرماتے ہیں:

قال ابن سمیع من فضائله ﷺ ان ظله کان لا یقع علی الارض وانه کان نورا

ابن سمیعؒ نے فرمایا:

حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ آپ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا اور آپ نور تھے۔

علامہ شہاب الدین خفاجی کا قول

لانه ﷺ کان نورا والا نوار شفافة لطیفة لا نخجب غیرها (نسیم الریاض)

فرماتے ہیں کہ سورج اور چاند میں حضور کا سایہ اس لیے نہ تھا کہ آپ ﷺ نور تھے اور انوار لطیف اور شفاف ہوتے ہیں کسی کے لیے آڑ نہیں بنتے کچھ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

فان فهمت فهو نور علی نور فان النور هو الظاهر بنفسه المظهر لغیره وتفصیله فی مشکواة الانور

اگر تم سمجھو تو حضور نور علی نور ہیں کیونکہ نور وہ ہوتا ہے جو خود ظاہر ہو اور دوسرے کو ظاہر کر دے اس کی تفصیل مشکواۃ الانوار میں ہے۔

امام محمد المہدی الفاسی کا قولؒ

امام فاسی فرماتے ہیں:

ان نورہ ﷺ اصل الکائنات (مطالع المسرات ص ۲۵۰)

حضور ﷺ کا نور کائنات کی اصل ہے۔

علامہ شاہ عبدالغنی نابلسی کا قول

آپ حدیقہ ندیہ میں فرماتے ہیں:

قد خلق کل شئی من نورہ ﷺ کما وردبہ الحدیث الصحیح

ترجمہ: ہر چیز نبی کریم کے نور سے بنائی گئی جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا قول

آپ مدارج النبوۃ میں فرماتے ہیں:

وچوں آنحضرت عین نور باشد و نور را سایہ نمی باشد

(مدارج النبوۃ ۱ ص ۱۱۸)

اور چونکہ حضور ﷺ عین نور تھے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا۔

شاہ عبدالرحیمؒ کا قول

حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب اپنی کتاب "انفاس رحیمیہ" میں فرماتے ہیں:

از عرش تا بفرش و ملائکہ علوی و جنس سفلی ہمہ ناشی ازاں حقیقت محمدیہ است و قول رسول مقبول اول ما خلق اللہ نوری و خلق اللہ ما

خلق الله من نوری قوله لو لاک لما خلقت الافلاک وقوله لولاک لما اظهرت الربوبیة.

فرش سے عرش تک اور اعلیٰ فرشتے اور اسفل کی جنس سب کی سب حقیقت محمدیہ سے پیدا ہیں حضور ﷺ کا فرمان ہے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا اور میرے نور سے ساری مخلوق پیدا کی اور آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ فرماتا ہے اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو نہ پیدا کرتا اور اگر آپ نہ ہوتے تو میں اپنی ربوبیت کو ظاہر نہ کرتا۔

حضرت مجدد الف ثانی کا قول

او صلی الله علیه وسلم را سایه نبود در عالم شهادت سایه هر شخص از شخص لطیف تراست چوں لطیف ترازوے صلی الله علیه وسلم در عالم نباشد اورا سایه چه صورت دارد. (مکتوبات ج ۳ مکتوب نمبر ۱۰۰)

یعنی حضور ﷺ کا سایہ نہ تھا عالم شہادت میں ہر جسم کا سایہ جسم سے زیادہ لطیف ہوتا ہے جب حضور ﷺ سے زیادہ لطیف کوئی چیز دنیا میں نہیں تو آپ کے سایہ کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ نیز آپ فرماتے ہیں:

باید دانست که خلق محمدی در رنگ خلق سائر افراد انسانی نیست بلکه خلق هیچ فردے از عالم مناسبت ندارد که او صلی الله علیه وسلم باوجود و نشا عنصری از نور حق جل و علا مخلوق گشت کما قال علیه وآله الصلوٰة والسلام خلقت من نور الله دیگراں براین دولت میسر نه شده است. (مکتوبات ج ۳ ص ۱۹۱ مکتوب نمبر ۱۰۰)

جاننا چاہیے کہ حضور ﷺ کی پیدائش دوسرے افراد انسانی کی طرح نہیں بلکہ کسی فرد کے ساتھ آپ کی پیدائش اور آپ کا وجود مسعود مناسبت و مشابہت نہیں رکھتا

کیونکہ آپ وجود عنصری رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا ہوئے جبکہ آپ کا ارشاد ہے میں اللہ تعالیٰ کے نور سے پیدا ہوا ہوں اور کسی دوسرے کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا قول

سایہ ایشان بر زمیں نمی افتاد (تفسیر عزیزی پارہ ۳۰)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سایہ زمیں پر نہ پڑتا تھا۔

شاہ اسماعیل دہلوی کا قول

اسماعیل دہلوی صاحب اپنی کتاب ''منصب امامت'' کے ص ۱۶ پر کہتے ہیں:

اے کسے کہ بے بصر است البتہ از نور افشاں او بے خبر است۔

ہاں جو اندھا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور افشاں سے بے خبر ہے۔

اشرف علی تھانوی صاحب کا قول

اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنی کتاب نشر الطیب میں نور محمدی سے متعلق ایک پوری فصل قائم کی ہے اور اس میں نورانیت سے متعلق احادیث نقل کیں اور حدیث جابر نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

ف۔ اس حدیث سے نور محمدی کا اول خلق ہونا باولیت حقیقت ثابت ہوا ہے کیونکہ جن اشیاء کی نسبت روایات میں اولیت کا حکم آیا ہے ان اشیاء کا نور محمدی سے متاخر ہونا اس حدیث میں منصوص ہے۔ (نشر الطیب ص ۵)

حسین احمد مدنی صاحب کا قول

حسین احمد مدنی صاحب اپنی کتاب الشہاب الثاقب میں اپنا اور اپنے تمام علمائے دیو بند کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

غرضیکہ حقیقت محمدیہ علیہ الصلواۃ والسلام والتحیۃ واسطہ جملہ کمالات عالم، عالمیان ہے یہ ہی معنی

لولاک لما خلقت الافلاک اور اول ما خلق اللہ نوری اور انا نبی الانبیاء کے ہیں۔ (الشہاب الثاقب ص ۵۰)

رشید احمد گنگوہی صاحب کا قول

رشید احمد گنگوہی صاحب اپنی کتاب امداد السلوک کے ص ۸۶ پر فرماتے ہیں:

وحضرت صلوۃ اللہ علیہ فرمود کہ حق تعالیٰ مرا از نور خود پیدا فرمود و مومنین از نور من پیدا فرمود.

یعنی حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے نور سے پیدا فرمایا ہے اور مسلمانوں کو میرے نور پیدا فرمایا ہے۔ اور اسی صفحہ پر ہی فرماتے ہیں:

او حق تعالیٰ آنجناب را نور فرمود وبتواتر ثابت شد کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سایہ نداشتند و ظاہر است کہ بجز نور ہمہ اجسام ظل می دارند.

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو نور فرمایا ہے اور یہ تواتر سے ثابت ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ سایہ نہ رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ نور کے سوا تمام اجسام سایہ رکھتے ہیں۔

اور یہی رشید احمد گنگوہی صاحب امداد السلوک کے ص ۸۵ پر فرماتے ہیں:

ازیں جا است کہ حق تعالیٰ در شان حبیب خود ﷺ فرمود البتہ آمدہ نزد شما از طرف حق تعالی نور و کتاب مبین و مراد از نور ذات پاک حبیب خدا ﷺ است و نیز او تعالیٰ فرماید کہ اے نبی ﷺ ترا شاھد و مبشر و نذیر و داعی الیٰ اللہ و سراج منیر فرستادیم و منیر روشن کنندہ و نور دھندہ را گویند۔

ترجمہ: اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی شان میں فرمایا کہ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نور اور کتاب مبین آئے نور سے مراد حبیب خدا ﷺ کی ذات پاک ہے نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو گواہ اور بشیر و نذیر اور اللہ کی طرف بلانے والا اور چمکانے والا سورج بنا کر بھیجا منیر روشن کرنے اور نور بخشنے والے کو کہتے ہیں۔

شبہات کا ازالہ

بعض کج فہم لوگوں کی جانب سے نورانیت مصطفیٰ کے مسئلہ پر وارد کیے جانے والے شبہات ذکر کر کے ان کے مختصر جوابات دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ حضور ﷺ بشر تھے قرآن نے آپ کو بشر کہا آپ نے خود اپنے آپ کو بشر کہا صحابہ کرام اور ازواج مطہرات نے آپ کو بشر سمجھا۔

جواب: بشریت و نورانیت حضور ﷺ کی دو شانیں ہیں یہ دونوں شانیں باہم ضدیں نہیں جن کا جمع ہونا ناممکن ہو دیکھیئے قرآن حکیم سے ثابت ہے کہ حضرت مریم کے پاس جبریل انسانی شکل میں آئے (سورہ مریم آیت ۱۶) اور حضرت ابراہیم، حضرت داؤد، حضرت لوط، وغیرہ علیہم السلام کی خدمت میں فرشتے بشری شکل اور انسانی

صورت میں حاضر ہوتے تھے مگر اس کے باوجود وہ نور بھی تھے غرضیکہ نورانیت و بشریت ضدیں نہیں کہ جن کا جمع ہونا ناممکن ہو۔ (ص۲۱،۲۲،عنکبوت۳۲)

احادیث پاک سے ثابت ہے کہ حضرت جبرائیل امین کو صحابہ کرام نے بشری شکل میں دیکھا سیاہ زلفیں سفید لباس آنکھ کان وغیرہ سب موجود تھے اس کے باوجود وہ نور بھی تھے۔

۲۔ حضور ﷺ اگر نور ہوں تو پھر آپ کا اولاد آدم سے خارج ہونا لازم آئے گا کیونکہ نور کسی کی اولاد نہیں ہوتا۔

جواب: حضور ﷺ کامل نور بھی اور کامل بشر بھی ہیں۔ نورانیت اور بشریت آپ کی دو شانیں ہیں آپ اپنی شان بشریت میں حضرت آدم کی اولاد ہیں اور تمام رشتوں کا تعلق بشریت سے ہے اور آپ اپنی شان نورانیت میں اول الخلق ہیں اور نور ہیں اگر آپ کی بشریت کا انکار کیا جائے تو آپ کا اولاد آدم سے خارج ہونا لازم آئے گا اور آپ کی بشریت کا کوئی منکر نہیں۔

۳ یہ مسلمہ بات ہے کہ اولاد اور والدین کی جنس متحد ہوا کرتی ہے اگر آپ ﷺ نور ہیں تو آپ کی تمام اولاد بھی نور ہونی چاہیے۔

جواب: حضور ﷺ کے یہ تمام رشتے بشریت کے ہیں نورانیت میں حضور ﷺ نہ کسی کی اولاد ہیں نہ کسی کے والد نہ کسی کے قرابت دار اور نہ کسی کے رشتہ دار ہیں غرضیکہ ولادت کا تعلق بشریت کی شان سے ہے نہ کہ نورانیت۔

۴۔ حضور ﷺ کی اولاد تھی آپ کی ازواج مطہرات تھیں آپ کھانا کھاتے تھے اگر آپ نور ہوتے تو ایسا نہ ہوتا۔

جواب: حضور ﷺ کی بشریت کا اگر انکار کیا جائے تو اس وقت ان اعتراضات کا

ورود ہوسکتا ہے جبکہ آپ کی بشریت کا کوئی منکر نہیں ۔ یہ تمام عوارض انسانی بشریت سے تعلق رکھتے ہیں حضور ﷺ نے معراج میں ہزاروں سال کا سفر طے کیا وہاں کھانے پینے کی حاجت نہ رہی کیونکہ وہاں آپ کی نورانیت کی جلوہ گری تھی ہاروت و ماروت نورانی فرشتے ہیں مگر جب انہیں لباس بشری کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا تو وہ کھاتے پیتے بھی تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرصہ دراز سے آسمانوں میں کھانے پینے کے بغیر زندہ ہیں۔ اور اولاد سے پاک ہیں کیونکہ وہاں آپ کی نورانیت کی جلوہ گری ہے اور جب دنیا میں تشریف لائیں گے تو کھانا پینا اور نکاح وغیرہ سب کچھ کریں گے تب بشریت کی جلوہ گری ہوگی حضرت ملک الموت نوری مخلوق ہیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بشری صورت میں آئے تو حضرت موسیٰ کے تھپڑ سے ان کی آنکھ جاتی رہی یہ آنکھ کا ضائع ہونا بشریت کے احکام میں سے تھا حضرت موسیٰ کا عصاء جب سانپ بنتا تو کھاتا پیتا تھا اس کا یہ عمل اس کی اس شکل کے عوارض میں سے تھا۔

(سورہ اعراف ۱۱۷، سورہ طہ ۶۹)

۵۔ بشر نور سے افضل ہے حضرت آدم علیہ السلام بشر تھے اور فرشتے نوری تھے مگر فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا۔ نور ساجد اور بشریت مسجود بنی لہٰذا حضور ﷺ کو نور کہنا آپ کی شان گھٹانا ہے۔

جواب :۔ حضرت آدم کو جو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا وہ سجدہ حضرت آدم کی نورانی روح کو تھا نہ کہ جسم شریف کو چونکہ جسم اس روح کی جلوہ گاہ بن چکا تھا اس لیے سجدہ اسے بھی ہوا ورنہ حضرت آدم کا جسم خاکی تو روح پھونکنے سے بہت پہلے پیدا ہو چکا ہے۔ اگر صرف جسم خاکی کو سجدہ کرانا مقصود ہوتا تو پھر روح پھونکنے تک توقف کی کیا ضرورت تھی قرآن مجید میں ہے:

فاذا سويته ونفخت فيه من روحي فقعوله ساجدين. (سوره الحجرات ۲۹)

پھر جب میں ان کو درست کر دوں اور ان میں اپنی روح پھونک دوں تب تم ان کے لیے سجدہ کر جانا۔

معلوم ہوا کہ مسجود ملائکہ وہ نورانی روح تھی جو حضرت آدم کے جسد خاکی میں پھونک دی گئی تھی اور یہ قاعدہ بھی غلط ہے کہ بشر نور سے مطلقاً افضل ہے کیونکہ اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے تو پھر کافروں کا بھی فرشتوں سے افضل ہونا لازم آئے گا جو قطعا باطل ہے۔

۶۔ اگر حضور ﷺ نور ہیں تو پھر بھوک کی حالت میں پیٹ پر پتھر کیوں باندھتے تھے؟ اور جنگ احد میں آپ کا دانت مبارک کیوں شہید ہوا؟

جواب: اس قسم کے صدہا اعتراضات تب وارد ہو سکتے ہیں جب آپ کی بشریت کا انکار کیا جائے جبکہ بشریت کا منکر کوئی بھی نہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام صفات کا جامع بنایا ہے آپ نور بھی ہیں اور بشر بھی ہیں کبھی بشریت کی صفات آپ پر ظاہر ہوتی ہیں اور کبھی نورانیت کی صفات جب آپ پر بشریت کی صفات ظاہر ہوتیں تو بھوک کے آثار بھی نمودار ہوتے اور شکم مبارک پر پتھر بھی باندھتے مگر جب آپ پر نورانیت کی صفات کی جلوہ گری ہوتی تو پھر صوم وصال کی حالت میں طویل عرصہ تک بھی کھانے پینے کی ضرورت محسوس نہ فرمائی شب معراج قلیل وقت میں اتنی طویل مسافت طے فرمائی آسمان ولا مکان وغیرہ کی سیر فرمائی جہاں نہ ہوا نہ کھانا نہ پینا مگر آپ کی حیات اقدس پر کوئی اثر نہ ہوا معلوم ہوا کہ یہاں نورانیت کی جلوہ گری تھی۔

۷۔ اگر حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے نور ہیں تو پھر آپ کا اللہ کی جز ہونا لازم آئے گا اور یہ قطعا باطل اور شرک ہے۔

جواب: حضور ﷺ کے اللہ کے نور ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نور کا جز ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ کا نور آپ کے نور کا مادہ ہے یا آپ ﷺ اللہ کی طرح ازلی ابدی ذاتی نور ہیں اور نہ ہی اس کا یہ معنیٰ ہے کہ آپ میں اللہ تعالیٰ سرایت کر گیا ہے تاکہ شرک وکفر لازم آئے بلکہ اللہ کا نور ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ حضور ﷺ بلا واسطہ رب سے فیض لینے والے ہیں اور تمام مخلوق رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے فیض الٰہی حاصل کرنے والی ہے اور یہ نسبت ایسی ہے جیسے قرآن کریم نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے روح منہ یعنی اللہ کی روح جس کا مطلب یہ ہے کہ والدین کے واسطے کے بغیر رب تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے اور اس نسبت سے جز ہونا لازم نہیں آتا۔

حقیقت محمدیہ

حقیقت محمدی نہ بشریت ہے اور نہ نورانیت ہے حقیقت مصطفیٰ ﷺ کی صحیح معرفت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں حضور ﷺ نے خود اپنی حقیقت پر بات کرتے ہوئے صدیق اکبر کو فرمایا:

یا ابا بکر والذی بعثنی لم یعلمنی حقیقة غیر ربی. (مطالع المسرات ص ۱۲۹)

• اے ابو بکر صدیق میری حقیقت کا شناسا میرے رب کے سوا کوئی نہیں معلوم ہوا کہ بشریت ونورانیت آپ کی حقیقت نہیں بلکہ یہ دونوں آپ کی دو شانیں ہیں آپ کی حقیقت آپ کے رب کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

سیدنا علیؓ کی کعبہ معظّمہ میں ولادت کے واقعہ کے ثبوت پر وارد شہادت کا جائزہ:

سیدنا امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم کی کعبہ معظّمہ میں ولادت کے واقعہ کا اسلام کے بنیادی عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔ جس کے انکار یا اقرار سے مومن کے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس تاریخی واقعہ کے اثبات یا نفی، تصدیق یا تردید میں اہل علم وفکر حضرات کا اختلاف اور اس کی بنیاد پر اکابر علماء کرام، آئمہ عظام و مشائخ ملت کی سوئے ادبی تک ارتکاب کوئی دینی خدمت نہیں۔ آج ہم شعوری یا لاشعوری طور پر فروعی مسائل کو اصل دین سمجھنے لگے ہیں۔ اور ہماری تمام تر صلاحیتیں محض چند جزئیات اور فروعی اختلاف پر صرف ہو رہی ہیں اصل مقصد نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے تنزل و ادبار کی اصل علت ہی ان فروعی اختلافات میں الجھ کر اپنی تمام قوتوں کو ضائع کرنا ہے۔ فروعی مسائل اور اختلاف نظر اگر حد اعتدال کے اندر رہیں تو فضل وکمال کا باعث ہوتے ہیں۔ اور اگر ان میں غلو اور افراط وتفریط آجائے تو یہی ملت کے ضعف واضمحلال اور افتراق و انتشار اور پستی و زوال کا سبب بن جاتے ہیں۔ اسلام دشمن قوتیں ہمیشہ سے مسلمانوں کو فروعی اختلافات میں الجھا کر ملت کی وحدت کو شقاق وافتراق کا شکار کرنے کے درپے رہتی ہیں۔ رافضیت و خارجیت کی تحریکیں ہمیشہ ایسے افراد تیار کرتی رہتی ہیں جو ہماری صفوں میں ہمارے بن کر داخل ہوتے ہیں اور مختلف عنوانات سے خوبصورت اور سلیقہ کے ساتھ کتب تحریر کر کے خارجیت و رافضیت کے تلخ زہر کو شیریں بنا کر ناواقف لوگوں کے حلق سے اتارنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور ان تحریکوں کی سازشیں

اور ریشہ دوانیاں مختلف زمانوں میں مختلف ملکوں میں مختلف روپ دھارتی رہتی ہیں۔ یوں دوست بن کر دشمنی کی تحریکیں ہمیشہ ملت اسلامیہ کی جمعیت کو پارہ پارہ کرنے اور وحدت کو انتشار و افتراق کی راہ پر ڈالنے کی ناکام کوششیں کرتی رہتی ہیں۔ ملت اسلامیہ کے ارباب فکر ونظر اور اہل علم و دانش پر لازم ہے کہ وہ سب سے زیادہ وحدت ملت کا خیال فرمائیں۔ اور اختلاف رائے کو حد اعتدال سے تجاوز نہ ہونے دیں۔

سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے بے شمار فضائل و مناقب ہیں اگر آپ کی ولادت مبارکہ کا کعبہ معظّمہ میں ہونا ثابت نہ بھی ہوتو آپ کے شرف اور آپ کی فضیلت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم کسی عظیم دینی شخصیت اور مقدس ذات کے احوال کے بارے میں بحث و تحقیق کرتے ہوئے اس عظیم دینی شخصیت سے تعلق رکھنے والے افراد کی بھی سوئے ادبی کا شائبہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ اس واقعہ کے ثبوت پر اعتراض کرنے والے صاحب علم کو اولاً تو اس واقعہ کے بارے میں خامہ فرسائی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کے ثبوت یا عدم ثبوت کے اقرار یا انکار سے اسلام کے کسی بنیادی عقیدے پر کوئی زد نہیں پڑتی تھی۔ اس لیے کہ اس واقعہ کی تحقیق و تدقیق کے نام پر اختلافات کا ایک نیا سلسلہ شروع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اگر معترض صاحب کو کسی سبب اس موضوع پر تحقیق کا شوق تھا تو ادب و احترام کے ساتھ اپنا موقف مدلل بیان فرما دیتے۔ اور اس پر اس طرح کے تبصرہ سے گریز فرماتے جس کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شان میں سوئے ادبی کا کوئی پہلو یا شائبہ پیدا ہوتا اور محبان سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی دل آزاری اور قلب سوزی کا باعث بنتا۔ مثلاً معترض صاحب کے یہ الفاظ "اکیلی لوگوں کے سامنے کیوں دردزہ سے کراہتی رہیں، فاطمہ

بنت اسد ایسی نازک حالت میں گھر سے نکلی ہی کیوں، بااخلاق عورتیں تو احتیاطاً پانچ چھ دن پہلے ہی گھر سے نکلنا بند کر دیتی ہیں''۔

معترض صاحب نے اپنے اس تبصرے میں واقعی بے احتیاطی برتی ہے۔ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا جیسی عظیم المرتبت صحابیہؓ اور حضور خاتم الانبیاءؐ کی چچی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی عظیم شخصیت کی والدہ ماجدہ کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کرنا سراسر بے انصافی اور سوئے ادبی ہے۔ حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہما کا شماران صحابہ کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے آغاز اسلام میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ساتھ دیا ہے جب حضرت ابو طالب کا انتقال ہوا تو ان کے بجائے حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دست و بازوں بنیں۔ حضرت فاطمہ بنت اسد مشرف باسلام ہونے کے بعد ہجرت مدینہ کی سعادت سے بھی مشرف ہوئیں۔ ان کا وصال بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں مدینہ منورہ میں ہوا۔ یہ وہ عظیم اور سعادتمند خاتون ہی ہیں جن کے وصال پر حضور ﷺ نے اپنا زیب تن کیا ہوا کرتا اتار کر انہیں کفن دیا اور تدفین سے پہلے ان کی قبر میں اتر کر لیٹ گئے۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ ابو طالب کے بعد ان سے بڑھ کر میرے ساتھ کسی نے سلوک نہیں کیا تھا۔ اس بناء پر میں نے ان کو اپنا کرتا پہنایا کہ جنت میں ان کو حلہ ملے اور قبر میں لیٹ گیا کہ شدائد میں کمی واقع ہو۔ (اسد الغابہ ج ۵ ص ۵۱۷)

اصابہ میں ہے۔

كانت امراة صالحة وكان النبي صلى الله عليه وسلم يزورها ويقيل في بيتها. (الاصابة ج ۸ ص ۱٦۱)

وہ نہایت صالح بی بی تھیں حضور ﷺ ان کی زیارت کے لیے تشریف لاتے

اوران کے گھر میں آرام فرماتے تھے۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

وان جبریل علیہ السلام اخبرنی عن ربی عز وجل انها من اهل الجنة واخبرنی جبریل علیه السلام ان الله تعالیٰ امر سبعین الفا من الملائكة ان يصلوا عليها. (المستدرک للحاکم ج۳ ص۱۱۷)

حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے میرے رب عزوجل کی طرف سے یہ خبر دی ہے کہ حضرت فاطمہ بنت اسد جنتی لوگوں میں سے ہے اور مجھے جبریل علیہ السلام نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار فرشتوں کو حضرت فاطمہ بنت اسد پر نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔

سبحان اللہ حضرت فاطمہ بنت اسد کتنی سعادت مند خاتون تھیں کہ جن کی قبر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم لیٹیں، اپنا کرتا مبارک اتار کر ان کی تکفین فرمائیں اور اللہ تعالیٰ سید الملائکۃ کے ذریعہ سید الانبیاء والمرسلین کو ان کے جنتی ہونے کی بشارت دے اور اپنی معصوم اور نورانی مخلوق میں سے ستر ہزار کی جماعت کو ان کی نماز جنازہ ادا کرنے پر مامور فرمائے اور رحمۃ للعلمین ﷺ بذات خود ان کی نماز جنازہ ادا فرمائیں۔ یہ کتنا بڑا اعزاز وشرف اور کتنی بڑی عظمت ہے:

ذالک فضل الله یوتیه من یشاء

رسول اللہ ﷺ فاطمہؓ بنت اسد کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔ میری والدہ کے انتقال کے بعد جن کے بطن سے میں پیدا ہوا انہوں یہی میری ماں تھیں۔

(المستدرک ج۳ ص۱۱۷)

ہر مسلمان کے لیے زندگی کے ہر لمحہ میں صرف حضور صلی اللہ علیہ سلم کی تعظیم و

تکریم اور ادب واحترام کا لحاظ رکھنا عین ایمان ہے بلکہ آپ کے صحابہ کرامؓ اور آپ کے اہل بیتؓ عظام کے ادب واحترام کا لحاظ رکھنا بھی کمال ایمان ہے اور انہیں قول و فعل اور دیگر ذرائع میں سے کسی بھی طرح اذیت پہنچانا حرام ہے۔ قرآن کریم میں جہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو اذیت پہنچانا حرام قرار دیا ہے وہاں پر وہ ذات جو آپ کے ساتھ تعلق ونسبت رکھتی ہے اسے اذیت پہنچانا بھی حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وما كان لكم ان تؤذوا رسول الله ولا ان تنكحو ازواجه من بعده ابدا ان ذالكم كان عندالله عظيما. (الاحزاب ۳۳.۵۳)

ترجمہ۔ اور خوب یاد رکھو کہ تمہارے لیے جائز وزیبا نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایزا دو اور نہ یہ کہ تم ان کے بعد کبھی ان کی ازواج مطہرات سے نکاح کرو بے شک یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔

اہل بیت کو عزت وتوقیر، تقدس وحرمت سب کچھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نسبت سے ملا ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

احبوني بحب الله واحبوا باهل بيتي بحبي.

(ترمذی ابواب المناقب ج ۲ ص ۲۲۰)

مجھ سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرو اور میری اہل بیت سے میرے سبب سے محبت کرو۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں؛

ارقبوا محمداً في اهل بيته.

(الشفاء مع نسیم الریاض ج ۳ ص ۴۱۳ مطبوعہ دار الفکر)

حضور ﷺ کے اہل بیت کے بارے میں نبی ﷺ کے حق کا خیال رکھو۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ہی فرمان ہے:

والذی نفسی بیدہ لقرابة رسول الله احب الیّ من ان اصل بقرابتی.

(الشفاء مع نسیم الریاض ج ۳ ص ۴۱۳)

اس ذات پاک کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت کے ساتھ صلہ رحمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی سے مجھے زیادہ عزیز ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم کا حق ادا کرنے کے لیے صحابہ کرامؓ اور آپ کے اہل قرابتؓ کی تعظیم وتکریم بھی انتہائی ضروری ہے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من حفظنی فی اصحابی کنت حافظا له یوم القیامة.

(الشفاء مع نسیم الریاض ج ۳ ص ۴۳۱)

جو میرے صحابہؓ کا ادب ملحوظ رکھے گا روز محشر میں اس کا محافظ ہوں گا۔

اور فرماتے ہیں۔

من حفظنی فی اصحابی ورد علی الحوض من لم یحفظنی فی اصحابی لم یرد علی الحوض. (اشفاء مع نسیم الریاض ج ۳ ص ۴۳۱)

جو میرے صحابہ کا ادب ملحوظ رکھے گا وہ حوض کوثر پر میرے پاس آئے گا اور جو میرے صحابہ کا ادب ملحوظ نہیں رکھے گا وہ قیامت کے روز حوض کوثر پر حاضر نہ ہوگا۔

حضرت سیدنا ابو بکر صدیق اور حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ دونوں حضرات کے پاس ان کے عہد خلافت میں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تشریف لائیں تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضاعی ماں ہونے کے سبب اسی طرح عزت وتکریم سے پیش آئے جس طرح حضور ﷺ ان سے پیش

آتے تھے۔

ولما وردت حليمة السعدية علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بسط لها ردائه وقضی حاجتها منها فلما توفی وفدت علی ابکر د عمر فصنعا مثل ذالک. (الشفاء مع نسیم الریاض ج ۳ ص ۴۶۰)

جب حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئیں تو آپ نے ان کے لیے اپنی چادر مبارک بچھائی اور ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عہد خلافت میں ان کے پاس تشریف لاتیں تو وہ ان کے ساتھ اسی طرح تعظیم وتکریم سے پیش آتے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیش آتے تھے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی لونڈی حضرت ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ادب واحترام کا مظاہرہ فرماتے اور ان کی زیارت کے لیے تشریف لاتے تھے۔

وکان ابو بکر و عمر یزوران ام ایمن مولاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویقولان کان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یزورھا.

(الشفاء مع نسیم الریاض ج ۳ ص ۴۲۰ تا ۴۲۱)

حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لونڈی حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے اور فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی زیارت کے لیے تشریف لاتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جن چیزوں کو نسبت وتعلق ہے ان کی بھی

عزت وتکریم لازم ہے اس لیے کہ ان کی تعظیم درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعظیم ہے۔

حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

من اعظامه واكباره صلى الله تعالىٰ عليه وسلم اعظام جميع اسبابه واكرام مشاهدته وامكنته من مكة والمدينة ومعاهده ولما لمسه صلى الله تعالىٰ عليه وسلم وعرف به . (الشفاء مع نسيم الرياض ج ٣ ص ٤٣٢ تا ٤٣٣)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر میں سے یہ بھی ہے کہ وہ تمام چیزیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھتی ہیں ان کی تعظیم کی جائے۔ آپ کی محافل مقدسہ، مقامات معظّمہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقامات منسوبہ اور وہ چیز جس کو آپ نے چھوا ہو یا آپ کے ساتھ مشہور ہوگئی ہوں ان سب کی تعظیم وتوقیر کرنا اسی طرح لازم ہے جس طرح آپ کی تعظیم وتوقیر واجب ہے۔

معترض صاحب نے کعبہ معظّمہ میں سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولادت کا انکار کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس دور میں کعبہ کا دروازہ پانچ فٹ بلند تھا۔ فاطمہ بنت اسد بغیر سیڑھی کے کعبے کے اندر کیسے پہنچیں؟ معترض صاحب نے تاریخ تعمیر کعبہ کا بغور مطالعہ کیا ہوتا تو وہ یہ نہ فرماتے کیونکہ جس زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی ہے اس زمانے میں کعبہ کی وہ عمارت موجود تھی جس کی تعمیر جرہم نے کی تھی اور ترمیم قصیٰ بن کلاب نے۔ اس تعمیر میں کعبہ معظّمہ کا دروازہ زمین کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ قریش نے بعد میں اس کو بلند کیا تھا۔

علامہ حلبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فان باب الكعبة كان على عهد العماليق وجرهم و ابراهيم عليه السلام

لاصقاً بالارض حتیٰ رفعتہٗ قریش.

(انسنان العیون المعروف بہ سیر حلبیہ شھود سیر حلبیہ ج ۱ ص ۱۷۴)

کعبہ معظّمہ کا دروازہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے جرہم کے دور تک زمین کیساتھ لگا ہوا تھا یہاں تک کہ قریش نے اسے بلند کیا۔

چنانچہ حضرت ام المومنین عائشۃ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی حدیث میں بھی صراحت ہے کہ کعبہ معظّمہ کے دروازے کو بلند کرنے والے قریش تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشۃؓ سے فرمایا کہ:

ھل تدرین لم کان قومک رفعوا بابھا؟ قلت لا قال تعززاً وألا یدخلھا الا من ارادوا فکان الرجل اذا کرھوا ان یدخلھا دعوہ یرتقی حتیٰ اذا کاد ان یدخلھا دفعوہٗ فسقط. (صحیح ابن حزیمۃ ج ۴ ص ۲۲۳ مطبوعہ بیروت)

تم جانتی ہو کہ تمہاری قوم نے کعبہ کا دروازہ کیوں بلند رکھا؟ میں نے عرض کیا میں نہیں جانتی۔ آپ نے فرمایا انہوں نے اپنی بڑائی جتانے کے لیے اتنا بلند کیا تھا تاکہ جسے چاہیں اس کو داخل ہونے دیں جب کوئی ایسا شخص داخل ہونا چاہتا جس کا داخل ہونا انہیں پسند نہ ہوتا تو اس کو سیڑھی چڑھنے دیتے جب داخل ہونے کے قریب پہنچ جاتا تو دھکا دیتے تھے اور وہ اوپر سے نیچے گر جاتا تھا۔

علامہ بلاذری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

قریش کی تعمیر کعبہ کے وقت ابو حذیفۃ بن مغیرہ نے قریش سے کہا! اے قوم کعبہ کا دروازہ بلند کرو کہ ان کے سوا جن کا آنا تمہیں پسند ہو کوئی دوسرا اندر نہ آسکے۔ اگر کبھی کوئی ایسا شخص اندر آنا چاہے جس کا اندر آنا تمہیں پسند نہ ہو تو اس صورت میں تم اسے اوپر سے پھینک سکو وہ گر جائے گا اور دوسروں کے لیے باعث عبرت ہوگا۔ چنانچہ

قریش نے کعبہ کا دروازہ کرسی دیکر بلند کیا۔

(فتوح البلدان مترجم اردو ج ۲ ص ۸۰ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

اس سے ثابت ہوا کہ قریش نے کعبہ معظّمہ کے دروازہ کو اپنی سیادت قائم کرنے کے لیے زمین سے بلند کر دیا تھا اور یہ بات بھی تاریخی طور پر مسلم ہے کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی ولادت قریش کی تعمیر کعبہ سے پہلے ہوئی ہے۔ قریش نے کعبہ کی تعمیر اس وقت کی جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک ۳۵ سال تھی۔ اور آپ کی بعثت اس کے تقریباً چار سال بعد میں ہوئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر سات یا آٹھ سال کی تھی۔

ترمذی شریف میں ہے: اسلم علی وھو غلام ابن ثمان سنین۔

(ترمزی ابواب المناقب ج ۲)

حضرت علیؓ جب مشرف باسلام ہوئے تو ان کی عمر آٹھ سال تھی۔

شرح مواہب لدینہ ہے۔

روی ابن سفیان باسناد صحیح عن عروۃ قال اسلم علی وھو ابن ثمان سنین. (شرح زرقانی لمواھب لدینیہ ج ۱ ص ۴۵۰)

ابن سفیان نے صحیح سند کیساتھ حضرت عروۃ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علیؓ جب مشرف باسلام ہوئے تو آپ کی عمر آٹھ برس تھی۔

سیرت حلبیہ میں ہے؛

اسلم علی بن ابی طالب والزبیر بن العوام وھما ابنا ثمان سنین واجماعھم علی ان علیا لم یکن بلغ الحلم. (اسنان العیون .سیرت ھلبیۃ. ج ۱ ص ۲۶۹)

حضرت علیؓ اور حضرت زبیر بن عوام آٹھ سال کی عمر میں مشرف باسلام ہوئے اور مورخین کا اجماع ہے اس وقت حضرت علیؓ حد بلوغ میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ؛

بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاثنین وصلی علی یوم الثلاثاء.

(المستدرک ج ۳ ص ۱۲۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سوموار کے دن ہوئی اور حضرت علی نے منگل کے روز نماز ادا کی۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سابقین اولین کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پہلے ہی روز اسلام کی دعوت قبول کی تھی۔

صفی الرحمٰن مبارکپوری لکھتے ہیں۔

یہ اسلامی تاریخ مین سابقین اولین کے وصف سے مشہور ہیں ان میں سر فہرست آپؐ کی بیوی ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ بن شرحبیل کلبی اور آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب جو ابھی آپ کی زیر کفالت بچے تھے۔ اور آپ کے یار غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ہیں یہ سب کے سب پہلے ہی دن مسلمان ہو گئے تھے۔

علامہ ذہبی تلخیص الموضوعات میں لکھتے ہیں:

لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اول ما اوحی الیہ اٰمن بہ خدیجۃ وابو بکر و بلال و زید مع علیٰ قبلہ بساعات او بعدہ بساعات و عبدوا اللہ مع نبیہ. (حاشیہ بر مستدرک للحاکم ج ۳ ص ۲۲۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہونے کے ساتھ ہی آپ پر ایمان لانے والوں میں حضرت خدیجہ، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت بلال اور حضرت زید اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں یہ حضرات چند گھڑیاں تقدیم و تاخیر سے پہلے روز ہی مشرف باسلام ہوئے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رب کی عبادت کی۔

واضح ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعثت نبوی کے پہلے ہی روز اسلام کی دعوت قبول کی تھی اور اس وقت آپ کی عمر آٹھ سال تھی۔ اور قریش نے آپ کی بعثت سے تقریباً چار سال پہلے کعبہ معظّمہ کی تعمیر کی تھی اور اس تعمیر کے وقت حضرت علی کی عمر تقریباً چار سال بنتی ہے۔ اس حساب سے حضرت علیؓ کی ولادت کعبہ معظّمہ کی اس عمارت کی موجودگی میں ہوئی جو عمارت جرہم نے بنائی تھی اور جس کی مرمت کا کام بعد میں قصی بن کلاب نے کرایا تھا۔ اور اس عمارت میں کعبہ معظّمہ کا دروازہ زمین کے ساتھ تھا۔ داخل ہونے والے کیلئے سیڑھی وغیرہ کی ضرورت نہ تھی۔ ہر آدمی بآسانی کعبہ معظّمہ میں داخل ہوسکتا تھا۔ جس سے معترض صاحب کا مفروضہ باطل ہو جاتا ہے کہ فاطمہ بنت اسد دردزہ کی تکلیف کے ہوتے ہوئے بغیر سیڑھی کعبہ کے اندر کیسے پہنچیں۔

اور اگر یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ اس وقت کعبہ معظّمہ کا دروازہ پانچ فٹ زمین سے بلند تھا تو بھی حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا کے اندر پہنچنے میں کونسا امر مانع تھا۔ آخر لوگ اندر جاتے رہتے تھے۔ کعبہ کے اندر کنواں تھا جس میں نذر و نیاز ڈالدیتے تھے۔ اندر جانے کے لیے سیڑھی وغیرہ کا بندوبست تھا تو لوگ اندر جاتے تھے جیسا کہ قریش کی تعمیر کے بعد دروازہ کعبہ پر سیڑھی موجود تھی اور وہ جس کے اندر جانے کو پسند نہیں کرتے تھے تو اس کو سیڑھی چڑھنے دیتے اور داخل ہونے کے قریب ہوتا تو دھکے دیکر نیچے گرادیتے تھے۔ حضرت فاطمہ بنت اسد معزز خاندان کی خاتون تھیں انہیں کعبہ معظّمہ میں داخل ہونے سے کون روک سکتا تھا؟

حضرت حکیمؓ بن حزام کی والدہ کو اگر ولادت کے وقت کعبہ معظّمہ مین داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکی تو حضرت فاطمہ بنت اسد کو کیسے پیش آئی۔

معترض صاحب لکھتے ہیں ''کون سیڑھی لایا'' معترض صاحب کا یہ مفروضہ بھی

باطل ہے کیونکہ جب کسی واقع کو بیان کیا جاتا ہے تو اس کے اہم حصہ کی طرف توجہ جاتی ہے اور بیان کرنے والا اسی کو بیان کرتا ہے اس کی تمام جزئیات اور تفصیلات نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حضرت حکیم بن حزام کی ولادت بھی تو کعبہ معظّمہ میں ہوئی ہے وہاں پر بھی تو سیڑھی کا تذکرہ نہیں۔ سیڑھی لانے والے یا سیڑھی کے تذکرہ کا نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ پورا واقعہ ہی ثابت نہیں۔ دنیا میں کتنے مشاہیر گزرے ہیں ان کی ولادت کی تمام تفصیلات اور جزئیات کا تذکرہ نہیں ملتا اور نہ ہی جزئیات کے بیان کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اگر دوسری اہم شخصیات کی ولادت کی تفصیلات کو بیان کرنا اہم نہیں سمجھی گئی ہیں تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت کی تمام جزئیات کے تذکرے کو معترض صاحب کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟ اس جدید دور میں بھی جہاں واقعات وحوادث کے لمحہ لمحہ کو محفوظ کیا جارہا ہے مگر کسی بچے کی پیدائش کی جزئیات یوں محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے تو اس قدیم زمانے میں ان جزئیات کو محفوظ رکھنے کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

معترض صاحب کا یہ لکھنا کہ ''اب ذرا غور کرو کہ اتنی بھیڑ میں اور لوگوں کی موجودگی میں سب کے سامنے ولادت ہونا کیا کوئی غیرت مند انسان برداشت کر سکتا ہے'' معترض صاحب کا یہ مفروضہ بھی باطل ہے۔ انہیں کیسے پتہ چلا کہ لوگوں کی موجودگی میں ولادت ہوئی ہے۔ ولادت تو کعبہ معظّمہ کے جوف میں ہوئی ہے اور جوف کعبہ میں لوگوں کی بھیڑ کیسے ممکن تھی؟ اور اگر وہاں پر لوگ موجود بھی تھے تو حضرت فاطمہ بنت اسد کی حالت دیکھ ادھر ادھر ہو گئے ہونگے۔ کیونکہ اس حیاء باختہ دور میں بھی اگر کوئی خاتون ایسی کیفیت سے دوچار ہو جاتی ہے تو لوگ اس کے قریب سے خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ نیز ولادت کا عمل ایک اضطراری عمل ہوتا ہے اس مین انسان کے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور اضطراری عمل اگر ایسی حالت میں وجود پذیر ہو جائے

تو کسی غیرت مند انسان کی غیرت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت علی اور آپ کی والدہ ماجدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں اللہ کے محبوب بندے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی ہمیشہ حفاظت فرماتا ہے۔

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ مذکور ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام بوقت ولادت کھجور کے ایک خشک ڈنڈ کے پاس تشریف لائیں تاکہ اس کے ساتھ ٹیک لگائیں اور سہارا پکڑ سکیں یا اس کے ذریعہ بوقت ولادت پردہ کر سکیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس خشک ڈنڈھ کو ہرا بھرا درخت بنا دیا اس پر پتے آ گئے پھل لگ گیا اسی طرح وہ پھل پک بھی گیا۔ دیکھیئے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی کس طرح حفاظت فرماتا ہے۔ اور ان کے پردے کا اور ان کے کھانے کا کیسا انتظام فرماتا ہے۔ حضرت امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

یحتمل انها ذهبت الی النخلة لسهولة الولادة للتشبث بها ویحتمل للتقوية والاستناد اليها و يحتمل يتستربها. (الکبیر ج ۲۱ ص ۲۰۲ تا ۲۰۳)

حضرت مریم کا خشک ڈنڈ کے قریب جانے میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ اس کو ولادت میں آسانی کے لیے پکڑنا چاہتی ہوں یا اس کے ساتھ سہارا لینا اور قوت حاصل کرنا چاہتی ہوں اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ پردہ کرنا چاہتی ہوں۔

اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کی جان اور عزت و توقیر کی ہر وقت حفاظت فرماتا ہے۔

قرآن کریم میں حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا کہ جب مچھلی نے آپ کو ایک کھلے میدان میں اگل دیا۔ ایک عرصہ تک مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے سبب گوشت نرم ہو گیا تھا۔ بال اور ناخن جھڑ گئے تھے اٹھنے کی طاقت نہ تھی اسی وقت

اللہ تعالیٰ نے کدو کی ایک بیل پیدا کی اور اس نے آپ کو اپنے چوڑے چوڑے پتوں سے ڈھانپ لیا تا کہ سورج کی گرمی اور مکھی، مچھر وغیرہ کی اذیت سے محفوظ رہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛

وانبتنا علیه شجرة من یقطین. (الصفات. ۱۴۶)

اور (ان کی حفاظت کے لیے) ہم نے اگا دی ان پر کدو کی بیل۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کدو کی بیل کو حضرت یونس علیہ السلام کے اوپر خیمے کی مانند بنا دیا تھا۔

انبتنا ها مطلة علیه و مظلة له کالخیمة (روح المعانی ج ۱۲. ۱۴۹)

یعنی کدو کی بیل کو ان کے اوپر خیمہ کی مانند بلند سائبان بنا دیا۔

جس رب کریم نے حضرت یونس وحضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہم السلام کی حفاظت کے لیئے صحراء اور ساحل میں درخت اگائے اسی رب نے حضرت علیؓ اور آپ کی والدہ ماجدہ کی حفاظت اور ان کے پردے کا بھی کوئی انتظام ضرور فرمایا ہوگا۔ وہ اپنے مقربین کی ہر مشکل میں مدد فرماتا ہے اور ان کی عزت و آبرو کا تحفظ فرماتا ہے جس فضل عمیم اور احسان عظیم والے خالق نے اپنے فضل و کرم سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کعبہ میں ولادت کے شرف سے نوازا ہوگا اس کریم نے بوقت ولادت ان کی والدہ ماجدہ کے پردے کا بھی کوئی نہ کوئی سبب ضرور پیدا فرمایا ہوگا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

ومن دخله کان اٰمنا (آل عمران . ۹۷)

اور جو اس (کعبہ) میں داخل ہوا اس کو امن ملا

علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس میں داخل ہونے والے کا محفوظ و مامون ہونا

ایک تشریعی اعتبار سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے شریعت محمدیہ میں حکم ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے اس کو نہ ستایا جائے اور دوسرے تکوینی اعتبار سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم وملت کے دلوں میں بیت اللہ کی تعظیم ڈال دی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عرب خواہ کتنی ہی عملی خرابیوں کے مرتکب تھے مگر بیت اللہ اور حرم محترم کی عظمت پر جان دیدیتے تھے۔ ان کی جنگ جوئی، خون ریزی، تندخوئی، پوری دنیا میں مشہور ہے لیکن حرم کے احترام کا یہ حال تھا کہ باپ کا قاتل بیٹے کے سامنے آتا تو مقتول کا بیٹا جو اس کے خون کا پیاسا تھا آنکھیں نیچے کر کے گزر جاتا تھا اس کو کچھ نہ کہتا تھا۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

والثانی یحتمل ان یکون المراد ما اودع اللہ فی قلوب الخلق من الشفقة علیٰ کل من التجاء الیه ودفع المکروہ عنه. (تفسیر کبیر جز ۸ ص ۱۶۱)

اور دوسرا یہ احتمال بھی ہے آیت کریمہ مین امن والا ہونے سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ بیت اللہ کی پناہ میں آنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے دلوں میں شفقت ڈال دی ہے کہ مخلوق اس کے ساتھ شفقت سے پیش آئے گی اور اس کے اوپر آنے والے ہر مصیبت وتکلیف کا دفاع کرے گی۔

اس پر ایک سوال پیدا ہوتا تھا کہ تاریخ کے ادوار میں کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا دیکھا گیا ہے کہ کعبہ اور حرم محترم میں آنے والے لوگوں پر منجنیق کے ذریعے پتھر برسائے گئے اور گولیاں چلائی گئی ہیں۔ تو اس کا جواب امام رازیؒ نے یہ دیا ہے کہ ایسے حالات بہت کم واقع ہوئے ہیں ورنہ تاریخ کے اکثر ادوار میں بیت اللہ میں داخل ہونے والے اور حرم محترم میں رہنے والے لوگ مامون ومحفوظ رہے ہیں۔ اس لیے مطلقاً اس کے وقوع کی خبر دی گئی ہے۔

ولما کان الامر واقعا علی ھذا الوجه فی الاکثر اخبر بوقوعه علیٰ

هٰذا الوجه . (تفسیر کبیر ج ۸ ص ۱۶۱)

اس کے اس احتمال کے اولیٰ ہونے پر امام رازیؒ نے دو دلیلیں ذکر فرمائی ہیں۔

الاول ان علیٰ هٰذا التقدیر لا نجعل الخبر قائماً مقام الامر (ج ۸ ص ۱۶۱)

اس احتمال کی اولویت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کے مراد لینے کی صورت میں مجازاً خبر سے امر کا معنیٰ مراد لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

اور دوسری دلیل یہ دی ہے۔

انه تعالیٰ ذکر هٰذا لبیان فضیلة البیت ذالک انما یحصل بشئی کان معلوما للقوم حتیٰ یصیر ذالک حجة علیٰ فضیلة البیت فاما الحکم الذی بینه الله تعالیٰ فی شرع محمد علیه الصلوٰة والسلام فانه لا یصیر حجة علی الیهود والنصاریٰ فی اثبات فضیلة الکعبة. (ج ۸ ص ۱۶۱)

اور دوسری وجہ اس کی اولویت کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امن کا ذکر بیت اللہ شریف کی فضیلت کو بیان فرمانے کے لیے کیا۔

اور یہ فائدہ ایسی چیز سے حاصل ہو گا جو تمام لوگوں کے ہاں معلوم و معروف ہو گی تا کہ وہ بیت اللہ کی فضیلت پر حجت بن جائے۔ حکم تشریعی جو اللہ تعالیٰ نے شریعت محمدیہ میں بیان فرمایا ہے (بیت اللہ میں داخل ہونے والے کو نہ ستایا جائے) وہ تو یہود اور نصاریٰ پر حجت نہیں بن سکتا البتہ ان پر حجت تکوینی امن ہی ہو سکتا ہے۔

سید قطب شہید اسی آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں:

اس گھر کی خصوصیت یہ ہے کہ جو کوئی اس کی حدود میں داخل ہو جائے اس کے لیے امن ہے۔ یہ گھر ہر خوف زدہ انسان کے لیے مقام امن ہے۔ زمین میں یہ خصوصیت کسی اور مقام کو حاصل نہیں۔ اس کی یہ خصوصیت حضرت ابراہیم کے اس گھر

کو تعمیر کرنے کے وقت سے آج تک ہے۔ حتیٰ کہ ایام جاہلیت میں بھی جبکہ اہل عرب حضرت ابراہیم کے دین اور توحید خالص سے جس کی نمائندگی یہ دین کرتا ہے، منحرف ہو گئے تھے خانہ کعبہ کی حرمت قائم تھی۔ جیسا کہ حسن بصری اور دوسرے اصحاب نے فرمایا: ایک شخص کو قتل کر دیتا تھا تو وہ اپنے گلے میں صوف ڈال لیتا تھا اور حرم مین داخل ہو جاتا مقتول کا بیٹا اس سے ملتا مگر جب تک وہ حرم سے باہر نہ آجاتا وہ اسے قتل کرنے کے لیے برانگیختہ نہ ہوتا۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس گھر کا اعزاز ہے جو اس وقت بھی برقرار رہا جبکہ اس گھر کے آس پاس لوگ جاہلیت میں مبتلا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل جاہلیت پر اپنے احسانات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اولم یروا انا جعلنا حرماأمنا یتخطف الناس من حولهم (عنکبوت ٦٧)

کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک امن والا حرم بنایا ہے جبکہ لوگ ان کے آس پاس سے اچک لیے اور قتل کر دیئے جاتے ہیں۔

(فی ظلال القرآن مترجم اردو ج دوم ص ٢٢٠ مطبوعہ البدر پبلیکیشنز لاہور)

قرآن کریم کے کئی دیگر مقامات میں بھی اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں ہے:

رب اجعل هٰذا بلداً اٰمناً . (البقرۃ ١٢٦)

اے میرے رب اس کو امن والا شہر بنا۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اطعمهم من جوع واٰمنهم من خوف. (سورہ قریش ٥)

انہیں بھوک میں کھانا دیا اور انہیں بڑے خوف سے امن بخشا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

واذ جعلنا البیت مثابة للناس وامنا. (البقرۃ ١٢٥)

اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امان بنایا۔

ان آیات کریمہ کی روشنی میں ہمیں یقین ہے کہ جب حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا بوقت ولادت کعبہ معظّمہ اور حرم محترم میں داخل ہوئیں ہونگیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت اور انکی پردہ داری کا ضرور کوئی نہ کوئی سبب پیدا فرمایا ہوگا۔ اور وہ بے پردگی وغیرہ کے تمام خطرات سے محفوظ و مامون رہی ہونگی۔ اللہ تعالیٰ حرم محترم میں داخل ہونے والے ایک عام خوف زدہ انسان کو امن عطا فرماتا ہے تو حضرت علیؓ کی والدہ ماجدہ کو خوف و بے پردگی سے امن کیوں نہ عطا فرمایا ہوگا؟

اللہ تعالیٰ اپنے بعض مقربین کو کسی امتیازی وصف اور خصوصیت سے نوازنا چاہتا ہے تو اس کے لیے تمام اسباب و وسائل بھی مہیا فرما دیتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آتے ہیں کعبہ میں ولادت کے ساتھ مشرف فرمانے کے کے علاوہ پہلی غذا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لعاب دہن مبارک ہونے کا بھی اعزاز عطا فرمایا ہے۔

علامہ زمخشری اپنی کتاب ''خصائص العشرۃ'' میں فرماتے ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم تولی تسمیتہ بعلی و تغزیتۂ ایاما من ریقہ المبارک یمصہ لسانہ فعن فاطمۃ بنت اسد ام علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما: انہا قالت لما ولدتہ سمّاہ علیا وبصق فی فیہ ثم انہ القمہ لسانہ فمازال یمصہ حتیٰ نام قالت فلما کان من الغد طلبنا لہ مرضعۃ فلم یقبل ثدی احد فدعونا محمداً صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فالقمہ لسانہ فنام کذالک ماشاء اللہ تعالیٰ. (سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۲۶۸)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا اور چند ابتدائی ایام میں ان کی غذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لعاب دہن مبارک رہا کہ آپ کی

زبان مبارک کو چوستے رہے۔

حضرت علی کی والدہ ماجدہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا جب میرے بطن سے حضرت علیؓ کی ولادت ہوئی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کا نام علی رکھا اور ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن مبارک ڈالا اور پھر اپنی زبان مبارک ان کے منہ میں رکھی تو وہ آپ کی زبان مبارک چوستے چوستے سو گئے اگلی صبح جب ہم نے ان کے لیے کسی دودھ پلانے والی کو تلاش کیا تو انہوں نے کسی بھی عورت کے پستان کو قبول نہ کیا بالآخر ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تشریف آوری کی درخواست کی تو آپ تشریف لائے اور اپنی زبان مبارک حضرت علیؓ کے منہ میں ڈالی وہ سو گئے یہ سلسلہ جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا جاری رہا۔

دیکھیئے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اس شرف سے نوازنا تھا اس کے لیے اس کے تمام وسائل بھی پیدا فرما دیئے۔ اب یہاں پر بھی شبہات پیدا کرنے والے بہت سارے شبہات پیدا کر کے کہہ سکتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ایسا کیوں نہ ہوا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانے والے کا نام کیا تھا؟ وقت کونسا تھا؟ حضور ﷺ اس وقت کہاں تھے؟ حضرت علیؓ نے والدہ کا دودھ کیوں نہ پیا؟ دودھ پلانے والیوں کا پستان قبول نہ کیا اور وہ عورتیں کونسی تھی؟ ان کو تلاش کر کے لانے والا کون تھا؟

نہ ماننے والے کے لیے ایسے شبہات وارد کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

معترض صاحب کا یہ کہنا کہ اس وقت کعبہ کے قریب آ کر اس کی طرف سجدہ کرنا بھی حرام تھا۔ قطعاً درست نہیں کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دور میں بھی رب کی عبادت کے لیے کعبہ ہی کو قبلہ بناتے تھے۔ اور وہاں جا کر نمازیں ادا فرماتے تھے۔

وفاء الوفاء میں ہے:

وانما اختلف فی صلوته بمکة قبل قدومه الی المدینة فروی انها کانت الی الکعبة وروی انها کانت الی البیت المقدس وروی انه یصلی الی بیت المقدس والکعبة بین یدیه. (وفاء الوفاء ج ۱ ص ۳۶۴، ص ۳۶۵)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ میں تشریف لانے سے قبل مکہ مکرمہ میں آپ نماز کس جہت کی طرف رخ کر پڑھتے تھے اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے یہ بھی مروی ہے کہ آپ کعبہ ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور ایک روایت ہے کہ بیت المقدس کی طرف رخ فرماتے تھے اور بعض روایات میں یہ ہے کہ آپ حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے تا کہ بیت المقدس کا بھی استقبال ہو اور بیت اللہ بھی سامنے رہے اور اسی کتاب میں ہے؛

صلی النبی صلی الله علیه وسلم اول ما صلی الی الکعبة ثم صرف الی بیت المقدس وهو بمکة وصلی ثلاث حجج وهاجر فصلی الیه بعد قدومه المدینة ستة عشر شهرا ثم وجهه الله الی الکعبة .(ج ۱ ص ۳۶۵)

سب سے پہلے رسول اکرم ﷺ نے جو نماز ادا فرمائی وہ کعبہ معظمہ کی طرف رخ فرما کر ادا فرمائی پھر آپ کو بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم ملا اور آپ نے مکہ میں تین سال اسی طرف رخ کر کے نماز ادا کی اور ہجرت کے بعد سولہ ماہ کے عرصہ میں مدینہ منورہ میں بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کیں پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو کعبہ کی کی طرف رخ کرنے کا حکم فرمایا۔ معارف القرآن میں ہے؛

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا کیونکہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں مقیم رہے بیت اللہ ہی کی

طرف نماز پڑھتے رہے۔ پھر ہجرت کے بعد آپ کا قبلہ بیت المقدس قرار دیا گیا اور مدینہ میں سولہ سترہ مہینے آپ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی اس کے بعد پھر آپ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آ گیا۔ تفسیر قرطبی میں بحوالہ ابوعمر واسی کو اصح القولین قرار دیا ہے۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۳۷۴)

واضح ہوا کہ صحیح ترین قول کے مطابق ہجرت سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کعبہ کی طرف ہی رخ کر کے نماز ادا فرماتے تھے۔

متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہجرت مدینہ سے قبل کعبہ شریف کے قریب نماز ادا فرماتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے؛

قال مر ابو جهل على النبى صلى الله عليه وسلم وهو يصلى عند المقام فقال الم انهك من هذا يا محمد فاغلظ له رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ابو جهل باى شئى تهددنى يا محمد والله انى لاكثر اهل الوادى هذا ناديا فانزل الله عز وجل فليدع نادية. سندع الزبانية قال ابن عباس والله لو دعانادية لاخذته زبانية العذاب من ساعته.

(احکام القرآن للقرطبی جز ۲۰ ص ۸۶ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

فرماتے ہیں کہ ایک روز حضور علیہ السلام کعبہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے کہ ابو جھل کہنے لگا کیا میں نے یہاں نماز پڑھنے سے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ جتنے میرے دوست ہیں اتنے کسی کے نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جھڑک دیا اسی وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی؛

فليدع ناديه سندع الزبانية. (صافات. ۱۷، ۱۸)

اسے کہو وہ اپنے دوستوں کو بلائے ہم اپنے فرشتوں کو ان کا دفاع کرنے کے

لیے بھیج دیں گے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں؛

اللہ کی قسم اگر وہ اپنے دوستوں کو بلاتا تو اسی وقت عذاب کے فرشتے اسے پکڑ لیتے۔

ایک دوسری حدیث ابن عمرؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں؛

بینا رسول الله ﷺ یصلی بفناء الکعبۃ اذا قبل عقبۃ بن ابی معیط فاخذ بمنکب رسول الله ﷺ ولوی ثوبہ فی عنقہٖ فخنقہٖ خنقاً شدیداً فاقبل ابوبکر فاخذ بمنکبیہ و دفع عن رسول الله ﷺ.

(سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۲۹۳ تا ۲۹۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز ہمارے درمیان کعبہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے عقبہ ابن ابی معیط آ گیا اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک پر چادر ڈال دی اور پھر اسے بل دیتے ہوئے زور سے کھینچا اچانک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آ گئے انہوں نے عقبہ بن محیط کو کندھوں سے پکڑا اور اس زور سے اس کو دھکا دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور جا گرا۔ ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ؛

ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ معظّمہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے کہ حرم شریف میں اس وقت قریش کی ایک جماعت موجود تھی۔ عقبہ ابن ابی معیط نے ابو جہل کی ترغیب سے ذبح کیے ہوئے اونٹوں کی اوجھ سجدے کی حالت میں آپ کے دونوں شانون کے درمیان رکھ دی یہ دیکھ کر سب قہقہ مار کر ہنسنے لگے۔ کسی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خبر کر دی وہ فوراً دوڑتی ہوئی آئیں اور آپ کی پشت مبارک سے وہ پلیدی دور کر دی اور ان کو برا بھلا کیا۔ (سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۲۹۱)

ان احادیث پر غور فرمائیں کہ ان سب سے واضح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہجرت مدینہ سے قبل کعبہ شریف کے قریب آ کر نمازیں ادا کرتے اور

اپنے رب کے حضور سجدے بجالاتے تھے۔ تو معترض صاحب کا یہ لکھنا کہ "اس زمانے میں کعبے کے قریب آکراس کی طرف سجدہ کرنا حرام تھا" کس حد تک صحیح ہوسکتا ہے۔

معترض صاحب کی کتنی بڑی سینہ زوری ہے کہ بغیر کسی دلیل کے حرام ہونا ثابت کرر ہے ہیں۔

معترض صاحب نے کعبہ میں حضرت علیؓ کی ولادت کا انکار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کعبے کی چاردیواری مین اس وقت کوئی ایسی بات نہ تھی جس کو مولیٰ علی کے لیے فضیلت قرار دیا جائے"

معترض صاحب کا یہ قول بھی بڑا عجیب ہے اور یہ ان کی انفرادیت ہے کہ وہ اس زمانے میں کعبہ کے اندر ولادت کو فضیلت قرار نہیں دے رہے۔ آج تک آئمہ و محدثین اور علماء و مورخین اس کو فضیلت قرار دیتے آئے ہیں دیکھیئے کہ حضرت حکیمؓ بن حزام کی کعبے میں ولادت کو علماء نے ان کی فضیلت قرار دیتے ہوئے ان کے مناقب کے تحت اس کو بیان کیا ہے۔

چنانچہ امام حاکم نے اس واقعہ کو حضرت حکیمؓ بن حزام کے مناقب کے تحت ذکر کیا ہے۔ (المستدرک للحاکم ج۳ص۵۵۰)

آئمہ، محدثین تو کعبہ میں ولادت کو اعزاز اور فضیلت قرار دے رہے ہیں مگر معترض صاحب کا یہ تفرد ہے کہ یہ کوئی فضیلت کی بات نہیں۔

معترض صاحب کی بات کو تسلیم کیا جائے یا ان آئمہ و محدثین کے قول کو جنہیں تمام ملت اسلامیہ آئمہ تسلیم کرتی ہے۔

☆☆☆

نماز قصر، وطن اصلی و وطن اقامت:

سفر کی حالت میں نماز قصر ادا کرنا قرآن وحدیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا (النساء ۱۰۱)

جب تم سفر میں جا رہے ہو تو تم پر نمازوں کے قصر میں کوئی گناہ نہیں اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔

اس آیت کریمہ میں حالت سفر میں نماز قصر کرنے (دوگانہ ادا کرنے) کی اجازت دی گئی ہے۔ آیت کے آخری حصہ میں فرمایا گیا ہے کہ "تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے"

یہ ارشاد غالب احوال کے اعتبار سے ہے کیونکہ اس وقت پورا عرب دارالحرب بنا ہوا تھا کسی طرف کا بھی سفر خطرات سے خالی نہیں تھا۔ ورنہ سفر میں قصر کی اجازت کے لیے خوف کا ہونا شرط نہیں۔ بعض صحابہ کرام کے ذہن میں بھی یہ اشکال آیا کہ اب تو امن ہے ہمیں سفر میں قصر نہیں کرنا چاہیے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:۔

"یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لیے صدقہ ہے اس کے صدقے کو قبول کرو"

(صحیح مسلم کتاب المسافرین مسند امام احمد ج ۱ ص ۲۵۔۲۶)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ:۔

صحبت النبی ﷺ فکان لا یزید فی السفر علی رکعتین ابا بکر و عمر و عثمان کذالک (مشکوٰۃ باب صلوٰۃ سفر ص ۱۱۸)

ترجمہ:۔ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہمسفر رہا ہوں حضور ﷺ نے کبھی دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھی، حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

١. عن انس بن مالک قال خرجنا مع رسول الله ﷺ فی المدینه الی مکة فصلی رکعتین رکعتین حتی رجع قلت کم اقام بمکة قال عشراً.
(السنن الکبریٰ للبیهقی ٣ ص ١٥٣)

حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف نکلے پس آپ نے نماز کی دو دو رکعتیں پڑھیں یہاں تک کہ آپ واپس لوٹ آئے (راوی کہتے ہیں) کہ میں نے انس ابن مالک سے پوچھا حضور ﷺ مکہ میں کتنے دن ٹھہرے تو انہوں نے کہا کہ دس دن۔

٢. عن ابن عباس قال کان رسول الله ﷺ اذا خرج من بیته مسافرا صلی رکعتین رکعتین. (السنن الکبریٰ للبیهقی ٣ ص ١٥٣)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے گھر سے مسافر بن کر نکلتے تو واپس لوٹنے تک دو دو رکعتیں نماز ادا فرماتے۔

٣۔ حضرت عمران ابن حصین رضی اللہ عنہ سے کسی نے سفر کی حالت میں حضور ﷺ کی نماز کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا:

ما سافر رسول الله ﷺ سفرا الا صلی رکعتینٌ حتی یرجع ویقول یا اهل مکة قوموا فصلوا رکعتین فانا سفر وغزیٰ الطائف و حسنین فصلیٰ رکعتین واتیٰ الجعرانة فاعتمر منها وحججت مع ابی بکر رضی الله تعالیٰ واعتمرت فکان یصلی رکعتین ومع عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه فکان یصلی رکعتین ومع عثمان رضی الله تعالیٰ عنه فصلیٰ رکعتین صدرا من امارته ثم صلی عثمان بمنیٰ اربعا. (اسنن الکبریٰ للبیهقی ٣ ص ١٥٣)

حضور ﷺ جب بھی کوئی سفر فرماتے تو واپس لوٹنے تک دو رکعت نماز ادا فرماتے اور آپ فرماتے اے اہل مکہ! اٹھو پس دو رکعتیں ادا کرو ہم مسافر لوگ ہیں اور آپ ﷺ نے طائف اور حنین کا غزوہ فرمایا تو بھی دو رکعتیں نماز ادا کی اور آپ جعرانہ میں تشریف لائے اور وہاں سے عمرہ کا احرام باندھا اور میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کیساتھ حج و عمرہ ادا کیا آپ دو رکعتیں پڑھتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی تو وہ بھی دو ہی رکعتیں ادا کرتے تھے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی، وہ بھی خلافت کے ابتدائی عرصہ میں دو ہی رکعتیں پڑھتے تھے لیکن بعد میں وہ منی کے مقام پر چار رکعتیں ادا کرتے تھے۔

۴۔ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے موسیٰ بن سلمۃ کو سنا وہ فرماتے تھے۔

سالت ابن عباس کم اصلی اذا فاتتنی الصلوٰۃ فی المسجد الحرام فقال رکعتین ذلک سنۃ ابی القاسم صلی اللہ علیہ وسلم.

(السنن الکبریٰ للبیہقی ۳ ص ۱۵۳)

میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا جب مسجد حرام میں مجھ سے، باجماعت نماز فوت ہو جائے تو کتنی رکعت نماز ادا کروں؟

تو ابن عباسؓ نے فرمایا دو رکعتیں ادا کیا کرو یہ ابو القاسم ﷺ کی سنت ہے۔

۵۔ ایک دوسری حدیث میں ہے:

سالت ابن عباس فقلت انی اکون بمکۃ فکیف اصلی قال رکعتین سنۃ ابی القاسم صل اللہ علیہ وسلم.

میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ میں بحالت سفر مکہ میں

ہوتا ہوں تو کیسے نماز پڑھوں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دو رکعتیں ادا کیا کرو یہ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۳ ص ۱۵۳)

اور احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہجرت کے بعد اہل مکہ کیساتھ بحیثیت امام کے چار رکعت والی نماز پڑھی اور دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:۔

اتموا صلوتکم فانا قوم سفر (المبسوط ج ۲ ص ۵۰۸)

تم اپنی نمازیں پوری کرو ہم مسافر ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حالت سفر میں نماز قصر ادا کرنا قرآن وسنت سے ثابت اور باعث ثواب ہے کیونکہ اس میں شریعت کے حکم کی بجا آوری ہے۔

نماز قصر سے متعلق مسائل تو بے شمار ہیں جنکی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے اس وقت ہمارے پیش نظر نماز قصر سے متعلق ایک اہم مسئلہ ہے جو اکثر لوگوں کو حالت سفر میں پیش آتا ہے لیکن عام لوگ اس مسئلہ اور اس کے متعلق حکم سے ناآشنا ہوتے ہیں وہ یہ کہ اگر کسی انسان کی کسی شہر میں جائیداد ہے مثلاً زمین یا مکان ہے لیکن وہ شخص خود وہاں نہ رہائش رکھتا ہے اور نہ اس کے اہل وعیال وہاں پر رہتے ہیں اور نہ ہی وہ جگہ اسکی جائے پیدائش ہے تو ایسی صورت میں اگر وہ مسافت قصر طے کر کے وہاں جائے اور پندرہ دن سے کم مدت وہاں ٹھہرنے کی نیت کرے تو کیا اسے نماز قصر ادا کرنی چاہیے یا پوری ادا کرنی چاہیے؟

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی جگہ جب انسان جائے تو اسے نماز پوری ادا کرنی چاہیے کیونکہ اس جگہ اس کی جائیداد ہے۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ مسافر کے لیے کسی بھی جگہ نماز پوری ادا کرنے کے لیے اس جگہ میں اس کی جائیداد کا ہونا شرط

نہیں بلکہ اس کے لیے اس جگہ کا وطن اصلی یا وطن اقامت ہونا ضروری ہے۔ صرف جائیداد کے ہونے سے کوئی جگہ وطن اصلی یا وطن اقامت نہیں بنتی۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے وطن کی اقسام اور اور ان میں سے ہر ایک کی تعریف ضروری ہے کیونکہ فقہاء کرام نے نماز کے قصر کی بحث میں وطن اصلی، وطن اقامت، وطن سکنی وغیرہ اصطلاحات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیئے ان اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے۔

یہاں پر یہ بات پیش نظر رہے کہ وطن سے مراد یہاں وہ مفہوم نہیں جو عام طور پر مراد ہوتا ہے یعنی وہ ریاست جس کی طرف انسان منسوب ہوتا ہے اور جس کی قومیت کا وہ حامل ہوتا ہے جس کی بین الاقوامی سرحدیں ہوتی ہیں جس کا اپنا جھنڈا ہوتا ہے جس کی اپنی فوج ہوتی ہے جس کی اپنی اسمبلی ہوتی ہے اور جس کا اپنا آئین ہوتا ہے جس کی بناء پر وہ دنیا کے دیگر ممالک سے ممتاز ہوتا ہے بلکہ یہاں وطن سے مراد وہ جگہ ہوتی ہے جہاں انسان ہمیشہ رہنے کا ارادہ رکھے یا پندرہ دن سے زائد رہنے کا ارادہ رکھے۔

چنانچہ امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ وطن کی تین اقسام بیان کرتے ہوئے ہر ایک کی تعریف میں یوں رقمطراز ہیں۔

ان الاوطان ثلاثة وطن قرار ويسمىٰ الوطن الاصلى وهو انه اذانشاء ببلدة او تاهل بها توطن بها ووطن مستعار وهو ان ينوى المسافر المقام فى موضع خمسة عشر يوما وهو بعيد عن وطنه الاصلى ووطن سكنى وهو ان ينوى المسافر المقام فى موضع اقل من خمسة عشر يوما او خمسة عشر يوما وهو قريب من وطن الاصلى

(المبسوط للسرخسی ج ۱ ص ۲۰۲ مطبوعه المعارف العلمية لاهور)

ترجمہ:۔ وطن تین ہیں (۱) وطن قرار جس کو وطن اصلی بھی کہا جاتا ہے اور یہ وہ جگہ ہے

جہاں انسان کی نشو نماء ہوتی ہے یا جہاں پر انسان شادی کر لیتا ہے یا جہاں ہمیشہ رہائش پذیر ہونے کا قصد کرتا ہے۔

۲۔ وطن مستعار۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مسافر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے اور یہ جگہ وطن اصلی سے مسافت سفر کی مقدار دور ہو۔

۳۔ وطن سکنیٰ یہ وہ جگہ ہے جہاں مسافر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت کرے یا پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے لیکن وہ وطن اصلی کے قریب ہو یعنی اس کے اور وطن اصلی کے درمیان مسافت سفر نہ پائی جاتی ہو اس کے بعد علامہ سرخسی ہر ایک وطن کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ثم الوطن الاصلی لاّ ینقضه الا وطن اصلی مثله والوطن المستعار ینقضه الوطن الاصلی وطن مستعار مثله والسفر . لا ینقضه وطن السکنی لانه دونه ووطن السکنی ینقضه کل شئی الا الخروج منه لا علی نیة السفر

(المبسوط ج ۱ ص ۲۰۲)

ترجمہ:۔ وطن اصلی کو اس کی مانند وطن اصلی ہی باطل کرتا ہے اور وطن مستعار کو وطن اصلی اور اس کی مانند وطن مستعار اور سفر باطل کرتا ہے۔ (یعنی ان تینوں میں سے ہر ایک اس کو باطل کرتا ہے) البتہ وطن سکنیٰ اسے باطل نہیں کرتا کیونکہ وہ اس سے کم درجے کا ہے اور وطن سکنیٰ کو ہر چیز باطل کرتی ہے سوائے اس کے کہ مسافر بدوں نیت سفر خروج کرے۔

علامہ سرخسی وطن اصلی کا اپنی مثل وطن اصلی سے باطل ہونے کی دلیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

ان النبی ﷺ کان متوطنا بمکة فلما توطن بالمدینة انتقض وطنه بمکة حتیٰ لما دخلها قال اتمو صلوتکم فانا قوم سفر .(المبسوط ج ۲ ص ۵۰۸)

ترجمہ:۔ نبی کریم ﷺ کا وطن اصلی مکہ تھا پس جب آپ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کو اپنا وطن اصلی بنایا تو مکہ کا کا وطن اصلی ہونا باطل ہو گیا حتیٰ کہ جب آپ فتح مکہ کے روز وہاں تشریف لے گئے تو اہل مکہ سے فرمایا تم اپنی نمازیں پوری ادا کرو ہم مسافر لوگ ہیں (قصر ادا کریں گے) اکثر علماء احناف نے وطن کی صرف دو قسمیں وطن اصلی اور وطن اقامت قرار دی ہیں۔ وطن اصلی سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان پیدا ہوا اور اس کے ترک پر عزم بھی نہ کیا ہو یا جہاں اس کی بیوی رہتی ہو یا وہ جگہ ہے جس کو انسان اپنا وطن بنانے کا عزم کرے اور اس سے کوچ کرنے کا ارادہ ترک کر دے اگر چہ وہاں اس نے شادی نہ بھی کی ہو۔

درمختار میں ہے:۔

الوطن الاصلی هو موطن ولادته او تاهله او توطنه يبطل بمثله اذا لم يبق له بالاول اهل فلو بقی لم يبطل بل يتم فيهما .

(در مختار بر حاشيه رد المختار ج ۱ ص ۵۸۶)

ترجمہ:۔ وطن اصلی وہ جگہ ہے جہاں انسان کی پیدائش ہو یا جہاں انسان نے شادی کی ہو یا جس جگہ میں آئندہ کے لیے مستقل رہنے کا ارادہ کر لیا ہو اور وطن اصلی اپنی مثل سے باطل ہوتا ہے جبکہ وطن اول میں آدمی کی زوجہ نہ رہتی ہو اگر رہتی ہو پھر باطل نہ ہوگا بلکہ دونوں میں نماز مکمل پڑھنی ہوگی۔

علامہ شامی رحمہ اللہ وطن اصلی کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

ويسمى بالاهلی وطن الفطرة والقرار . (رد المختار ج ۱ ص ۵۸۶)

یعنی وطن اصلی کو وطن اھلی، وطن قرار اور وطن فطرت بھی کہا جاتا ہے صاحب درمختار نے فرمایا تھا کہ انسان جس جگہ متاھل ہو جائے وہ جگہ اس کے لیے وطن اصلی بن جاتی ہے تو علامہ شامی رحمہ اللہ تاھل کے مفہوم کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ای

تزوجہ" یعنی وہ اس جگہ پر نکاح کرے تو وہ جگہ اس کے لیے وطن اصلی بن جائے گی۔

شرح منیہ کے حوالے سے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ولو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الاقامه به فقیل لا یصیر مقیما وقیل یصیر مقیما وهو الاوجه ولو کان له اهل ببلدتین فایهما دخلها صار مقیما فان ماتت زوجة فی احداهما وبقی له فیها دار وعقار لا یبقی وطنا له اذا المعتبر الاهل دون الدار کما لو تاهل ببلدة واستقرت سکنا له ولیس فیها دار قیل تبقی. (رد المختار ج ۱ ص ۵۸۶)

اگر کوئی مسافر کسی شہر میں شادی کرے اور وہاں اقامت کی نیت نہ کرے تو بعض کے نزدیک وہ مقیم نہ بنے گا اور بعض کے نزدیک صرف نکاح کرنے سے ہی مقیم بن جائے گا اور یہ قول زیادہ مناسب ہے اور اگر دو مختلف شہروں میں اس کی دو بیویاں رہتی ہوں تو ان میں سے جس شہر میں داخل ہوگا وہ مقیم بن جائے گا اگر ان دونوں بیویوں میں سے ایک بیوی ایک شہر میں وفات پا جائے اور اس شہر میں اس کا مکان اور زمین باقی ہے تو بھی وہ شہر اس کے لیے وطن اصلی نہیں رہے گا کیونکہ وطن اصلی بننے کے لیے اھل (زوجہ) کا وہاں ہونا معتبر ہے نہ کہ مکان اور زمین وغیرہ (جائیداد کا) ہونا جیسا کہ کوئی شخص کسی شہر میں شادی کرلے اور وہ شہر اس کے لیے مستقل طور پر جائے سکونت بن جائے گا اگرچہ اس شہر میں اس کا کوئی مکان و زمین نہ بھی ہو تب بھی وہ شہر اس کے لیے وطن اصلی بن جائے گا اور بعض فقہاء نے فرمایا ہے کہ دار و عقار کی موجودگی کی وجہ سے وہ اس کا وطن اصلی رہے گا۔

شرح منیہ کی مذکورہ عبارت سے درج ذیل امور ثابت ہوئے۔

۱۔ اگر کوئی مسافر کسی شہر میں شادی کرلے اور اس شہر میں اقامت کی نیت نہ

کرے تو اس کے نفس شادی کی وجہ سے اس شہر میں اس کے مقیم بن جانے یا نہ بننے میں اختلاف ہے بعض فقہاء کے نزدیک شادی کر لینے سے ہی وہ مقیم بن جائے گا۔ اگر چہ وہ نیت اقامت نہ بھی کرے اور بعض فقہاء کے نزدیک بغیر نیت اقامت کے وہ مقیم نہ ہوگا یعنی نکاح کر کے بیوی کو دوسرے شہر میں لے جانا مقصود ہو وہاں رہنے کی نیت نہ ہو تو وہ جگہ ان فقہاء کے نزدیک اس کے لیے وطن اصلی نہیں بنے گی۔ چنانچہ امام سرخسی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے بھی ان فقہاء کی تائید ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں۔

تاهل بها توطن بها (المبسوط)

ترجمہ:۔ یعنی وطن اصلی وہ جگہ ہے جہاں انسان نے شادی کی اور اس کو مستقل وطن بنا لیا ہو۔اور اس کی تائید فتاویٰ قاضیخان کی اس عبارت سے بھی ہوتا ہے کہ:۔

بان كان مولده وسكن فيه او لم يكن مولده ولكنه تاهل به وجعله داراً

(فتاویٰ قاضیخان بر حاشیه فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱٦۵)

یعنی وطن اصلی سے مراد یہ ہے کہ وہ جگہ انسان کی جائے پیدائش ہو اور اس میں رہائش پذیر بھی ہو یا اس کی جائے پیدائش تو نہیں لیکن اس نے اس جگہ پر شادی کی اور اس کو اس نے اپنا مستقل ٹھکانا بنایا ہو۔تبین الحقائق میں علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

وطن اصلي وهو مولد الانسان او البلدة التي تاهل بها

(تبين الحقائق ج ۱ ص ۲۱۴)

وطن اصلی سے مراد انسان کی جائے پیدائش ہے یا وہ شہر ہے جہاں پر انسان شادی کرتا ہے۔تاھل بہا پر حاشیہ شلبی میں ہے۔

ومن قصده التعيش به ولاالارتحال (تبيين الحقائق ج ص ۲۱۴)

اور اس کا وہاں مستقل رہنے کا ارادہ ہو اور اس سے کوچ کرنے کی نیت نہ ہو۔

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ فقط شادی کرنے سے کوئی جگہ انسان کا وطن اصلی

نہیں بنتی بلکہ وہاں مستقل رہنے کا ارادہ بھی ہو۔

۲۔ شرح منیہ کی عبارت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کسی انسان کی دو بیویاں دو مختلف شہروں میں رہائش پذیر ہیں تو یہ دونوں شہر اس شخص کے لیے وطن اصلی بن جائیں گے وہ ان میں سے جس شہر میں بھی داخل ہو گا اس کو نماز پوری پڑھنی پڑے گی خواہ پندرہ دن اقامت کا ارادہ نہ بھی ہو۔

۳۔ اور اگر ان دونوں بیویوں میں سے ایک وفات پا جائے لیکن خاوند کی جائیداد مثلاً مکان زمین وغیرہ اس شہر میں موجود ہے تو بھی بعض علماء کے نزدیک یہ وطن اس کے لیے وطن اصلی نہیں رہا لہٰذا اب جب بھی وہ اس شہر میں جائے اور پندرہ ایام سے کم رہنے کا ارادہ ہو تو نماز قصر پڑھے۔

اس لیے کہ یہ اب اس کے لیے وطن اصلی نہ رہا کسی جگہ یا شہر کے وطن اصلی بننے کے لیے وہاں پر اس کی اہل (زوجہ) کا ہونا معتبر ہے نہ کہ زمین یا مکان کا ہونا اس پر دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں دیکھیے کہ اگر کوئی شخص کسی جگہ شادی کرتا ہے اور اس کو اپنا دائمی مستقر بنا لیتا ہے تو وہ اس کے لیے وطن اصلی بن جائے گا اگرچہ اس جگہ میں اس کی زمین و جائیداد وغیرہ نہ بھی ہو اسی سے معلوم ہوا کہ کسی جگہ کا وطن اصلی بننے کے لیے اہل کا ہونا معتبر ہے نہ کہ جائیداد کا ہونا۔ بعض علماء اس صورت میں بھی اس کے وطن اصلی باقی رہنے کے قائل ہیں علامہ شامی رحمہ اللہ اسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اذا لم یبق له باالاول اهل وان بقی له فیه عقار (رد المختار ج ۱ ص ۵۸۶)

یعنی سابق وطن اصلی اپنی مثل وطن اصلی کی وجہ سے اس وقت باطل ہو گا جب کہ اس (اول) میں اس کی اہل (زوجہ) باقی نہ رہے خواہ اس کی زمین وغیرہ جائیداد

موجود کیوں نہ ہو۔

علامہ شامی کے اس قول سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی وطن اصلی کے لیے اہل کا ہونا شرط ہے نہ کہ زمین وجائیداد کا ہونا۔

چنانچہ علامہ شامی اس کے بعد صاحب نھر کا قول نقل کرتے ہیں۔

قال فی النھر ولو نقل اھلہ ومتاعہ ولہ دور فی البلد لا تبقیٰ وطنا لہ وقیل تبقی کذا فی المحیط وغیرہ . (رد المختار ج ۱ ص ۵۸۶)

یعنی صاحب نھر نے فرمایا اگر کسی شخص نے اپنے وطن اول سے اپنی اہل اور اپنا سامان دوسرے شہر میں منتقل کرلیا ہے لیکن پہلے شہر میں اس کے مکانات باقی ہیں تو بھی وہ شہر اس کے لیے وطن اصلی نہیں رہا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس صورت میں وطن اصلی باقی رہے گا۔

علامہ شامی نے صاحب نھر کا قول اپنی تائید کے لیے نقل کیا ہے کیونکہ صاحب نھر بھی ایسی صورت میں وطن اصلی کے باقی نہ رہنے کے قائل ہیں البتہ بعض فقہاء کا نظریہ اس کے برعکس ہے۔ لیکن صاحب نھر کے نزدیک ان کا یہ نظریہ ضعیف ہے کیونکہ انہوں نے قیل سے اس نظریئے کو بیان کرتے ہوئے اس کے ضعیف ومرجوح ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

نیز ایک شخص کے لیے ایک سے زائد وطن اصلی ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ فقہاء کرام نے اس کی وضاحت فرمائی ہے ملک العلماء علامہ کاسانی رحمہ اللہ بدائع الصنائع میں فرماتے ہیں:۔

ثم الوطن الاصلی یجوز ان یکون واحدا او اکثر من ذالک بان کان لہ اھل ودار فی بلدتین او اکثر ولم یکن من نیت اھلہ الخروج منھا وان کان ھو

ینتقل من اھل الی اھل فی السنۃ حتیٰ انہ لو خرج مسافرا من بلدۃ فیھا اھلہ ودخل فی ای بلدۃ من البلاد التی فیھا اھلہ فیصیر مقیما من غیر نیۃ الاقامۃ ۔
(بدائع الصنائع ج ۱ ص ۱۰۴)

ترجمہ:۔ وطن اصلی کا ایک اور ایک سے زائد ہونا جائز ہے مثلاً کسی شخص کی دو یا دو سے زائد بیویاں مختلف شہروں میں رہائش پذیر ہوں اور ان کی اس شہر سے خروج کی نیت بھی نہ ہو اگر چہ وہ بذات خود ایک بیوی سے دوسری بیوی کے پاس سال میں کئی مرتبہ آتا جاتا رہتا ہو لہٰذا یہ شخص جن شہروں میں اس کی بیویاں موجود ہیں ان میں سے کسی بھی شہر میں داخل ہوگا تو وہ نیت اقامت کے بغیر مقیم بن جائے گا۔

علامہ کاسانی کی مذکورہ عبارت سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان کے لیے ایک سے زائد وطن اصلی ہو سکتے ہیں جب ان اوطان اصلیہ میں سے کسی میں بھی سفر کرتے ہوئے داخل ہو تو بدوں نیت اقامت وہ مقیم ہو جائے گا اور اسی عبارت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وطن اصلی کے لیے اس میں اھل (زوجہ) کا مستقل رہائش پذیر معتبر ہے نہ کہ مکان وزمین کا ہونا۔

انسان کی ایک سے زائد بیویاں اگر مختلف شہروں میں مستقل رہائش پذیر ہوں تو وہ شہر اس کے لیے وطن اصلی بن جائیں گے اس پر ہدایہ کی شرح الکفایہ میں ہے۔

لو کان لہ اھل ببلدۃ فاستحدث فی بلدۃ اخریٰ اھلا اخری کان کل واحد منھما وطنا اصلیا لہ روی انہ کالعثمان رضی اللہ عنہ اھل بمکۃ واھل بالمدینۃ وکان یتم الصلوٰۃ فیھما جمیعا (الکفایہ ج ۲ ص ۱۷)

ترجمہ:۔ اگر کسی شخص کی بیوی ایک شہر میں ہو اور اس نے دوسرے شہر میں نئی شادی کر لی ہے تو اب وہ دونوں شہر اس کے لیے وطن اصلی بن جائیں گے۔

مروی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بیوی مکہ میں تھی اور ایک مدینہ

المنورۃ میں تھی جس کی بناء پر آپ ان دونوں مقدس شہروں میں پوری نماز پڑھتے تھے۔

علامہ طحاوی مراقی الفلاح میں فرماتے ہیں:۔

ولو استحدث اھلا فی ثلاث مواضع فالحکم واحد فیما یظھر

(مراقی الفلاح ص ۲۳۳)

اگر کوئی شخص تین جگہوں میں شادی کر لے تو بھی حکم ایک ہی ہوگا جیسا کہ ظاہر ہے یعنی تینوں جگہیں اس کے لیے وطن اصلی بن جائیں گی۔ ہدایہ کی شرح الکفایہ میں محیط کے حوالے سے ہے:

لو انتقل باھلہ ومتاعہ الی بلد وبقی لہ دور وعقار فی الاول قیل بقی الاول وطنا لہ والیہ اشار محمد رحمہ اللہ تعالیٰ فی الکتاب حیث قال باع دارہ ونقل عیالہ وقیل لم یبق . (الکفایہ ج ۲ ص ۱۸)

اگر کوئی شخص اپنی اھل (زوجہ) اور ساز و سامان سمیت ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہو جائے اور اس پہلے شہر میں اس کے مکانات و زمین باقی ہیں تو بعض علماء کے نزدیک وہ شہر اس کے لیے ابھی وطن اصلی ہے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی جانب اشارہ فرمایا ہے جہاں آپ نے یہ فرمایا ہے:

باع دارہ ونقل عیالہ

کہ اس نے اپنے گھر کو فروخت کر دیا اور اپنے عیال کو منتقل کر دیا ہو تو اب وہ شہر اس کے لیے وطن اصلی نہیں رہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک جب تک پہلے شہر میں اس کے مکانات و زمین باقی ہوں اور اس نے اس کو آئندہ ترک کرنے کا ارادہ نہیں کیا تو وہ اس کے لیے وطن اصلی رہے گا اور بعض علماء نے فرمایا اس صورت میں اس کے لیے وہ

وطن اصلی نہیں رہا۔

الکفایہ میں الاجناس کے حوالہ سے ایک عبارت موجود ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر اول میں مکانات و زمین موجود ہونے کی صورت میں وہ شہر اس وقت تک وطن اصلی رہے گا جب تک آئندہ کے لیے اس کے مستقل طور پر ترک کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے۔

قال هشام سالت محمد اعن كوفي اوطن بغداد وله بالكوفة دار واختار الى مكة القصر . قال محمد رحمه الله تعالىٰ هذا حالي واری القصر ان نوي ترك وطنه الا وان ابا يوسف يتم بها لكنه يحمل على انه لم ينو ترك وطنه . (الكفايه ج ٢ ص ١٨)

ہشام کہتے ہیں کہ میں نے اپنے حضرت امام محمد رحمہ اللہ سے پوچھا کہ ایک شخص کوفے کا رہنے والا ہے اور اس نے بغداد کو اپنا مستقل وطن بنا لیا ہے لیکن کوفہ میں اس کا مکان موجود ہے اور وہ اس صورت میں میں مکہ جاتے ہوئے نماز قصر کر لیتا ہے؟ (حالانکہ راستے میں کوفہ پڑتا ہے) تو حضرت امام محمد نے جواب دیا کہ یہی میرا حال ہے۔ (یعنی مختلف جگہ میں جائیداد واھل ہے) میری رائے یہ ہے اگر اس شخص نے اس حالت میں کوفہ چھوڑنے کا ارادہ کیا ہے تو وہ نماز قصر ادا کرے البتہ امام ابو یوسف ایسی صورت میں مکمل نماز ادا کرتے ہیں لیکن ان کے اس عمل کو اس بات پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ترک وطن کی نیت نہ کی ہو۔

مذکورہ عبارت سے درج ذیل امور ثابت ہوئے اگر کوئی شخص ایک شہر کا رہنے والا ہے اب اس نے دوسرے شہر میں مستقل رہائش اختیار کر لی ہے البتہ پہلے شہر میں اس کی زمین و مکان وغیرہ ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ اس نے اس پہلے شہر کو ترک کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

۲۔ پہلے شہر میں ترک وطن کا ارادہ نہیں کیا بلکہ اس کا ارادہ ہے کبھی وہاں رہے گا کبھی یہاں رہے گا۔

پہلی صورت میں سابقہ شہر اسکے لیے وطن اصلی نہیں رہا اگر چہ اسکی جائیداد اس میں موجود ہو کیونکہ اس نے اس کے ترک وطن کا اردہ کر لیا ہے اور دوسری صورت میں وہ اس کے لیے ابھی وطن اصلی ہے کیونکہ ابھی تک اس نے ترک وطن کا ارادہ نہیں کیا۔

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام محمد کے نزدیک صرف کسی جگہ زمین یا مکان موجود ہونے کے سبب وہ جگہ وطن اصلی نہیں بنتی بلکہ وطن اصلی بننے کا مدار نیت پر ہے اگر آئندہ اس کے ترک نہ کرنے کا ارادہ ہے تو وہ وطن اصلی ہے اور اگر آئندہ اسے ترک کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ اب اس کے لیے وطن اصلی نہیں رہے گا اگر چہ وہاں پر اس کی زمین و مکان موجود کیوں نہ ہو چنانچہ صاحب کتاب نے ایسی صورت میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نماز پوری ادا کرنے کے عمل کو اسی پر محمول کیا ہے کہ انہوں نے ترک وطن کی نیت نہیں کی ہوگی۔ اس لیے وہ نماز پوری پڑھتے تھے۔ الکفایہ میں امام محمد کے مذکورہ جواب کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

قال الشیخ نجم الدین الذاھدی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ وھذا جواب واقعۃ ابتلینا بھا وکثیر من المسلمین المتوطنین فی البلاد ولھم دور و عقار فی القری البعیدۃ منھا یصیفون بھا باھلھم ومتاعھم فلا بد من حفظھا انھما وطنان لا یبطل احدھما بالاخر . (الکفایہ ص۱۸)

شیخ نجم الدین زاہدی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ امام محمدؒ کا مذکورہ جواب اس حالت کا مناسب جواب ہے جس حالت سے ہم اور دیگر بہت سارے مسلمان دو

چار ہوتے ہیں رہتے ہیں جو مختلف شہروں میں رہائش پذیر ہوتے ہیں لیکن ان کے مکانات وزمینیں شہروں سے دور دراز بستیوں میں ہوتی ہیں جہاں وہ اپنی اہل ومتاع سمیت موسم گرما گزارتے ہیں لہٰذا ان دونوں وطنوں کی حفاظت ضروری ہے کہ ایک دوسرے کی وجہ سے باطل نہ ہوں (اور یہ حفاظت مذکورہ جواب سے ہو جاتی ہے)

مذکورہ عبارت سے ثابت ہوا کہ بہت سارے لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہتے ہیں پہلے شہر میں ان کی زمین یا مکان وغیرہ باقی ہوتے ہیں اور وہ اس شہر کو ہمیشہ کیلیے ترک کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔ بعض لوگ سردیوں اور گرمیوں میں مختلف شہروں اور مکانات میں اپنے اہل وعیال سمیت منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان مختلف جگہوں میں ان کی زمینیں اور مکانات وغیرہ بھی ہوتے ہیں اور وہ ان میں سے کسی ایک جگہ کے ترک کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے تو ایسے لوگوں کے لیے یہ دونوں جگہیں امام محمدؒ کے نزدیک وطن اصلی ہیں وہ جس میں بھی جائیں نماز مکمل ادا کریں گے۔

لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر کسی شخص نے کسی شہر میں کوئی زمین خریدی یا مکان خریدا یا اس کو میراث وغیرہ کے ذریعے کوئی زمین ملی ہو لیکن وہ شخص خود اس جگہ نہ رہائش پذیر ہوا اور نہ وہ جگہ اس کی جائے پیدائش ہے نہ اس نے وہاں سے شادی کی نہ اس جگہ اس کے اھل وعیال رہتے ہیں نہ وہ کبھی وہاں پر مستقل طور پر رہائش پذیر رہا اور نہ آئندہ کے لیے مستقل طور پر وہاں پر رہائش پذیر رہنے کا ارادہ ہے تو یہ شہر اس کے لیے وطن اصلی بن جائے کیونکہ کسی جگہ کے وطن اصلی بننے کے لیے وہاں پر صرف مکان یا زمین وغیرہ جائیداد کا ہونا معتبر نہیں بلکہ اس کے لیے دیگر شرائط ہیں جنکا تذکرہ گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے لہٰذا ایسا شخص اس شہر میں مسافت سفر طے کر

کے جائے تو اس کے لیے نماز قصر ادا کرنی لازمی ہوگی۔عصر حاضر کے ممتاز سکالر اور جلیل القدر فقیہ حضرت علامہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی اپنی معروف کتاب الفقہ الاسلامی وادلتہ میں رقمطراز ہیں:

یتم الصلوٰۃ اذا انتقل من محل الاقامۃ الدائمۃ کمرکز الوظیفۃ الیوم الی موطن آخر لہ فیہ زوجۃ او الی محل المیلاد الذی بقی لہ فیہ اھل ای زوجۃ کالریف فمن کان موظفا فی دمشق مثلا ثم سافر الی قریۃ الاصلیۃ فی الریف لزیارۃ الاھل (الزوجۃ) اتم الصلوٰۃ سواء کانت المسافۃ بین مقر العمل او الوظیفۃ مسافۃ القصر ام لا لانہ فی ھذا الحالۃ یکون لہ موطنان وکل منھما وطن اصلی۔

آدمی جب اپنی دائمی رہائش کی جگہ سے (جیسا کہ ملازمت کی موجودہ جگہ) سے ایسی جگہ کی طرف منتقل ہو جائے جہاں اس کی اہل (زوجہ) رہتی ہو یا وہ اپنی پیدائش کی اس جگہ چلا جائے جہاں اس کی بیوی رہتی ہو جیسا کہ دیہات تو وہ نماز مکمل ادا کرے مثال کے طور پر جو شخص دمشق میں ملازمت کرتا ہے اور وہ دیہات میں موجود اپنے اصلی گاؤں میں اپنی زوجہ سے ملنے کے لیے جائے تو نماز مکمل ادا کرے گا خواہ عمل یا ملازمت کی جگہ اور دیہات کے درمیان قصر کی مسافت ہو یا نہ ہو کیونکہ اس حالت میں اس شخص کے لیے یہ دونوں وطن ہیں۔اور ان میں سے ہر ایک اس کے لیے وطن اصلی ہے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ انسان کی جائے ملازمت یا وہ جگہ جہاں حصول روزگار کے لیے رہائش پذیر ہے تو وہ اس کا وطن اصلی ہے لہٰذا وہ جب بھی وہاں جائے گا قصر کے بجائے پوری نماز ادا کرے گا اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا جہاں انسان کی

بیوی رہائش پذیر ہے وہ جگہ بھی اس کے لیے وطن اصلی ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ انسان کے ایک سے زائد اوطان اصلیہ ہو سکتے ہیں۔ اور اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ کسی جگہ کا وطن اصلی بننے کے لیے وہاں پر زمین مکان وغیرہ جائیداد کا ہونا معتبر نہیں بلکہ وہاں پر اس کی اھل (زوجہ) کا ہونا معتبر ہے چنانچہ اسی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فان لم یبق له اهل فی الریف وان بقی فیه عقار (ارض او دار) قصر الصلوٰة لان محل المیلاد وان کان وطنا اصلیا له الا انه بطل بمثله وهو مقر عمله وبه یتبین ان الوطن الاصلی للانسان یبطل اذا هاجر بنفسه واهله ومتاعه الی بلد آخر فان عاد الی بلده الاول للعمل مثلا وجب علیه قصر الصلوٰة .
(الفقه الاسلامی جز ۲ ص ۳۴۲)

پس اگر دیہات میں اس کی بیوی نہیں رہتی لیکن اس میں عقار یعنی زمین یا مکان موجود ہے تو تب بھی وہاں نماز قصر ادا کرے گا کیونکہ اس کی جائے پیدائش گرچہ اس کے لیے وطن اصلی تھی لیکن وہ اب اپنی مثل وطن اصلی کی وجہ سے باطل ہو چکا ہے۔ اور وہ وطن اصلی اس کے حصول روزگار کی جگہ ہے اسی سے ظاہر ہوا کہ انسان وطن اصلی سے جب اپنی بیوی اور ساز و سامان سمیت دوسرے شہر کی طرف منتقل ہو جائے تو باطل ہو جاتا ہے۔ پس اب اگر وہ پہلے شہر میں کسی کام کی غرض سے جائے تو اس پر نماز قصر ادا کرنا لازم ہوگا۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ انسان کی جائے پیدائش جو اس کا وطن اصلی ہے اگر اسے ترک کر کے دوسرے شہر میں رہائش اختیار کر لے خواہ جائے پیدائش میں اس کی زمین مکان وغیرہ جائیداد بھی موجود کیوں نہ ہو تب بھی وہ اس کے لیے وطن اصلی نہیں رہی اب وہ جب بھی وہاں کسی کام کی غرض سے جائے اور پندرہ ایام تک قیام کی

نیت نہ ہو تو اس پر نماز قصر ادا کرنا لازم ہوگی۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ انسان اپنی پیدائش کی جگہ کو ترک کر کے کسی دوسری جگہ مستقل رہائش اختیار کر لیتا ہے اور پیدائش کی جگہ میں اس کا ملکیتی مکان یا زمین وغیرہ جائیداد موجود ہو تب بھی وہ اس کے لیے وطن اصلی نہیں رہی تو جس شخص کی پیدائش بھی وہاں نہ ہو اور نہ ہی وہاں اسکی اھل وعیال رہتی ہو نہ اس نے وہاں سے کبھی شادی کی ہو نہ اس کے والدین وہاں رہتے ہوں البتہ وہاں پر صرف اس کی موروثی یا خرید کردہ زمین یا مکان موجود ہے تو وہ جگہ اس کے لیے وطن اصلی کیسے بنے گی؟ وطن اصلی بننے کے لیے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے مذکورہ جگہ میں ان میں سے کوئی شرط نہیں پائی جاتی۔ اس لیے ایسے شخص کے لیے مذکورہ جگہ وطن اصلی نہیں بنے گی لہٰذا وہ جب بھی وہاں جائے اور پندرہ ایام سے کم مدت ٹھہرنے کی نیت ہو تو اس پر نماز قصر ادا کرنی لازم ہوگی۔

علامہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی کی مذکورہ عبارت کے مطابق انسان کی جائے ملازمت وطن اصلی ہے۔ لہٰذا وہ جب بھی اپنی جائے ملازمت میں جائے گا اسے نماز پوری پڑھنی پڑے گی۔ خواہ وہاں پندرہ یا زائد ایام ٹھہرنے کی نیت کرے یا نہ کرے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق ہمارے آئمہ احناف کے فتاویٰ اور تحقیق کے مخالف ہے۔ علماء احناف کی تصریح کے مطابق انسان کی جائے ملازمت اگر وطن اصلی سے مسافت قصر پر واقع ہے تو وہ وطن اقامت قرار پائے گی لہٰذا وہ جب بھی سفر کر کے وہاں جائے اور پندرہ ایام قیام کی نیت نہ کرے تو اس پر نماز قصر ادا کرنی واجب ہوگی۔ چنانچہ فتاویٰ رضویہ میں قصر سے متعلق ایک سوال اور اس کا جواب یوں مذکور ہے۔

مسئلہ: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اپنے وطن اصلی

سے ستر یا اسی کوس کے فاصلے پر کسی شہر میں ملازم ہے وہاں سال دو سال کے بعد آٹھ دس روز کے واسطے اپنے مکان پر آیا اور پھر چلا گیا اس آمد و رفت میں اس کو نماز قصر پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ بینوتو اجروا۔

الجواب: جب وہاں سے بقصد وطن چلے اور وہاں کی آبادی سے باہر نکل آئے اس وقت سے جب تک اپنی شہر کی آبادی میں داخل نہ ہو قصرے کرے گا جب اپنے وطن کی آبادی میں داخل ہو گیا قصر جاتا رہا جب تک یہاں رہیگا اگر چہ ایک ہی ساعت قصر نہ کر سکے گا کہ وطن میں کچھ پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت ضروری نہیں پھر جب وطن سے اس شہر کے قصد پر چلا اور وطن کی آبادی سے باہر نکل گیا اس وقت سے قصر واجب ہو گیا۔ راستے بھر تو قصر کرے گا ہی اور اگر اس شہر میں پہنچ کر اس بار پندرہ روز یا زیادہ قیام کا ارادہ نہیں بلکہ پندرہ دن سے کم میں واپس آنے یا وہاں سے کہیں اور جانے کا قصد ہے تو وہاں جب تک ٹھہرے گا اس قیام میں بھی قصر ہی کرے گا اور اگر وہاں اقامت کا ارادہ ہے تو صرف راستہ بھر قصر کرے جب اس شہر کی آبادی میں داخل ہو گا تو قصر جاتا رہے گا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۲۵۸ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

مذکورہ عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی جائے ملازمت اگر وطن اصلی سے مسافت قصر پر واقع ہے تو وہ جگہ اس کے لیے وطن اقامت ہے اور جب بھی وہ سفر کر کے وہاں جائے اور پندرہ روز یا زائد قیام کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس پر نماز میں قصر واجب ہو گی۔ البتہ ڈاکٹر زحیلی کی مذکورہ عبارت کا اگر یہ مطلب ہو کہ اگر کسی انسان نے اپنی جائے ملازمت میں مستقل رہائش رکھنے کا عزم کر لیا ہے تو اب وہ جگہ اس کے لیے وطن اصلی بن جائے گی۔

جیسا کہ ان کے کلام کے الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اذاانتقل من محل الاقامة الدائمة

اس صورت میں ان کی مذکورہ عبارت اور دیگر علماء کرام کی تحقیق کے درمیان کوئی تخالف نہیں پایا جائے گا کہ دیگر علماء کرام بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شہر میں مستقل رہائش رکھنے کا عزم کر لے تو وہ شہر اس کے لیے وطن اصلی بن جائے گا۔

امام بیہقی رحمہ اللہ علیہ نے سنن کبریٰ میں درج ذیل باب قائم فرمایا ہے۔

باب المسافر ينزل بشئى من ماله فيقصر مالم يجمع مكثا .

باب ایسے مسافر کے بیان میں جو اپنے مال (جائیداد) کے پاس اترے مگر نماز اس وقت تک قصر ادا کریگا جب تک وہاں مدت اقامت ٹھہرنے کا ارادہ نہ کرے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ عنوان سے ثابت ہوتا ہے کہ آئمہ شافعیہ کے نزدیک بھی کسی شخص کی کسی شہر میں ملکیتی جائیداد ہے اور وہ سفر کر کے اس شہر میں جاتا ہے تو وہ جب تک اس شہر میں مدت اقامت یا اس سے زائد ایام قیام کی نیت نہیں کرتا ہے تو اسے نماز قصر ادا کرنی ہوگی۔ کہ کسی شہر میں مجرد ملکیتی جائیداد کا ہونا اس شہر کے وطن اصلی بننے کا سبب نہیں ہوسکتا۔

صحیح مسلم وغیرہ میں حدیث مروی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے آخری دور میں جب مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تو نماز قصر کے بجائے پوری ادا فرماتے تھے بعض علماء کرام نے آپ کے اس عمل کی یہ تاویل کی تھی کہ منیٰ کے مقام پر ان کی ملکیتی زمین تھی اس لیے وہ مکہ مکرمہ میں نماز پوری پڑھتے تھے۔ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ اس تاویل کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ابطلوه بان ذالک لا يقتضیٰ الاتمام والاقامة . (شرح صحيح مسلم ج ۱ ص ۲۶۱)

یعنی علماء کرام نے اس کی تاویل کو اس لیے باطل قرار دیا ہے کہ کسی شہر میں ملکیتی زمین و جائیداد کا ہونا وطن اقامت بننے اور نماز کے اتمام کا سبب نہیں ہوتا۔

چنانچہ علامہ ابن ھمام حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی یہ تاویل مخدوش تھی اس لیے وہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمل کی مذکورہ تاویل کے بجائے ان الفاظ کیساتھ ایک دوسری تاویل فرماتے ہیں۔

لانه تأهل بمكة. (فتح القدير ج ۲ ص ۷)

یعنی حضرت عثمان مکہ مکرمہ میں نماز اس لیے پوری پڑھتے تھے کہ آپ نے وہاں شادی کی تھی اور آپ کی زوجہ وہاں رہائش پذیر تھیں۔

اس پر مسند امام احمد کی یہ روایت بطور دلیل پیش فرمائی ہے۔

انه صلى بمنىٰ اربع ركعات فانكر الناس عليه فقال ايها الناس ان تأهلت بمكة منذ قدمت وانى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من تأهل فى بلد فليصل صلاة المقيم. (فتح القدير ج ۲ ص ۷ مطبوعه مكتبه حبيبيه كوئٹه)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں چار رکعات پڑھیں۔ لوگوں نے ان پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا۔ اے لوگو میں نے مکہ میں آکر شادی کر لی ہے اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے جس نے کسی شہر میں شادی کی وہاں پوری نماز پڑھے۔

حضرت امام نووی اور حضرت علامہ ابن الھمام و دیگر علماء کرام رحمھم اللہ تعالیٰ کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمل کی مذکورہ تاویل کو پسند نہ کرنے بلکہ اس کو رد کرنے میں بھی اس بات کی دلیل ہے کہ کسی شہر میں مجرد ملکیتی زمین و جائیداد کا ہونا اس کے وطن اصلی یا وطن اقامت بننے کا سبب نہیں بن سکتا۔

اسلامی تعلیمات میں سرکاری عہدوں پر تقرری کی اہلیت

دین اسلام حقیقت اور عملیت پسند دین ہے اس لیے وہ کسی صورت میں بھی ایسے کسی نظریئے اور فکر کو پیش نہیں کرتا جو عقل، فطرت اور عدل کے اصولوں سے ٹکراتا ہو۔اسی لیے اسلام معاشی نظام میں درجات معیشت فطری تفاوت کو تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ بنیادی اہمیت دیتا ہے۔

اسلام کا عادلانہ نظام معیشت اس کا قائل نہیں کہ قوی وضعیف اور چست، لائق ونالائق، نکمے اور محنتی، ماہر وبے ہنر اور تجربہ کار واناڑی، معاشی سرگرمیوں میں تندی سے حصہ لے اور تماشہ بین سارے لوگوں کو ایک معاشی سطح پر رکھا جائے۔ اور انہیں مساوی معاوضہ وتنخواہ اور نفع کا حقدار سمجھا جائے بلکہ اسلام کا عادلانہ نظام اس کے برعکس یہ تصور پیش کرتا ہے کہ انسانوں کو چونکہ ذہنی صلاحیتیں اور استعدادیں بھی مختلف ہیں اور جسمانی توانائیاں اور قوتیں بھی۔ ان کے مزاج اور طبیعتوں میں بھی فرق ہے اور جذبات واحساسات میں بھی ان کے اغراض ومقاصد بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور انہیں حاصل کرنے کے انداز وطریقے بھی اس لیے ان کے اثرات و نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ان سعیکم لشتی (اللیل ۔ ۴)

درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں۔

اس لیے حق وانصاف کا یہ تقاضا ہے کہ لوگوں کی آمدنی، منافع اور اجرتوں میں کام کی نوعیت، کیفیت وکمیت کے اعتبار سے فرق ہو۔ اسلام عدل وحکمت کا نظام ہے جو تمام ملازمین کو یکساں تنخواہ اور سہولتیں فراہم کرنے کا ہرگز حامی نہیں۔ کیونکہ ایسا حکم

دینا یا ایسی تمنا کرنا عدل و انصاف اور حکمت و دانائی کے تقاضوں کے خلاف ہے۔
اسلام نے اجرتوں اور تنخواہوں میں تفاوت کے تصور کو رواج دے کر ملازمین اور محنت کش طبقے پر احسان فرمایا ہے کہ انہیں ان کی محنت کا پھل ان کی لیاقت، صلاحیت، قابلیت و استعداد اور محنت کو مدنظر رکھ کر دیا جانا چاہیے جس طرح تمام انسان برابر نہیں اسی طرح مختلف پیشوں، مختلف مقامات اور مختلف معاشی حالات میں کام کرنیوالے محنت کش اور ملازم بھی مختلف ہوتے ہیں ان میں سے کوئی کسی ایک فن کا ماہر ہے تو دوسرا کسی دوسرے فن کا ماہر ہے۔ مثلاً کوئی انجینئر، کوئی ڈاکٹر، کوئی معمار ہے اور کوئی اعلیٰ درجے کی ذہنی، عقلی لیاقت کا مالک ہے۔ مثلاً فقیہ، مفتی، قاضی، مدرس، پروفیسر، وکیل وغیرہ۔

اور کوئی صرف گارا مٹی اور ریت بجری اٹھانے والا یا سڑک کے کنارے روڑی کوٹنے والا ہے اسلیے اختلاف لیاقت، فن، پیشہ، حالات کے اعتبار سے ملازمین کی تنخواہ اور معاوضہ میں بھی فرق ہونا چاہیے۔ یہ کس قدر ناانصافی ہوگی کہ ایک طالبعلم جس نے اپنے عزیز و اقارب اور والدین سے دور رہ کر پردیس کی صعوبتیں اور مشقتیں اٹھا کر مسلسل شبانہ روز جدوجہد کے بعد انجینئر کی ڈگری حاصل کی ہو اس کی اور ایک ان پڑھ مزدور کی تنخواہ میں مساوات ہو۔

اس لیے حق و انصاف کا تقاضا ہے کہ لوگوں کی ذہنی، جسمانی صلاحیتوں اور محنت و عمل کی نوعیت کے مطابق ان کے معاوضے کا تعین ہونا چاہیے۔

قرآن میں ارشاد ہے:
ولکل درجات مما عملوا ولیو فی اعمالھم وھم لا یظلمون (احقاف ۱۹)
اور ہر ایک کیلئے درجہ بندیاں ہیں اپنے کیئے ہوئے کاموں کے مطابق تاکہ

ان کے کاموں کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

وہ اسباب جو معاوضہ میں تفاوت کا موجب بنتے ہیں ان میں نمایاں ترین تعلیم ومہارت ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ نے اجارے کی شرائط بیان کرتے ہوئے ایک شرط یہ ذکر کی ہے کہ اجیر ایسے کام پر اجارہ کرے جو کام اس کے سپرد کرنا ممکن اور مباح ہو اگر کمزور آدمی کو ایسے کام پر مقرر کیا جائے جو اس سے نہیں ہوسکتا تو یہ باطل ہے۔

(کیمیائے سعادت مترجم اردو ص ۲۷۹)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی عہدے یا منصب پر ایسے شخص کا تقرر ہونا چاہیے جو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے اس کا اہل ہو اور اگر وہ اس عہدے کا اہل نہیں تو یہ تقرری باطل ہوگی۔

چنانچہ علامہ ماوردی رحمہ اللہ تعالیٰ ''الاحکام السلطانیہ'' میں اسلامی ریاست کے امیر کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اس کے فرائض میں سے ایک یہ ہے کہ قابل اعتماد اہل لوگوں کو حاکم مقرر کرے۔

(الاحکام السلطانیہ مترجم ۲۹)

اسلام اسلامی ریاست کے سرکاری عہدوں پر تقرری کے لیے میرٹ کے اصول کا شدت کیساتھ حامی ہے کسی سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے خواہش مند شخص کے لیے میرٹ تو اس کے ذاتی اوصاف ہیں جن کی وجہ سے وہ ابتدائی معیار پر پورا اتر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ متعلقہ ادارے اور محکمے کو کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے اور اس کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس متعلقہ فن کا بھی ماہر ہو اور اس میں خصوصی ذوق وشغف رکھتا ہو اور اس کو سنبھالنے کی صلاحیت سے بہرور ہو۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف شعبوں کے لیے ہمیشہ ایسے صحابہ کرام کو مقرر فرمایا جو زیادہ اہلیت وصلاحیت رکھتے تھے اور خلفاء راشدین نے بھی اسی روایت پر عمل کیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے:

ولا تنظروا الیٰ صلوٰۃ امراءٍ ولا صیامه ولکن انظروا الیٰ صدق حدیثه اذا حدث والیٰ ورعه اذا استغنیٰ والیٰ امانته اذأتمن .

(تاریخ اسیرت عمر ابن جوزی ص۹۵)

کسی کے نماز روزے سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ دیکھو کہ بات کرتے وقت وہ سچ بولتا ہے یا جھوٹ۔ اس کا تقویٰ فراغت وامیری کے دور میں بھی قائم رہتا ہے یا نہیں اور یہ کہ جب امانت اس کے سپرد کی جاتی ہے خیانت نہیں کرتا۔

تقویٰ کے ساتھ ساتھ اسلام نے ملازمتوں کا میرٹ دو اہم چیزوں کو بنایا ہے ان میں سے ایک قوت اور دوسری صفت امانت ہے قوت میں انسان کی متعلقہ کاموں اور عہدوں کو سنبھالنے کے لیے ذہنی، جسمانی اور تکنیکی قوتیں، صلاحیتیں، استعدادیں، اہلیتیں اور مہارتیں شامل ہیں۔

اس کا جائزہ لینے کے لیے اسلامی ریاست کے اندر کوئی ادارہ قائم کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اسلامی ریاست میں کسی منصب پر تقرری کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس منصب کے اہل کی تلاش میں بڑی پرکھ اور جانچ ہونی چاہیے۔ اسلام تو روزمرہ کے لین دین میں بھی احتیاط برتنے کا حکم دیتا ہے۔ ہر آدمی سے بغیر پرکھ لین دین کو پسند نہیں کرتا۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ہر آدمی سے لین دین نہ کیا جائے بلکہ جو شخص لین دین کے لائق ہو اس کی تلاش کی جائے۔ (کیمیائے سعادت مترجم ص ۲۵۸)

اسلامی ریاست کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ریاست کے اندر بالخصوص اہم عہدوں پر پرہیزگار، دانشمند، تجربہ کار اور اہل لوگوں کا تقرر کرے کیونکہ عہدہ و منصب ایک امانت ہے اور منصب دار اس کا امین ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے حضور ابوذر غفاریؓ کے عہدے کی خواہش کے موقع پر فرمایا تھا:

یا ابا ذر انک ضعیف انها امانة. (مسلم)

اے ابوذر تم کمزور آدمی ہو اور منصب ایک امانت ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ان الله یأمرکم ان تودوا الامانات الیٰ اهلها. (النساء ۵۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو۔

قرآن کریم میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے مطالبے پر جب حضرت طالوت کو ان کا حکمران مقرر کیا تو ان کا ردعمل یہ تھا۔

قالوا انی یکون له الملک علینا و نحن احق بالملک منه ولم یؤت سعة من المال.

تو وہ کہنے لگے بھلا وہ ہم پر حکمران بننے کا کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں ہم حکمرانی و بادشاہی کے زیادہ مستحق ہیں وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں۔

ان کے اس ردعمل کا جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوں دیا:

قال ان الله اصطفه علیکم وزاده بسطة فی العلم والجسم. (البقره ۲۴۴)

نبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا اور اس کو علمی و جسمانی دونوں صلاحیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں۔

ان آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مناصب جلیلہ پر تقرری کے لیے ہمیشہ

اہل تر افراد کا انتخاب ہونا چاہیے۔ اسلامی ریاست میں سرکاری عہدوں کے لیے باصلاحیت، ذی استعداد، صاحب لیاقت افراد کا انتخاب اسلامی ریاست کے فرائض میں شامل ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں مکہ کے عامل حضرت نافع بن عبدالحارث آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا تم نے وادی والوں پر کس شخص کو عامل بنایا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ابن ابزیٰ کو۔ پھر پوچھا کہ وہ کون ہے؟ جواب ملا کہ وہ آزاد کردہ غلام ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ایک غلام کو ان پر عامل مقرر کر دیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ کتاب اللہ کے قاری و عالم ہیں اور ترکہ تقسیم کرنے کے فن میں بڑے ماہر ہیں۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا:

اما ان نبیکم ﷺ قد قال ان اللہ تعالیٰ یرفع بھٰذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین. (صحیح مسلم ج۲ ص ۲۰۱ مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۵۸۲)

ہاں ایسا کیوں نہ ہو۔ جب کہ تمہارے نبی ﷺ فرما چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کچھ لوگوں کو سربلند کرے گا اور کچھ کو گرا دے گا۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: جو شخص حکومت کی ذمہ داریوں کو مناسب صورت میں تقسیم نہیں کرتا وہ اللہ، رسول اور مسلمانوں کے حق میں اور ان کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ (کتاب الاموال از امام ابوعبید قاسم بن سلام ص ۴)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من استعمل رجلا من عصابة وفی تلک العصابة من ھو ارضی للہ منہ فقد خان اللہ و خان رسولہ و خان المومنین. (المستدرک للحاکم ج ۴ ص ۹۲ . ۹۳)

جس شخص نے (حکمران یا حاکم نے) ایک جماعت میں سے کسی شخص کو حاکم

مقرر کیا اور اس جماعت میں ایسا شخص موجود ہے جو اللہ کی نظر میں زیادہ پسند ہے تو ایسا تقرر کرنے والے شخص نے اللہ سے خیانت کی، رسول سے خیانت کی اور اہل ایمان سے خیانت کی۔

ایک دوسری حدیث پاک میں ہے:

من ولی من امر المسلمین شئیا فولیٰ رجلا وهو یجد من هو اصلح للمسلمین منه فقد خان الله ورسوله (السیاسة الشرعیه از ابن تیمیه ص ۹)

جس کسی کو مسلمانوں کا ذمہ دار بنایا گیا پس اس نے کسی ایسے شخص کی سرکاری عہدے پر تقرری کی حالانکہ اس کو مسلمانوں کے معاملات اس سے بہتر سلجھانے والا آدمی مل سکتا تھا تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کی خیانت کی۔

علامہ ابن تیمیہ رقمطراز ہیں:

فیجب علی ولی الامر ان یولی علیٰ کل عمل من اعمال المسلمین اصلح من یجده لذالک العمل. (السیاسة الشرعیه لابن تیمیه ص ۹)

حاکم پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کے کاموں میں سے ہر کام ایسے شخص کے سپرد کردے جس کو وہ اس کام کے لیے زیادہ موزوں پائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

فقد قال رسول الله صل الله علیه وآله وسلم من ولی من امر المسلمین شئیا فامر علیهم احدا محاباة فعلیه لعنة الله لا یقبل الله منه صرفا ولا عدلا حتیٰ یدخله جهنم . (المستدرک للحاکم ج۴ ص۱۰۵ رقم الحدیث ص ۷۰۲۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کو مسلمانوں کا ذمہ دار بنایا گیا پس اس نے ان پر کسی شخص کو باہمی محبت کی بنیاد پر امیر بنا دیا تو اس پر اللہ کی

لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے نہ تو فرض قبول کرے گا اور نہ نفل حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل فرمادے گا۔

اسلامی ریاست کے فرائض میں سے ہے کہ وہ سرکاری عہدوں پر تقرری اور ترقیاب کے لیے موزوں اور اہل افراد کا انتخاب کرے۔ اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور سفارش کو کوئی دخل نہ ہو۔

ایک حدیث پاک میں نااہل افراد کو مناصب تفویض کیے جانے کو علامات قیامت سے شمار کیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

اذ جاء اعرابی فقال متیٰ الساعة؟ قال اذ ضیعت الامانة فانتظر الساعة قال کیف اضاعتها؟ قال اذاوسد الامر الیٰ غیر اهله فانتظر الساعة

(رواہ البخاری مشکوٰۃ ص ۴۶۹)

ایک اعرابی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ قیامت کب ہوگی؟ آپ نے جواب میں فرمایا جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کر اس نے عرض کیا کہ امانت کو کیسے ضائع کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا جب زمام کار نااہل کے سپرد کی جائے تو قیامت کا انتظار کر۔

حضرت شاہ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے آخری حصے کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گفت وقتیے کہ سپرد شود کار دین از سلطنت و عمارت وقضا و امثال آں بنا اہل پس چشم دار قیامت راز یرا کہ چوں کار دین و دنیا در دست نااہل افتد لا جرم صلاح کار از دست برود فساد پیدا گردد و

حقوق ضائع شود.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کار دین یعنی سلطنت، قضا، امارت اوران کی مانند عہدے نااہل کے سپرد کیے جائیں تو قیامت کا انتظار کرلو کیونکہ دین و دنیا کے معاملات جب نااہل کے ہاتھ آئیں گے تو یقیناً معاملات کی درستگی ہاتھ سے نکل جائے گی اور فساد پیدا ہو جائے گا اور حقوق ضائع ہو جائیں گے۔

(اشعة اللمعات ج۴ ص ۳۳۲)

اس حدیث کی شرح میں حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ای لمن لم یوجد فیہ شرائط الاستحقاق کالنساء والصبیان، والجهلة والفسقة والبخیل والجبان ومن لم یکن قرشیا ولو کان من نسل سلاطین الزمان وھٰذا فی الخلیفة وقس علیٰ ھٰذا سائر اولی الامر والشان وارباب المناصب من التدریس والفتویٰ والامامة والخطابة وامثال ذالک.

(مرقاة ج۱۰ ص ۱۶۴)

حدیث پاک میں نااہل سے مراد وہ شخص ہے جس میں خلافت کے استحقاق کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں۔ جیسا کہ عورتیں، بچے جہلاء، فساق، بخیل، بزدل اور وہ شخص جو قرشی نہ ہو گرچہ وہ سلاطین زمانہ کی اولاد میں سے ہو یہ شرائط خلیفہ کے لیے ہیں اسی پر قیاس کیجئے۔ تمام صاحبان امر وشان اور ارباب مناصب کو مثلاً تدریس، فتویٰ، امامت وخطابت وغیرہ جلیل القدر مناصب۔

اسلامی نظام حکومت سرکاری عہدوں پر تقرری کے لیے **الامثل فالامثل** (خوب سے خوب تر) کے اصول کا حامی ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کی تقرری عمل میں لائی جائے جو معاشرے کے بہترین افراد ہوں اور اس کے برعکس صلاحیت واہلیت کے حامل افراد کو نظر انداز کرنا بدترین خیانت قرار دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

ایما رجل استعمل رجلا علی عشرۃ انفس علم ان فی العشرۃ افضل ممن استعمل فقد غش اللہ و غش رسولہ و غش جماعۃ المسلمین.

(کنز العمال ج۶ ص۹ رقم الحدیث ۱۴۶۴۹)

جس شخص نے دس افراد پر ایسے شخص کو عامل مقرر کیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ان دس افراد میں اس شخص سے بہتر فرد موجود ہے تو اس نے اللہ کی خیانت کی اس نے اللہ کے رسول کی خیانت کی اور اس نے مسلمانوں کی جماعت کی خیانت کی۔

اسلامی ریاست کے حکمران پر لازم ہے کہ وہ کسی عہدے پر تقرری کے وقت ذاتی پسند و ناپسند اور رشتہ داری و برادری وغیرہ اسباب کی بناء پر ترجیح سے کام نہ لے ایسے افراد کے لیے حدیث پاک میں شدید تہدید وارد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من ولی ذاقرابۃ محاباۃ وھو یجد خیر امنہ لم یجد رائحۃ الجنۃ.

(کنز العمال کتاب الامارۃ ج۱۶ رقم الحدیث ۱۴۶۴۸)

جس شخص نے باہمی محبت و دوستی کی بنیاد پر کسی قریبی شخص کو والی مقرر کیا حالانکہ اس سے بہتر شخص موجود تھا تو وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا۔

اسلامی ریاست پر واجب ہے کہ وہ ہر معاملے میں اپنی رعایا کی خیر خواہی سے کام لے ان پر حاکم مقرر کرنے میں ان کی خیر خواہی یہ ہے کہ بہتر فرد کی تقرری کی جائے۔ حدیث پاک میں مسلمانوں کے لیے جدوجہد اور خیر خواہی سے پیش نہ آنے والے حکمران کے لیے شدید وعید وارد ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے:

ما من امیر یلی امیر المسلمین ثم لا یجھد لھم وینصح الالم یدخل معھم الجنۃ

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ کنز العمال جز ۶ ص۸ رقم الحدیث ۱۴۶۴۰)

جو شخص مسلمانوں کا امیر بن جائے پھر وہ ان کے لیے کوشش نہ کرے اور خیر خواہی سے پیش نہ آئے وہ جنت میں ان کے ساتھ داخل نہیں ہوگا۔

اسلامی ریاست میں ہر شعبے، ہر مقام پر ہر شخص کو کام، تعلیم، ترقی کے تمام مواقع برابر ملنے چاہیے۔اس میں کسی رنگ و نسل اور صنعت و زبان کا لحاظ نہ رکھا جائے کسی قسم کی رکاوٹ، بے انصافی، بے جا سفارش، ذاتی تعلق، قرابت داری، دھاندلی، ذاتی پسند و ناپسند کو راہ نہ دی جائے بلکہ میرٹ کے اصول کی پابندی ہونی چاہیے۔

اسلامی ریاست میں ہر مسلمان کی صرف اور صرف اہلیت و صلاحیت کی بنیاد پر تقرری کے اور محنت و صلاحیت کے نتیجے میں ترقی کے یکساں مواقع میسر ہونے چاہیے۔تمام ترجیحات کو یکسر ختم کر کے صرف اہلیت اور محنت و امانت و دیانت کو حصول منصب اور ترقی کا واحد ذریعہ قرار دیا جانا چاہیے۔آج کل سرکاری عہدوں پر تقرری کے لیے صرف ڈگریوں کو دیکھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرکاری پالیسیوں میں کامیابیاں نہیں ہوتی ہیں۔

مدینہ منورہ میں جب اسلامی ریاست قائم ہوئی تو اس کے حکام اور ریاستی عہدیداروں کی تقرری کی اسلام پر پختہ عقیدے کے بعد اہم ترین شرط صلاحیت و لیاقت تھی۔ اور یہ اتنی اہم اور ہمہ گیر شرط تھی کہ اس کے سامنے سبقت اسلام اور خدمات دینی بھی ماند پڑ جاتی ہیں سبقت اسلامی یا دینی معلومات بذات خود اہم ترین خصوصیات ہیں اور دین و مذہب کے باب میں ان سے بہتر اور کوئی صفت شائد نہ ٹھہرے لیکن انتظام و انصرام میں انتظامی لیاقت، سیاسی تدبر، دنیاوی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور حالات و مواقع کی واقفیت وغیرہ زیادہ اہم تھی۔ اوران کی رعایت نبوی انتظامیہ میں ہمیشہ اور بھرپور کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ متاخر مسلمانوں اور نوجوان صحا

اکابر صحابہ اور سابقین کرام پر اکثر و بیشتر ترجیح دی گئی۔

یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت و تدبر تھا کہ آپ نے اکابر صحابہ کو انتظامی مشینری میں پوری طرح مدغم نہ کیا بلکہ ان کو مشیر و وزیر کے درجے میں رکھا۔ اس کی دو مصلحتیں تھیں۔

اول یہ کہ ان کی معاملہ فہمی، تدبر اور اصابت رائے سے فائدہ اٹھایا جائے۔

دوم یہ کہ انتظام و انصرام کی کبیدگی سے ان کو پاک وصاف رکھا جائے۔

تاکہ عوام میں اپنے عہدوں اور مناصب کے سبب آلودہ داماں نہ گردانے جائیں اور ان کے ساتھ احترام و عقیدت اور محبت کے جذبات قائم رہیں۔

یہی سبب ہے کہ نبوی انتظامیہ میں نوجوان اور پرجوش صحابہ کو اکابر صحابہ پر ہر شعبہ انتظام میں ترجیح دی گئی۔ علاقائی اور قبائلی رعایت بھی وجہ تقرری بن سکتی تھی۔ لیکن اس کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی، رشتہ داری، قرابت داری اور خاندانی تعلق نہ تو تقرری کی بنیاد بنتے تھے اور نہ ہی تقرری میں مانع تھے۔ حکومت نبوی کی اساس صلاحیت اور لیاقت کے اوصاف پر رکھی گئی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر شعبہ و محکمہ میں پوری طرح مثالی اور کامیاب ثابت ہوئی۔

مدینہ منورہ کی اس مثالی اور کامیاب ریاست کی دنیا بھر کے اسلامی ممالک کے لیے نمونہ تقلید ہے۔ آج بھی اگر سرکاری مناصب پر اہل اور دیانت اور صاحب لیاقت افراد کی تقرری عمل میں لائی جائے تو ریاست کے تمام شعبے اور محکمے اور ان کی پالیسیاں کامیاب ہوسکتی ہیں اور مسلمان دنیا میں کامیاب قوم کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا ترک کر دیا ہے اقرباء

پروری اور ذاتی پسند و ناپسند اور دیگر ترجیحات پر عمل پیرا ہیں۔

ہمارے فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی ریاست کا حکمران کسی منصب پر کسی نا اہل شخص کو مقرر کر دے تو اس کا یہ فعل صحیح نہ ہوگا۔

حضرت ابن نجیم الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ ''الاشباہ والنظائر'' میں رقمطراز ہیں۔

اذ ولی السلطان مدرسا لیس باھل لم تصح تولیته لما قدمناه من ان فعله مقید بالمصلحة ولا مصلحة فی تولیة غیر الاھل.

(الاشباہ والنظائر ص ۳۸۹ مطبوعہ بیروت)

جب سلطان وقت کسی شخص کو مدرس مقرر کرے اور اس میں تدریس کی اہلیت نہ ہو تو سلطان کا یہ فعل صحیح نہیں ہوگا کیونکہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ بادشاہ کا صرف وہ فعل درست ہوتا ہے جس میں کوئی مصلحت ہو اور جس میں کوئی مصلحت نہ ہو اس میں اس کا حکم باطل ہوتا ہے۔ نا اہل کو منصب تفویض کرنے میں کوئی مصلحت نہیں۔

ثابت ہوا کہ اسلامی ریاست میں کسی شخص کو کوئی عہدہ تفویض کرنے سے پہلے اسکی اہلیت و صلاحیت کی جانچ و پرکھ لازم ہے اور اگر کہیں کسی عہدے پر کسی نا اہل کو نصب کر دیا جائے تو یہ نصب و تقرری قطعاً نا جائز اور غیر صحیح ہوگی۔ اور اس عہدے سے نا اہل شخص کو بلا تاخیر معزول کر کے اہل آدمی کی تقرری عمل میں لائی جانی ضروری ہوگی۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے یک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانے میں ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے رتبے ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیئے جو نا اہل، کم ظرف، بد اخلاق، بددیانت اور بدکردار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی اس لیے ہمارا اسلام مسلمانوں کو ہدایت دیتا ہے کہ ذمہ داری کے

مناصب ان لوگوں کے سپرد کیے جائیں جو ان کے اہل ہوں۔

کسی عہدے پر تقرری کے لئے اہلیت کا جائزہ لینا جس طرح ریاست کی ذمہ داری ہے اس طرح وہ شخص جو کسی عہدے پر تقرری کا خواہشمند ہے وہ خود بھی منصفانہ طور پر اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرے کہ کیا وہ اس منصب کو سنبھال سکتا ہے یا نہیں اور کیا وہ اس عہدے کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے کہ نہیں اس بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ قول درخشندہ مثال کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس امر کے لیے مجھ سے زیادہ قوی کے ہوتے ہوئے میں مقدم کر دیا گیا ہوں تو مجھے اس کا والی بننے کی بنسبت اپنی گردن مار دیئے جانا زیادہ پسند ہوتا۔ (طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۷۵)

حدیث شریف میں اس شخص کے لیے شدید وعید وارد ہے جو بغیر اہلیت کسی عہدے پر فائز ہو جائے۔

من ولی عملا وھو یعلم انه لیس لذالک العمل اھل فلیتبؤا مقعدهٗ من النار. (کنز العمال جز ٦ کتاب الامارة ص ١٦ حدیث ١٤٧٤٦)

ترجمہ: جس شخص نے کسی ایسے کام کی ذمہ داری اٹھالی حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کام کی اہلیت نہیں رکھتا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنا لے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن حکیم میں ہے کہ ان کو عزیز مصر نے جیل خانہ سے نکالا اور ان سے گفتگو کی ان کی صلاحیتوں کو بھانپ کر اس نے کہا:

انک الیوم لدینا مکین امین (یوسف ۵۴)

ترجمہ: آپ ہمارے ہاں آج سے ذی عزت و معتمد ہیں۔

گویا ایک اعلیٰ سرکاری تنظیمی عہدے و منصب کی پیشکش تھی حضرت یوسف علیہ السلام کی نگاہ نبوت مستقبل کے سارے نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ آپ جانتے تھے کہ ملک پر ایک طوفانی قحط آنے والا ہے اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے کسی بہت بڑے مرد کامل، ذی شعور ناظم اعلیٰ، حوصلہ مند شخصیت کی ضرورت تھی۔ کنعان سے لے کر زندان تک ہر میدان میں ہر شخص، ہر تخت و تاج کو آزما چکے تھے۔ آپ کے سوا کوئی ایسا آدمی موجود نہ تھا جو آنے والے طوفانی قحط میں غریبوں کے حقوق میں انصاف کر سکے۔ مصیبت زدہ علاقوں اور قحط زدہ سلطنت کی ذمہ داری اٹھا سکے۔ تو آپ نے وزارت خوراک کے منصب کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔

قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم ۞ (یوسف ۵۵)

ترجمہ: (حضرت یوسف نے کہا) آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے۔

اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

ان یوسف طلب الولایة لانہ علم انہ لا احد یقوم مقامہ فی العدل والاصلاح وتوصیل الفقراء الیٰ حقوقھم. (قرطبی)

حضرت یوسف نے عہدے کی طلب اسلیے فرمائی کیونکہ آپ جانتے تھے کہ عدل و اصلاح اور غریبوں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے آپ کے سوا کوئی موجود نہیں۔

اسی آیت کے تحت تفسیر مظہری میں ہے:

انی حفیظ بمالا یستحقھا علیم بوجوہ مصالحھا. (مظہری)

ناجائز اخراجات سے حفاظت کر سکتا ہوں اور مفید و نفع بخش مقامات پر خرچ کرنے کے اصول سے اچھی طرح واقف ہوں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس منصب کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے

ہوئے گویا یہ فرمایا کہ میں مالی امور میں بڑی مہارت رکھتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ دولت کو نفع بخش، مفید مقاصد کے لیے کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے اور ناجائز و بے مقصد مصارف سے کیسے بچایا جاسکتا ہے۔

اسلامی ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے والے افراد قوم کے مسائل اور معاملات حل کرنے میں تساہل و کاہلی کے مرتکب نہیں ہوتے۔ وہ عوام کے معاملات کو الجھاتے نہیں بلکہ سلجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ریاست کے خزانے کو امانت سمجھ کر ہر قسم کی خیانت و بددیانتی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں اسلامی ریاست کی دولت کو ناجائز و بے مقصد مصارف سے بچاتے ہیں اور اپنے آپ کو قوم کے سردار نہیں بلکہ قوم کے خادم سمجھتے ہیں۔

عہد نبوی میں حضور ﷺ نے صوبوں کے جو گورنر مقرر کیے تھے ان کے ذمہ ملکی انتظام، فیصل مقدمات اور تحصیل خراج کے علاوہ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام اور سنن و فرائض کی تعلیم بھی تھی اس طرح وہ حاکم ہونے کے علاوہ مبلغ دین، معلم اخلاق بھی ہوتے تھے آج بھی وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو حرز جان اور جز و ایمان بنالیں۔ ہمارے افسران بالا اپنے آپ کو حاکم عوام نہیں بلکہ خادم عوام سمجھیں اور ان کے مسائل حل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ مزین اور ایئر کنڈیشنڈ دفاتر کے حصار سے نکل کر گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، اور گلی گلی جائیں اور ان کے مسائل و مشکلات دریافت کر کے ان کے حل کی تدبیریں کریں ان کے مسائل کو الجھانے کی نہیں بلکہ سلجھانے کی کوشش کریں اپنے دفاتر کے دروازوں پر دربان نہ بٹھائیں ان سے ملیں اور گھل مل کر ان کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کے منصبداروں کو قوم کیساتھ نرمی

کا برتاؤ کرنے کی ترغیب دی ہے اور ان پر ظلم کرنے والوں کے خلاف دعا فرمائی ہے۔

اللھم من ولی من امر امتی شئیا فشق علیھم فاشقق علیہ ومن ولی من امر امتی شئیا فرفق بھم فارفق بہ. (صحیح مسلم)

ترجمہ: اے اللہ جو میری امت کے کسی معاملے کا ذمہ دار ہوا اور اس نے میری امت پر سختی کی تو تو بھی اس پر سختی فرما اور جو شخص میری امت کے کسی معاملے کا ذمہ دار ہوا اور اس نے ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا تو تو بھی اس پر نرمی فرما۔

رسول اللہ ﷺ نے امت کو دھوکا دینے والے اور سیدھے راستے کی ہدایت نہ کرنے والے حکمرانوں کو جنت سے محرومی کی تہدید فرمائی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ یوم یموت وھو غاش رعیتہ الاحرم اللہ علیہ الجنۃ. (صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب ۵ صحیح بخاری کتاب الاحکام باب ۱)

ترجمہ: جس بندے کو اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کا ذمہ دار بنایا اور اس کی موت اپنی رعیت کیساتھ دھوکہ دینے کی حالت میں آئی تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام فرما دیتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے معاملات کی ذمہ داری اٹھانے والوں پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ امت کی اصلاح وفلاح کے لیے ہر امکانی کوشش کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم ینصح الا لم یدخل معھم الجنۃ. (صحیح مسلم کتاب الامارۃ)

ترجمہ: جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار ہو پھر ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے جان نہ لڑائے اور خیر خواہی کیساتھ پیش نہ آئے وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ:

اسلام کی نظر میں سرکاری ملازمت کے لیے اہم میرٹ دو چیزیں ہیں جن میں سے ایک قوت اور دوسری امانت ہے۔ اسلام ان دونوں صفات کو لازم وملزوم قرار دیتا ہے۔ اگر کسی کے پاس قوت تو ہے لیکن امانت داری نہیں تو وہ شعبہ جس کے لیے اس کا تقرر ہوا تھا تباہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی طرح امانتداری تو ہے لیکن صفت کی قوت نہیں پائی جاتی تو وہ شعبہ ترقی نہیں کر سکے گا۔

دونوں صورتوں میں وہ منصب وعہدہ بے مقصد و بے مصرف ہو کر رہ جائے گا۔ قرآن کریم نے ان دونوں صفات کو حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کے ذریعے بہت خوبصورت انداز میں اجاگر کیا ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ان دونوں صفات کو محسوس کر کے ملازم رکھ لینے کا مشورہ ان الفاظ میں دیا تھا۔

یا ابت استاجرہ ان خیر من استاجرت القوی الامین. (القصص ۲۶)

ابا جان! انہیں آپ ملازم رکھ لیجیے بے شک بہترین شخص جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو قوی اور امین ہو۔

معلوم ہوا کہ اچھا ملازم وہ ہے جس میں قوت جسمانی کے ساتھ امانت کا وصف بھی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

الخازن الامین الذی یودی ما امربہ طیبۃ نفسہ.

خازن امین وہ شخص ہے کہ اس کو جو کام سپرد کیا جائے اس کو نہایت خندہ پیشانی سے انجام دے۔

اس سے واضح ہوا کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے وہ جو عہدہ

اختیار کرنا چاہیں اس میں پوری طرح مہارت حاصل کریں۔تا کہ وہ اس ادارے کے ساتھ پورا انصاف کرسکیں اور اس کے کام کو بخوبی انجام دے سکیں۔

اسی لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔

ان اللہ یحب اذا عمل احدکم عملا ان یتقنہ

(بخاری ج ۱ ص ۳۰۱ مجمع الزوائد للھیثمی ص ۹۸ کنز العمال ج۳ ص۳۶۶)

یقیناً اللہ تعالیٰ یہ پسند فرماتا ہے کہ تم میں سے کوئی جب کسی کام کو اپنائے تو اس میں پوری مہارت حاصل کرے۔

ارشاد ہے: ان اللّٰہ تعالیٰ یحب من العامل اذا عمل ان یحسن .

(کنز العمال رقم الحدیث ۱۹۲۵ ص ۳۶۶)

بیشک اللہ تعالیٰ کام کرنے والے سے اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ جب وہ کام کرے تو اس کو بخوبی انجام دے۔

ایک حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کام کی مہارت حاصل کیے بغیر کام انجام دیتے ہوئے کام خراب کردے تو اس سے تاوان لیا جائے گا۔ارشاد ہے:

من طبب ولم یعلم منہ طب قبل ذالک فھو ضامن.(المستدرک سنن نسائی)

ترجمہ: جو شخص پہلے سے علاج کی مہارت حاصل کیے بغیر کسی کا علاج کردے اور اس کو نقصان پہنچے تو اس سے تاوان لیا جائے گا۔

اس حدیث پاک سے یہ بات بخوبی معلوم ہوئی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو کسی خاص کام کا ماہر ظاہر کرکے ملازمت حاصل کرے اور بعد میں معلوم ہوجائے کہ اس نے اس کام کی پوری مہارت حاصل نہیں کی تھی۔جعل سازی اور فریب سے

ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کے اناڑی اور نااہل ہونے کی وجہ سے وہ کام جو اس کے سپرد کیا گیا تھا بگڑ گیا ہے۔ تو ایسے شخص کو فوری طور پر معزول کر کے نقصان کا تاوان لیا جاسکتا ہے۔

ملازمت اجارہ کے تحت داخل ہے اور اجیر کی دو قسمیں ہیں: اجیر مشترک اور اجیر خاص اجیر مشترک کے عمل سے کوئی چیز ہلاک ہو جائے تو اس کا تاوان اس سے لیا جائیگا۔

(در مختار)

ویضمن ماهلک بعمله کتخریق الثوب من دقه.

(در مختار کتاب الاجارہ ج۵ ص۴۶)

اور اجیر مشترک کے عمل سے جو چیز ہلاک ہو جائے تو اس سے اس کا تاوان لیا جائے گا۔ جیسا کہ دھوبی کے کوٹنے سے کپڑے پھٹ جائیں۔

اور سرکاری ملازمت پر اجیر خاص کی تعریف صادق آتی ہے اور اجیر خاص وہ ہے جو کسی خاص وقت میں کسی ایک شخص کے کام کا پابند ہو اور اس وقت میں دوسرے کا کام نہ کر سکے اجیر خاص سے اگر کسی چیز کو نقصان پہنچ جائے تو اس چیز کا تاوان دینا نہیں پڑیگا۔ البتہ اگر وہ جان بوجھ کر کسی چیز کو نقصان پہنچائے تو اس سے تاوان لیا جائے گا۔

بحرالرائق میں ہے:

فلا یضمن ما تلف الا اذا تعمد الفساد فیضمن بالتعدی کالمودع.

(البحر الرائق کتاب الاجارۃ ج۸ ص۳۵)

کوئی چیز اجیر خاص کے ہاتھ میں ہلاک ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہ ہوگا۔ البتہ اگر اس نے قصداً اس شئے میں نقصان کیا ہے تو تعدّی کی وجہ سے اس سے تاوان لیا جائے گا۔ جیسا کہ مودع (امانت دار) کا حکم ہے (کہ اگر وہ قصداً امانت ضائع کرے تو تاوان لیا جائے گا ورنہ نہیں)۔

ثابت ہے کہ اگر کوئی ملازم مثلاً کسی مشین کو جسے وہ چلا رہا ہے کو قصداً خراب کر دے تو اس کو تاوان دینا واجب ہوگا۔

سرکاری ملازم پر مقرر وقت پر تسلیم نفس واجب ہے یعنی ڈیوٹی کے دوران حاضر رہنا لازم ہے۔ اگر جان بوجھ کر غیر حاضر رہے تو اسی قدر تنخواہ کا مستحق نہ رہے گا۔

مجلۃ الاحکام العدلیہ کی دفعہ ۴۲۵ میں ہے:

الاجیر الخاص من یستحق الاجرۃ اذا کان فی مدۃ الاجارۃ حاضراً للعمل ولا یشترط عمله بالفعل ولکن لیس له ان یمتنع من العمل واذا امتنع فلا یستحق الاجرۃ. (مجلۃ الاحکام العدلیۃ ص ۸۲)

اجیر خاص اجرت کا حقدار اس وقت بنے گا جب وہ مدت اجارہ میں کام کے لیے حاضر رہے۔ عمل بالفعل شرط نہیں لیکن اس کے لیے کام سے گریز کرنا جائز نہیں اور اگر کام سے گریز کرے تو اجرت کا حقدار نہ رہے گا۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اجیر خاص اگر اپنی مدت اجارہ مین کام کے لیے حاضر ہو تو اجرت کا مستحق ہوگا۔ اور اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ واقعۃً کام بھی کرے البتہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خود کام کرنے سے گریز نہ کرے اگر خود گریز کرے تو اجرت کا مستحق نہ ہوگا۔ گریز عام ہے خواہ کام کی صلاحیت موجود ہے مگر وہ کام نہیں کرتا یا وہ جس کام کے لیے ملازم بنا تھا اس کی اہلیت ہی اس میں نہیں پائی جاتی ہے ہر حال میں اس کے لیے اجرت حلال نہ رہے گی۔

حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ اجیر خاص کے بارے مین لکھتے ہیں:

مدرسین وامثالہم اجیر خاص ہیں اور اجیر خاص پر وقت مقررہ معہودہ میں تسلیم نفس لازم ہے اور اسی سے وہ اجرت کا مستحق ہوتا ہے اگر چہ کام نہ ہو مثلاً مدرس وقت

معہودہ پر مہینہ بھر برابر حاضر رہا اور طالب کوئی نہ تھا کہ سبق پڑھتا مدرس کی تنخواہ واجب ہوگئی ہاں اگر تسلیم نفس میں کمی کرے مثلاً بلا رخصت چلا گیا یا رخصت سے زیادہ دن لگائے یا مدرسہ کا وقت چھ گھنٹے تھا اس نے پانچ گھنٹے دیئے یا حاضر آیا لیکن مقرر خدمت مفوضہ کے سوا کسی اپنے ذاتی کام گرچہ نماز نفل یا دوسرے شخص کے کام میں صرف کیا کہ اس سے بھی تسلیم نفس منتقص ہوگئی یوں ہی اگر آتا اور خالی باتیں کرتا چلا جاتا ہے ،طلبہ کو پڑھاتا نہیں کہ اگرچہ اجرت کام کی نہیں تسلیم نفس کی ہے مگر یہ منع نفس ہے نہ کہ تسلیم ۔ بہرحال جس قدر تسلیم نفس میں کمی کی ہے اتنی تنخواہ وضع ہوگی ۔

(فتاویٰ رضویہ مطبوعہ کراچی ج۸ ص ۱۶۹)

ان تصریحات سے ظاہر ہوا کہ جو شخص اپنے مقررہ کام کو جان بوجھ کر انجام نہ دے تو اس کے لیے تنخواہ لینا حلال نہیں ہوگی جس قدر کام میں کوتاہی کرے گا اسی قدر تنخواہ ناجائز ہوگی ۔

☆☆☆

اسلام میں تحفظ نسب کی اہمیت

اسلام میں نسب کے تحفظ کی بڑی اہمیت ہے اسی لیے باپ کا اپنی اولاد کے نسب سے بلا وجہ انکار کرنا اور اولاد کا اپنے کو کسی دوسرے نسب کی طرف منسوب کرنا اپنی نسبی قومیت بدلنا اور اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور کو اپنا باپ قرار دینا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ادعوهم لا بائهم هو اقسط عندالله (الاية الاحزاب ۵)

انہیں ان کے حقیقی باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ اللہ کے نزدیک پورا انصاف یہی ہے اس آیت کریمہ کے تحت احکام القرآن للقرطبی میں ہے:

وارشد بقوله الى ان الاولىٰ والا عدل ان ينسب الرجل الى ابيه نسبا .
(تفسير قرطبی ج ۱۴ ص ۸۰)

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد پاک میں اسی بات کی رہنمائی فرمائی ہے کہ افضل اور اعلیٰ انصاف یہ ہے کہ انسان کو اس کے نسبی باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔

عصر حاضر کے معروف اسلامی سکالر اور عظیم محقق وفقیہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی فرماتے ہیں:

فالعدل يقضى والحق يوجب نسبة الابن الى ابيه الحقيقى لا لابيه المزور والاسلام دين الحق والعدل .

انصاف وحق کا تقاضا ہے کہ بیٹے کی نسبت اس کے حقیقی باپ کی طرف کی جائے نہ کہ فرضی باپ کی طرف، ہمارا اسلام حق وانصاف کا دین ہے۔

اس کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

والعنصر الغريب عن الاسرة ذكرا او انثىٰ لاينسجم معها قطعا فى خلق ولا دين و قد تقع مفاسد و منكرات عليه ومنه. (الفقه الاسلامى و ادلته ج ۳ ص ۶۷۴)

یعنی کسی خاندان میں اجنبی شخص داخل ہو جائے خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو اس کی اس خاندان سے اخلاقی اور بنیادی اعتبار سے قطعا موافقت نہیں ہو سکتی بسا اوقات اسے مفسدات و منکرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی اس کی وجہ سے خاندان میں پیچیدگیاں اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں خاندان کے افراد میں تلخیاں جنم لیتی ہیں اسلیے اسلام میں ان مفاسد سے بچنے کے لیے نسب کی تبدیلی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

پیر کرم شاہ صاحب الازہری رحمہ اللہ تعالیٰ اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں۔

آیت سے اپنے نسب کی حفاظت کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اس بات سے سختی سے روک دیا ہے کہ کوئی شخص دانستہ اپنے آپ کو کسی غیر کا بیٹا کہے۔ (ضیاء القرآن ج۴ ص۱۳)

تفہیم القرآن میں ہے:

اس آیت کے نزول کے بعد یہ بات حرام قرار دے دی گئی ہے کہ کوئی شخص اپنے حقیقی باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنا نسب منسوب کرے۔ (تفہیم القرآن ج۴ ص۷۰)

رسول اکرم ﷺ نے دانستہ اپنے نسب کو تبدیل کرنے اور اپنے حقیقی باپ کے نسب کے انکار کرنے اور اپنی نسبی قومیت سے انحراف کرنے والے کے لیے شدید وعید بیان فرمائی ہے اور اس کے اس عمل کو بدترین منکرات میں شمار فرمایا ہے جس کے نتیجہ میں آدمی خالق و مخلوق دونوں کی لعنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں کتب حدیث میں کئی احادیث صحیحہ منقول ہیں ان میں سے چند حدیثیں ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لیس من رجل ادعی لغیر ابیه وهو یعلمه الا کفر بالله و من ادعی قوما لیس له فیهم نسب فلیتبوٴ مقعده من النار (بخاری باب مناقب قریش ج ۱ ص ۴۹۸)

جس کسی نے اپنے باپ کے سوا کسی دوسرے کو اپنا باپ قرار دیا جبکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا باپ نہیں تو اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور جس نے اپنے آپ کو ایسی قوم کی طرف منسوب کیا جس کیساتھ اسکے نسب کا کوئی تعلق نہیں تھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے

اس حدیث پاک کی شرح میں عمدۃ القاری اور فتح الباری میں ہے۔

و فی الحدیث تحریم الانتفاء من النسب المعروف و الادعاء الی غیر ابیه

(عمدۃ القاری جز ۱۵ ص ۸۰ فتح الباری جلد ٦ ص ۵۴۱)

اس حدیث پاک میں نسب معروف کے انکار اور غیر باپ کی طرف انتساب کی حرمت کو بیان فرمایا گیا ہے۔

معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف منسوب کرنا اور اپنی نسبی قومیت بدلنا حرام ہے۔

۲۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کا ارشاد مروی ہے۔

من ادعیٰ ابا فی الاسلام غیر ابیه یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیهٗ حرام .

(بخاری ، سنن ابی دٔود ، ابن ماجه ، مسلم کتاب الایمان ترغیب ج ۴ ص ۱۴۳)

جس مسلمان نے اپنا نسب اپنے باپ کے علاوہ کسی اور شخص سے بیان کیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا باپ نہیں تو جنت اس پر حرام ہے۔

۳۔ حضرت سعد بن وقاص اور حضرت ابو بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔

من ادعی الی غیر ابیه و هو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام .

(بخاری ج ۲ مسلم کتاب الایمان ، ترغیب ج ۳ ص ۱۴۳)

جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا باپ نہیں تو اس پر جنت حرام ہے۔

۴: حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا

لا ترغبو عن آبائکم فمن رغب عن ابیہ فقد کفر .

(مسلم شریف کتاب الایمان ، ترغیب ج ۴ ص ۱۳۴)

اپنے آباء کے نسب کا انکار نہ کرو جس نے اپنے باپ کے نسب سے انکار کیا اس نے کفران نعمت کیا۔

۵: حضرت واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ان من اعظم الفری ان یدعی الرجل الی غیر ابیہ (بخاری ، کنز العمال ج ۱۶ ص ۱۷)

سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف نسبت کرے۔

۶۔ حضرت معاذ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

من العباد عباد لا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ ولا یزکیھم ، ولا ینظر الیھم ولھم عذاب عظیم المتبرّیء من والدیہ رغبۃ عنھما .

(رواہ الطبرانی فی الکبیر و الخرائیطی فی مساوی الاخلاق کنز العمال ج ۱۶ ص ۲۲)

اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کچھ بندے ایسے ہیں جن کیساتھ اللہ قیامت کے روز نہ کلام فرمائے گا اور نہ انہیں پاک فرمائے گا اور نہ ان کی طرف نگاہ رحمت فرمائے گا ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو اپنے والدین سے اعراض کرتے ہوئے ان سے تبری کرے۔ یعنی ان سے اپنے نسب کی برات کا اظہار کرے۔

۷۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ بخدا ہمارے پاس سوائے اس کتاب اللہ کے اور کوئی نیا قرآن نہیں جس کو ہم پڑھتے ہوں البتہ حضور نبی اکرم ﷺ کا ایک والا نامہ ہے جس میں چند احکام مذکور ہیں جس کو کھول کر سنایا اس میں منجملہ دیگر احکام کے ایک حکم یہ بھی تھا۔

من ادعی الی غیر ابیه او انتمی الی غیر موالیه فعلیه لعنة الله والملائكة والناس اجمعین لا یقبل الله منه یوم القیامة عدلا ولا صرفا

(بخاری، مسلم، ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، از ترغیب ج ۴ ص ۱۴۳)

جوشخص اپنے باپ کے سوا کسی دوسرے کی طرف اپنی نسبت کرے یا آزاد کردہ غلام اپنے آپ کو اپنے آقا کے قبیلے کے سوا اور قبیلہ کی طرف نسبت کرے تو اس پر اللہ کی لعنت اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی۔ اللہ قیامت کے دن اس کا نہ فرض قبول فرمائے گا اور نہ نفل۔

۸۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، روایت کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس من رجل ادعی الی غیر ابیه وهو یعلم الا کفر

(مسلم، ترغیب ج ۴ ص ۱۴۳)

ہروہ شخص جو اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا باپ قرار دے جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا باپ نہیں تو وہ نافرمانی و ناشکری کا مرتکب ہوا۔

۹۔ امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شعب ایمان میں حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من افری الفری من ادعی الی غیر والده (کنز العمال ج ۱۶ ص ۲۲)

سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ اپنے والد کے سوا کسی دوسرے شخص کے والد ہونے کا دعویٰ کرے۔

۱۰۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں رسول اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ولا یدع الی غیر ابیه فمن فعل ذالک فعلیه لعنة الله المتتابعة الی یوم القیامة

(ابن جریر، کنز العمال ج ۱۶ ص ۱۱)

کوئی شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف نسبت نہ کرے جو ایسا

کرے تو اس پر قیامت تک مسلسل اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

۱۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ تاجدار مدینہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ثلاثة لا یریحون رائحة الجنة رجل ادعی الی غیر ابیه

(التاریخ للخطیب کنز العمال ج ۱۶ ص ۱۴)

تین شخص جنت کی خوشبوں تک نہ پائینگے ان میں سے ایک وہ جو اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف نسبت کرے۔

۱۲۔ حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ روایت کرتے ہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

من ادعی نسبا لا یعرف کفر بالله او انتفیٰ من نسب و ان دق کفر بالله

(رواه الطبرانی فی الاوسط الترغیب ج ۴ ص ۱۴۵)

ترجمہ:۔ جو شخص ایسے نسب کا دعویٰ کرے جو اس کے لیے معروف نہیں تو اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی یا کسی نسب سے برات کا اظہار کرے اگر چہ وہ ادنیٰ نسب ہو تو اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔

۱۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

من ادعی الی غیر ابیه لم یرح رائحة الجنة و ان ریحها لیوجد من قدر سبعین عاما .

(مسند احمد ابن ماجه الترغیب ج ۴ ص ۱۴۴)

جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی دوسرے کی طرف نسبت کرے وہ جنت کی خوشبوں بھی نہ پائیگا حالانکہ اس کی خوشبوں ستر سال کی مسافت سے محسوس ہوتی ہے۔

۱۴۔ حضرت عمر بن شعیب اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

کفی بامری تبرؤ من نسب وان دق وادعاء نسب لا یعرف .

(مسند احمد ، طبرانی ، ترغیب ج ۴ ص ۱۴۴)

انسان کے گناہ کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ کسی نسب سے تبری کرے اگر چہ وہ

نسب ادنیٰ ہی ہو اور ایسے نسب کا دعویٰ کرے جس میں اس کا ہونا معروف نہ ہو۔

۱۵۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت:

من ادعیٰ الیٰ غیر ابیه او تولی غیر موالیه فعلیه لعنة الله والملائکة والناس اجمعین (احمد . ابن ماجه ، ابن حبان ، از ترغیب ج ۴ ص ۱۴۴)

۱۶۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

من ادعی الی غیر ابیه او انتمی الی غیر ابیه او انتمی الی غیر موالیه فعلیه لعنة الله المتتابعة الی یوم القیامة .(سنن ابی دائود . از ترغیب ۴ ص ۱۴۴)

ان مذکورہ تمام احادیث سے ثابت ہوا کہ دیدہ دانستہ اپنا نسب تبدیل کرنا گناہ کبیرہ اور حرام ہے۔

اسلامی تعلیمات میں اپنے نسب کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی تاکید ہے۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ:

تعلمو انسابکم ثم صلوا ارحامکم (الادب المفرد للبخاری ص ۴۲)

اپنے انساب کے بارے میں معلومات حاصل کرو پھر اس کے مطابق صلہ رحمی سے پیش آؤ۔

اسلام میں نسب کے تحفظ کی اہمیت کے پیش نظر مفکرین اسلام وفقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اسلامی ریاست کے بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے اسلامی ریاست میں ایک ایسے شعبے کے قیام پر شدید اصرار فرماتے ہیں جو لوگوں کے انساب کی نگرانی کا کام انجام دے اور رعایا کو اپنے انساب تبدیل کرنے سے باز رکھے۔ اور اس شعبے کے منتظم اعلیٰ کو ''نقیب الانساب'' کے عہدیدار سے موسوم کرتے ہیں۔

مشہور اسلامی مفکر حضرت امام ابوالحسن الماوردی رحمہ اللہ تعالیٰ نے الاحکام السلطانیہ کے آٹھویں باب میں نقیب الانساب کے تقرر اور اس کے فرائض پر تفصیلی بحث فرمائی ہے وہ فرماتے ہیں کہ نقیب الانساب کے ذمہ بارہ امور کی انجام دہی لازم ہے ان بارہ امور میں سے سرفہرست تین امور کا تذکرہ کیا ہے وہ یہ ہیں۔

جن لوگوں پر نقیب الانساب مقرر کیا جائے وہ ان کے نسب میں کسی کو داخل یا اس سے خارج نہ ہونے دے یعنی اس کے ذمہ خارج و داخل دونوں کی نگرانی ضروری ہے تا کہ انتساب غلط نہ ہو سب کا نسب صحیح رہے۔

تمام گھرانوں کے انساب سے بالتفصیل واقفیت رکھے کہ کوئی گھر اس سے مخفی نہ ہو نہ اسکو کسی کے سمجھنے میں گڑبڑ ہو ہر ایک کا نسب جدا جدا اپنے رجسٹر میں درج رکھے

ہر ایک کی پیدائش و موت قلمبند کرتا رہے تا کہ ہر بچے کا نسب محفوظ رہے کوئی دوسرا شخص میت کیساتھ اپنا فرضی نسب جتانے کی جرات نہ کر سکے۔

(الاحکام السلطانیہ مترجم اردو ص ۱۲۲ تا ص ۱۲۷)

شیخ التفسیر حضرت علامہ نقی احمد یار خان نعیمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

جب بیوی کو ماں سے تشبیہ دینے کو قرآن کریم نے بری بات اور جھوٹ قرار دیا ہے اور ان کی سخت سزا مقرر فرمائی ہے تو اپنے غیر باپ کو باپ کہنے والا بھی قرآن کے اس فتویٰ کی رو سے بڑا جھوٹا اور عذاب نار کا مستحق ہے۔

(الکلام المقبول فی فضیلۃ نسب الرسول ص ۲۱۔۲۲)

اسلام میں صیانت انساب کی اہمیت کے پیش علماء اسلام نے "علم الانساب" کے نام سے ایک مستقل فن ایجاد کیا اور اس موضوع پر بڑی علمی تحقیقی اور وقیع کتابیں تصنیف کیں۔ اسی موضوع پر تصنیف ہونے والی معروف کتاب

"سبائک الذہب فی معرفه انساب العرب" میں علم الانساب کی ضرورت کے تحت فاضل مصنف رقمطراز ہیں۔

منها التعارف بین النا س حتی لا یعتزی احد الی غیر آبائه ولا ینتسب الی سواء اجداده (ص ۵)

اس فن کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہوں تا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو اپنے باپ، دادا کے سوائی کسی دوسرے کی طرف انتساب نہ کرے۔

فقہاء اسلام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی غیر سید اپنے آپ کو آل نبی کی طرف منسوب کرے تو اسلامی عدالت ایسے شخص کو تعزیری سزا کے طور پر کوڑے مارے اور اس وقت تک جیل میں قید کر دے جب تک وہ توبہ نہیں کرتا۔

من انتسب الی آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم یضرب ضربا و جیعا و یشھّر و یحبس طویلا حتیٰ تظهر توبته لانه استخفاف بحق الرسول علیه الصلوٰة والسلام (معین الحکام ص ۱۹۲)

جو غیر سید اپنے آپ کو آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرے تو اس کو المناک کوڑے مارے جائیں اور اس کی تشہیر کی جائے اور اس کو طویل عرصہ تک قید کیا جائے حتیٰ کہ وہ توبہ کر لے کیونکہ اس کا یہ طرز عمل حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں استخفاف ہے

اور فتاویٰ کاملیہ میں ہے

ویعزر تعزیرا شدیدا و یحبس حتیٰ یظهر صلاحه
(الفتاوی الکاملیه ص ۲۶۵)

غیر سید آل بیت نبوت کی طرف منسوب ہونے والے کا حکم یہ ہے کہ اسے

شدید تعزیری سزا دی جائے اور وہ جب تک اپنی اصلاح نہیں کر لیتا قید کر دیا جائے۔

قرآن وسنت کی نصوص اور علماء اسلام کے مذکورہ اقوال سے یہ بات روز روشن کی مانند واضح ہوئی ہے کہ دانستہ اپنی نسبی قومیت بدلنا اور اپنے آپ کو اپنے باپ، دادا کے سوا کسی اور کیطرف منسوب کرنا گناہ کبیرہ اور حرام ہے اور کبیرہ کا مرتکب فاسق بن جاتا ہے۔ اور فاسق کے بارے میں فقہاء کرام کا فتویٰ ہے وہ جب تک توبہ نہیں کرتا اس کو امامت سے معزول کر دینا چاہیے کیونکہ فاسق کی امامت مکروہ تحریمی اور اس کی اقتداء میں ادا کی جانے والی نماز واجب الاعادہ ہے۔ ردالمحتار میں ہے:

واما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بانه لا يهتم لا مر دينه و بان في تقديمه للإمامة تعظيمه وقد وجب عليهم اهانته شرعا ... في شرح المنية على ان كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا .(رد المختار ج ا ص ۲۱۴)

اور علماء کرام نے فاسق کی امام کے مکروہ ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں احتیاط نہیں برتتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کو امام بنانے میں اس کی تعظیم ہے حالانکہ شرعا لوگوں پر اس کی اہانت واجب ہے۔۔۔ شرح منیہ میں ہے

فاسق کی امامت مکروہ تحریمی ہے اور اس کی وجہ وہی بیان کی ہے جس کو ہم نے ذکر کیا ہے

حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

فاسق شرعا واجب الاھانت ہے اس کی تعظیم حرام ہے یہاں تک زبان سے ذرا سی اس کی مدح پر حدیث کا ارشاد ہے:

اذا مدح الفاسق غضب الرب واهتز بذالک العرش

(مشکوۃ ص ۴۱۴)

جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو رب تبارک وتعالیٰ غضب فرماتا ہے اور عرش الٰہی لرز جاتا ہے۔

اسے امام بنانا تو اسکی اعلیٰ ترین تعظیم ہے ظاہر ہے کہ یہ گناہ وحرام ہے اور جو نماز کسی مکروہ تحریمی کے ساتھ ادا ہو تو واجب الاعادہ ہوتی ہے۔

کل صلوٰۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا

(در مختار مع رد المحتار جلد اول ص ۳۳۷)

اور فرماتے ہیں اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے یا تحریمی مگر تحریمی کی دلیل قوی ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک مختار یہی قول تحریم ہے۔

(الفتاویٰ المصطفویۃ ص ۱۸۵)

طحطاوی علی الدرر میں ہے۔

اما الفاسق الا علم فلا یقدم لان فی تقدیمہ تعظیمہ و قد وجب علیھم اھانتہ شرعا و مفاد ھذا کراھۃ التحریم فی تقدیمہ :

(بحوالہ الفتاویٰ المصطفویۃ ۱۸۵)

فاسق اعلم ہے تو بھی اس کو امام نہ بنایا جائے کیونکہ اس کو امام بنانے میں اس کی تعظیم ہے حالانکہ شرعا مسلمانوں پر اس کی اہانت واجب ہے (اس قول مذکور) سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆

اسلامی تعلیمات میں خواتین کا مقام

ہر انسان مرد وعورت اسلام کی نظر میں خدا کی مخلوق ہے جس کے برابر اور مساوی انسانی حقوق ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق تمام انسانوں کی زندگی بھی معزز اوران کی جان و مال اور عزت وآبرو بھی قابل احترام ہے۔

معلم کائنات، تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری سے قبل عورتوں کی حالت زار وزبوں تھی۔ دنیا میں ان کا کوئی معاشرتی وسماجی مقام نہیں تھا۔ ہر ماہ ان کے خاص ایام میں ان کو اس طرح دور رکھا جاتا تھا گویا نجس العین ہیں۔

اسلام کی روشنی پھیلنے سے پہلے دنیا میں عورتوں کو کہیں ان کے مردہ شوہروں کیساتھ زندہ جلا دیا جاتا اور کہیں بچیاں زندہ درگور کردی جاتی تھیں، کہیں عورت کو شیطان کہا جاتا، کہیں اس کو باغ انسانیت کا کانٹا تصور کیا جاتا تھا۔ موجودہ دور میں بھی اپنے آپ کو ترقی یافتہ اور مہذب سمجھنے والیں اور دنیا میں حقوق نسواں کے بارے میں شور مچانے والی قوموں میں عورت کے نام شوہروں کے ناموں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اوران کی انفرادی حیثیت صفر کے برابر ہو جاتی ہے۔

اسلام وہ مذہب ہے جس نے پہلی بار عورتوں کو ان کے شایان شان قانونی سیاسی سماجی معاشرتی حقوق دیکر انہیں حصہ دار بنایا۔ ماں کی حیثیت سے بیوی کی حیثیت سے، بیٹی کی حیثیت سے نیز بہن کی حیثیت سے ان کو وارث قرار دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی تعلیمات رحمت سے ایسا عظیم انقلاب برپا فرمایا کہ دنیا کی ٹھکرائی ہوئی عورت مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہوگئی۔ اور اس کے حقوق قیامت تک قائم ومحفوظ ہو گئے۔ زندہ درگور کی جانیوالی بچیاں ساری دنیا کی نگاہ میں

محبت وشفقت کا مرکز بن گئیں۔ خواتین اور بچوں کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفقت ورحمت کا یہ عالم ہے کہ آپ کا ارشاد ہے:

بسا اوقات میں نماز شروع کرتا ہوں اور یہ ارادہ کرتا ہوں کہ نماز لمبی پڑھاؤں مگر کسی بچے کے رونے کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے تو میں نماز کو مختصر کر دیتا ہوں کیونکہ بچے کے رونے اور اس کی ماں کی بے چینی پر جو نماز میں شامل ہے مجھے رحم آتا ہے۔ (مسلم ج ا ص ۱۸۸)

امام بخاری نے صحیح میں حضرت عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ مکہ میں ہم لوگ عورتوں کا بالکل ہیچ سمجھتے تھے۔ مدینہ میں نسبتاً ان کی قدر تھی لیکن جب اسلام آیا اور خدا نے ان کے متعلق آیات نازل کیں تو ہم کو ان کی قدر ومنزلت معلوم ہوئی۔

(صحیح بخاری ج ا ص ۷۶۹)

اب جاہلیت کی رسم دختر کشی پر نظر ڈال کر حضور علیہ السلام کے اس قول پر غور کیا جائے تو حضرت عمرؓ کے مذکورہ قول کی صحیح تشریح ہوگی:

"انجشہ دیکھنا یہ آبگینے ہیں"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف یہی نہیں کیا کہ عورتوں کے چند حقوق متعین کر دیئے بلکہ ان کو مردوں کے مساوی درجہ دیکر مکمل مساوات قائم کر دی۔ صحیح بخاری میں آپ کا ارشاد ہے۔

مرد اپنے اہل کا نگہبان بنایا گیا ہے اور اس سے ان کے متعلق جواب طلب کیا جائیگا اور عورت شوہر کے گھر کی نگہبان ہے اور اس سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۸۳)

سنن ابن ماجہ میں اس کی مزید تشریح ہے۔ تم کو عورتوں پر بجز مخصوص حقوق کے

کوئی دسترس حاصل نہیں ہے لیکن ہاں جب کوئی گناہ کریں۔

معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عطا فرمودہ نظام حیات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عورت کو بھی انسانیت کا ایسا اہم جزو قرار دیتا ہے جیسا کہ ایک مرد کو اور اس میں ویسی ہی روح کا وجود تسلیم کرتا ہے جیسی کہ مرد میں پائی جاتی ہے

سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عورت کو مردوں کی ذات کی طرح محترم قرار دیا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے:

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، آبرو اور مال حرام ہے۔

(بخاری و مسلم)

عورت کی آزاد حیثیت

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت کو جہاں یہ حق دیا ہے کہ وہ کسی درمیانی واسطے کے بغیر اپنی جائیداد میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتی ہے وہاں عورت کی زندگی کے سب سے اہم مسئلے "شادی" کے معاملے میں بھی عورت کی آزاد حیثیت کو قائم فرمایا اور یہ اعلان فرما دیا کہ اس کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہ کی جائے۔ نکاح کی صحت کے لیے اس کی رضامندی ضروری قرار دی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

کسی بیوہ کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے اور کسی کنواری کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہ کرو۔ کنواری کی رضامندی اس کی خاموشی ہے۔

(بخاری و مسلم)

نظام مصطفیٰ ﷺ میں عورت کی رضا مندی کی اس قدر اہمیت ہے کہ اگر نکاح کے بعد کوئی عورت یہ کہہ دے کے اس کا نکاح اس کی رضا مندی کے بغیر کیا گیا ہے تو اسے فسخ نکاح کا حق دیا گیا ہے۔

چنانچہ سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک جوان لڑکی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ اس کے باپ نے نکاح کر دیا ہے اور وہ اس نکاح کو پسند نہیں کرتی ہے۔ حضور ﷺ نے اسے اختیار دیا یعنی چاہے تو اس نکاح کو جائز قرار دے یا رد کر دے۔ (سنن ابی داؤد)

علیحدگی کا حق

اسلام سے قبل اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے آزادی کی طالب ہوتی تو وہ ناجائز اور غلط طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہوتی تھی خاوند کو اس پر کلی اختیار تھا اور وہ اس کے بالکل تابع فرمان تھی کیونکہ نہ ملکی قانون میں طلاق کی اجازت تھی اور نہ مروجہ ضابطہ اس کو اپنے خاوند سے علیحدگی کی اجازت دینے کا مجاز تھا۔

مگر رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات میں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے خاوند سے ایسی نفرت پیدا ہو جائے کہ ان کے درمیان صلح کی کوئی توقع نہ کیجا سکے اور اس قدر خطرہ ہو جائے کہ گر یہ نکاح کے بندھن میں بندھے رہے تو طرح طرح کی معصیتوں میں مبتلا ہو جائیں گے تو اس صورت میں عورت حاکم کے سامنے حق خلع کا مطالبہ کر کے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پاک مروی ہے کہ:

جمیلہؓ بنت عبداللہ نے جو ثابتؓ بن قیس کے نکاح میں تھی بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی میں اور ثابتؓ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے میرا سر اور اس کا سر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتا (اس نفرت کی بجز اس کے کوئی وجہ نہ تھی کہ انکو ان کی شکل پسند نہ تھی)۔

حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم وہ باغ واپس کرنے کے لیے تیار ہو جو ثابت نے تم کو مہر میں دیا ہے۔ جمیلہ نے کہا ہاں وہ بھی اور کچھ اور بھی دینے کو تیار ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ باغ حضرت ثابت کو واپس کر دیا اور ان میں تفریق کر دی۔

حصول علم کا حق:

معلم اعظم ﷺ نے ایسے دور میں ساری انسانیت کے لیے علم کی اہمیت پر زور دیا جب دنیا میں ہر طرف جہالت اور تاریکی کا دور تھا۔ آپ نے علم کو محض ایک مخصوص طبقے کا حق قرار نہیں دیا بلکہ اس کو تمام انسانوں کے لیے ناگزیر ضرورت بتایا اور تمام مسلمانوں کے لیے اس کا حصول ضروری قرار دیا آپ ﷺ کا ارشاد ہے؛

ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔

چنانچہ آپ کی اس تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ بہت ساری صحابیات اسلامی علوم یعنی تفسیر، قرات، حدیث، فقہ اور فرائض میں کمال مہارت رکھتی تھیں۔

اور اسلام کے ابتدائی دور سے ہی کئی خواتین لکھنا جانتی تھیں شفاء بنت عبداللہ کو اس میں خاص طور پر شہرت حاصل تھی جنہوں نے آغاز اسلام سے ہی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ شفاء کے علاوہ حضرت حفصہ، ام کلثوم بنت عقبہ اور مریم بنت المقداد بھی لکھنا جانتی تھیں۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۱۷۷)

سیاسی حقوق

رسول کریم ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں مسلم خاتون کے سیاسی اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ وہ دشمنوں کو پناہ دے سکتی ہے اور امام اس کے امان کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ سنن ابی داؤد میں ہے۔ فتح مکہ کے زمانے میں حضرت ام ہانیؓ جو حضرت علیؓ کی ہمشیرہ تھیں نے ایک مشرک کو پناہ دی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

تم نے جس کو پناہ یا امن دی ہم نے بھی دی۔ (ابوداؤد ص ۲۷۴)

جائیداد کے حقوق

جائیداد و مال کے حق میں اسلام نے عورتوں اور مردوں میں مساوات کو ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ عورت اپنی جائیداد خرید و فروخت کرے یا اپنی احتیاجات پوری کرنے میں استعمال کرے ان تمام معاملات میں عورت کو مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

مردوں کیلئے بھی حصہ ہے اس چیز میں جس کو ماں باپ اور نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں جس کو ماں باپ اور بہت قریب کے رشتہ دار چھوڑ جائیں۔ (القرآن)

نقل و حرکت کا حق

اسلام عورت کو محنت وکسب روزی اور نقل وحرکت کا مکمل حق دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں اور عورتوں کیلیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں۔ (القرآن)

صدر اول میں جب کوئی حقیقی ضرورت ہوتی تھی مسلمان عورتیں گھروں سے باہر کام کرتی تھیں اسی طرح اسلام عورتوں کو سماجی اداروں مثلاً تعلیم نسواں کے ادارے نرسنگ اور عورتوں کے طبی امداد کے مراکز میں کام کرنے سے بھی نہیں روکتا بلکہ اگر ضرورت ہو تو ہنگامی حالات میں جس طرح مردوں کی خدمات حکومت مستعار لے لیتی ہے اسی طرح ان کی خدمات کو بھی ان مقاصد کے لیے مستعار لے سکتی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی عورت بالکل ہی بے سہارا ہو اور کوئی مرد موجود نہ ہو تو وہ عورت شرعی پردے کی حدود میں روزی کمانے کے لیے بھی گھر سے باہر جا سکتی ہے۔ مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام عورت کو گھر چھوڑنے کی اجازت صرف اسی صورت میں دیتا ہے جب کوئی واقعی ضرورت یا مجبوری لاحق ہو اس کے بغیر اور چارہ ہی نہ رہے۔

رائے اور مشورے کا حق

رسول اکرم ﷺ کا عام اسوہ اور طریق عمل یہ تھا کہ آپ ﷺ مشورہ کیا کرتے تھے۔ جس طرح مردوں سے مشورہ لیتے اسی طرح عورتوں سے بھی مشورہ لیتے تھے ان کی مفید رائے کو اختیار فرماتے تھے۔ چنانچہ حسن بصری حضور ﷺ کے اس اسوہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نبی اکرم ﷺ مشورہ کرتے تھے یہاں تک کہ عورت سے بھی اور وہ کبھی ایسی

رائے دیتی کہ جسے آپ اختیار فرماتے ۔ (عیون الاخبار لابن قتیبہ ج ا ص ۲)

یہ رتبہ بلند:

صحیح بخاری و مسلم میں ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ حسن صحبت یعنی احسان کا مستحق کون ہے؟ ارشاد فرمایا:

تمہاری ماں یعنی ماں کا حق سب سے زیادہ ہے انہوں نے پوچھا پھر کون؟ حضور ﷺ نے پھر فرمایا ماں ۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر کون ارشاد فرمایا تمہارا والد اور ایک روایت میں ہے کہ سب سے زیادہ مستحق ماں ہے پھر ماں پھر باپ ہے ۔ پھر جو زیادہ قریب پھر جو زیادہ قریب ہے یعنی احسان کرنے میں ماں کا مرتبہ باپ سے بھی بلند ہے۔

امام احمد نسائی و بیہقی نے روایت کی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ارشاد فرمایا تیری ماں ہے عرض کی ہاں فرمایا اس کی خدمت اپنے پر لازم کر کہ جنت اس کے قدم کے پاس ہے۔

ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے ایک بڑا گناہ کیا ہے آیا میری توبہ قبول ہوگی؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے عرض کی نہیں فرمایا تیری کوئی خالہ زندہ ہے عرض کی ہاں فرمایا اس کے ساتھ احسان کر۔

بچیوں کے متعلق ارشادات نبوت

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہتی ہیں ایک عورت اپنی دو لڑکیاں لے کے میرے پاس آئی اور اس نے مجھ سے کچھ مانگا میرے پاس صرف ایک کھجور کے سوا کچھ نہ تھا میں نے وہی دے دی اس عورت نے وہ کھجور تقسیم کر کے ان دونوں لڑکیوں کو دے دی اور خود نہیں کھائی جب وہ چلی گئی تو نبی کریم ﷺ تشریف لائے میں نے یہ واقعہ بیان کیا حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کو خدا نے لڑکیاں دی ہوں اگر وہ ان کے ساتھ احسان کرے تو وہ لڑکیاں جہنم کی آگ سے اس کے لیے روک ہو جائیں گی۔

صحیح مسلم میں حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کی عیال (پرورش) میں دو لڑکیاں بلوغ تک رہیں وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ میں اور وہ پاس ہوں گے اور آپ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر فرمایا اس طرح۔

ابو داؤد نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس کی لڑکی ہو وہ اسے زندہ درگور نہ کرے اور اس کی توہین نہ کرے اور اولاد نرینہ کو اس پر ترجیح نہ دے اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔

نگاہ نبوت میں عورت کا مقام بحیثیت بیوی کے

مسلم ونسائی نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا دنیا متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع عورت ہے رسول ﷺ کی ایک دوسری حدیث ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے نیک بی بی نصیب کی اس کے نصف دین پر اعانت فرمائی تو

نصف باقی میں سے اللہ سے ڈرے (تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرے)

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو مال دے تو وہ خود اپنے اور اپنے گھر والوں پر خرچ کرے۔

عورت کی عائلی زندگی

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات مرد و عورت کے درمیان حمیت، افہام و تفہیم اور مستقل ہمدردی کو عائلی زندگی کی اساس قرار دیتی ہیں۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے۔ (ترمذی)

اس ارشاد میں گویا حضور ﷺ نے آدمی کے اخلاق کو ناپنے کے لیے جو پیمانہ مقرر کیا ہے وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک ہے۔

آزادی کی نعمت

مصطفیٰ منفلوطی مصری کی کتاب النظرات کے ایک باب ''الحریۃ'' کا اردو ترجمہ

ایک دن فجر کے وقت ایک بلی کی آواز پر بیدار ہوا جو میرے بستر کی ایک جانب غرارہی تھی اور عجیب وغریب طرح سے چمٹ رہی تھی۔ مجھے اس کے اس حال نے بے قرار اور رنجیدہ کر دیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ شاید یہ بلی بھوکی ہو گی جلدی سے اٹھا اور اس کے سامنے کھانا لا کر رکھ دیا مگر اس نے کھانے پر منہ تک نہ لگایا۔ پھر مجھے خیال آیا شاید یہ پیاسی ہو گی میں اس کو پانی کے پاس لے گیا مگر اس نے پانی کی بھی پرواہ تک نہ کی بلکہ وہ مجھے ایسی نگاہوں سے گھور کر دیکھنے لگی جو اس کے باطن میں پوشیدہ دکھوں اور غموں کی غمازی کر رہیں تھیں۔ اس کے اس منظر نے میرے باطن میں شدید قسم کا اثر پیدا کیا اور میں تمنا کرنے لگا کہ کاش میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح حیوانات کی بولیاں سمجھتا تا کہ میں اس بلی کی ضرورت معلوم کر لیتا اور اس کو درد و کرب سے نجات دلاتا۔

میرے کمرے کا دروازہ بند تھا میں نے دیکھا کہ بلی بار بار اپنی نگاہیں دروازے کی جانب بلند کر رہی ہے جب بھی مجھے دروازے کی طرف جاتے دیکھتی تو میرے ساتھ چمٹ پڑتی تھی۔ جس کی وجہ سے میں اس کے مقصد کو بھانپ گیا کہ وہ چاہتی ہے کہ میں کمرے کا دروازہ کھول دوں میں جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا اور اسے کھول دیا۔ جونہی اس کی نگاہ کھلی فضا اور آسمان پر پڑی اس کا حال رنج وغم حسن حال وسرور میں تبدیل ہو گیا اور وہ دوڑنے لگ گئی۔ میں واپس بستر پر آ کر سر پکڑ کے اس بلی کے بارے میں سوچنے اور اس کے معاملے میں استعجاب کرنے لگا کہ کیا یہ بلی

بھی آزادی کے مفہوم سے آشناء ہے کہ جس کے حصول کی وجہ سے فرحت و مسرت کا اظہار کررہی ہے۔ ہاں ہاں یقیناً وہ آزادی وحریت کے مطلب کو خوب سمجھتی ہے کیونکہ اس کا حزن وملال اور چیخنا وچلانا اور کھانے پینے سے باز رہنا اسی آزادی کے حصول کی خاطر تو تھا اور اس کا تضرع و عاجزی اور اس کا ڈرنا اور چمٹنا اسی آزادی وحریت تک رسائی کی کوشس ہی تو تھی۔

اس وقت مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ بہت سارے ظلم واستبداد کے اسیر انسان آزادی کا اتنا بھی شعور نہیں رکھتے جتنا شعور کمرے میں بند بلی اور شکاری کے جال اور پنجرے میں جکڑا ہوا وحشی جانور اور قید و بند کی صعوبتوں سے پر کٹا ہوا پرندہ رکھتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات ان بے زبان حیوانات میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو اسیری سے خلاصی کی فکر اور جس مصیبت میں گرفتار ہیں اس سے نجات کی راہ تلاش کرتے ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ ان ظلم واستبداد کے اسیر انسانوں میں کچھ ایسے بھی افراد ہیں جو اس قید و بند میں رہنے کے متمنی اور خواہش مند ہوتے ہیں اور اس اسیری سے مانوس اور اس کی صعوبتوں وتکلیفوں سے لذت وسرور محسوس کرتے ہیں۔

وہ مسائل کہ جن کے حل میں انسانی عقل دنگ ہے ان میں سے مشکل ترین مسئلہ یہ ہے کہ بے زبان حیوان آزادی، حریت کے بارے میں حیوان ناطق سے وسیع میدان رکھتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ کیا انسان کا ناطق ہونا اس کیلئے نحوست وبدبختی کا باعث تو نہیں؟

کیا انسان کے لیے یہ اچھا نہیں کہ وہ اپنے لیے گنگنے پن اور حماقت کی تمنا کرے تاکہ وہ حریت کی سعادت مندی سے بہرہ مند ہو جیسا کہ وہ ناطق اور مدرک

بننے سے قبل اس سعادت سے بہرہ مند تھا۔

ذرا غور کریں؟ کہ پرندہ فضاء میں آزادی سے چکر لگا تا ہے اور مچھلی بغیر کسی روک ٹوک کے سمندر میں تیرتی ہے اور وحشی جانور وادیوں اور پہاڑوں میں آزادی کے ساتھ پھرتا رہتا ہے مگر انسان ہی ایک ایسی شئے ہے جو مہد سے لے کر لحد تک دو جیلخانوں کا قیدی بن کر زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایک تو اپنے نفس کا جیلخانہ اور دوسرا اس کی حکومت کا قائم کردہ جیلخانہ ہے۔

طاقتور انسان نے کمزور انسان کے لیے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ایجاد کیں اور پھر کبھی ان کا نام ناموس رکھا اور کبھی قانون تا کہ وہ کمزور پر عدل کے نام پر ظلم کرتا رہے اور ناموس ونظام کے نام پر اس کی آزادی سلب کرتا رہے اور یہ خوفناک آلات ایجاد کر کے کمزور انسان کو ایسی بے چینی اور خوف میں مبتلا کر دیا کہ جس کی وجہ سے اس نے اپنی ہی ذات پر اپنی ہی جانب سے ایک ایسا پہرہ دار مقرر کیا ہوا ہے جو اس کے ہاتھوں کی حرکات اور پاؤں کے نشانات اور زبان کے نطق وسکوت اور وہم وخیال کے خطرات کی نگہبانی کرتا ہے تا کہ وہ اس ظالم کے ظلم اور سزا سے نجات پا سکے۔

افسوس جیل خانے میں وہ محبوس ہے اس سے زیادہ تنگ کوئی جیل خانہ ہو سکتا ہے؟

ظالم کا گناہ صرف اتنا ہی نہیں کہ اس نے قیدی کی آزادی چھین لی ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا گناہ تو یہ ہے کہ اس نے قیدی کا وجدان بھی فاسد کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ آزادی سے محروم ہونے کے باوجود رنجیدہ خاطر بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی اس نے آزادی کے فقدان پر کبھی کوئی آنسو بہایا۔ اگر اسیر انسان اپنی سلب شدہ حریت کی قدر جانتا اور ان پابندیوں کی حقیقت کا ادراک رکھتا جنہوں نے اس کے جسم وعقل کا گھیراؤ کیا ہوا ہے تو وہ اس طرح خودکشی کرتا جس طرح شکاری کے پنجرے میں محبوس بلبل خود

کشی کیا کرتا ہے۔

اور یہ خودکشی اس کے لیے اس حیات سے بہتر ہے جس حیات میں آزادی کی کرنوں سے کوئی کرن نہ پائی جاتی ہو اور نہ ہی حریت کے جھونکوں میں سے کسی جھونکے کی رسائی ہوتی ہو۔

انسان اپنی پیدائش کے ابتدائی دور میں بغیر لباس کے ننگا چلتا پھرتا تھا پھر عرصہ بعد ایک ایسا کھلا لباس زیب تن کرنے لگا جس کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک سائبان ہے جو اس کو گرمی کی لو اور مخالف سمتوں سے چلنے والی ہواؤں سے بچا رہا ہے پھر اس کے کچھ عرصہ بعد لوگوں نے اس لباس کو ایسے اتار کر گہوارے میں رکھ دیا اور اس لباس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ ملبوسات کا نظام ایسا ہی ہوتا ہے۔

اور اس ابتدائی دور میں انسان جو چاہتا کھاتا پیتا مگر کچھ عرصہ بعد لوگوں نے ان اشیاء اور اس کے درمیان رکاوٹ ڈال دی اور اس کے دل میں موت و بیماری کا خوف بھر دیا اس پر کھانے، پینے کے لیے ڈاکٹر اور طبیب کی اجازت بولنے اور دیکھنے کیلیے مذہبی رہبر اور سیاسی حاکم کی رضا اور اٹھنے، بیٹھنے، چلنے، پھرنے، ٹھہرنے حرکت، کرنے اور سکون اختیار کرنے کے لیے عادات و اصطلاحات کے قواعد کے تقاضے پر عمل پیرا ہونے کی پابندی عائد کر دی۔

انسان کے لیے سعادتمندی کی راہ سوائے ایسی آزادی کے نہیں جس میں انسان کے جسم و عقل اور روح وجدان اور فکر پر سوائے آداب نفس کے کسی دوسرے کا جبر و تسلط نہ ہو۔

حریت تو ایسا آفتاب ماہتاب ہے جس کا ہر نفس میں طلوع ہونا ضروری ہے جو

اس سے محروم زندگی بسر کر رہا ہے درحقیقت اس کی زندگی ایسی تاریکی میں بیت رہی ہے جسکا ایک کنارہ شکم مادر کی تاریکی کے ساتھ اور دوسرا کنارہ قبر کی تاریکی کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

آزادی تو حیات ہے۔ اگر آزادی میسر نہ ہو تو انسانی زندگی اس کھلونے کی مانند ہوتی ہے جو بچوں کے ہاتھوں میں مصنوعی حرکت دینے سے متحرک ہو جاتا ہے آزادی انسان کی تاریخ میں کوئی جدید و حادثاتی اور اجنبی و عارضی شئے نہیں بلکہ یہ تو انسانی فطرت میں اس وقت سے داخل ہے جب وہ غیر مہذب و وحشی تھا چٹانوں پر چڑھتا اور درختوں کی ٹہنیوں سے چمٹا کرتا تھا۔

وہ انسان جو اپنی آزادی طلب کرنیکے لیے ہاتھ بلند کر رہا ہے وہ نہ تو کسی کے سامنے دست سوال دراز کر رہا ہے نہ کوئی انوکھی شئے طلب کر رہا ہے بلکہ وہ تو اپنے ان حقوق میں سے ایک حق طلب کر رہا ہے جن کو انسانی حرص ولالچ نے سلب کیا ہوا ہے

اگر وہ اپنی اسی آزادی کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ نہ اس پر کسی کا احسان ہے نہ یہ کہ کسی کی جانب سے اس پر انعام بلکہ یہ اس کا اپنا حق تھا جس کو اس نے بزور بازو حاصل کیا۔

درگاہ حضرت بل کا محاصرہ اور موئے مبارک کا تقدس

تحریک آزادی کشمیر کا آغاز 13 جولائی 1930 کو سری نگر کے مقام پر اس وقت ہوا جب صوبہ سرحد سے عبدالقدیر نامی ایک شخص وہاں پر گیا۔ ان دنوں وہاں پر توہین قرآن حکیم کے خلاف تحریک چل رہی تھی، احتجاج اور مظاہرے ہو رہے تھے۔ عبدالقدیر خان نے مظاہرین سے کہا آپ تقریریں اور قرداد یں پیش کر رہے ہیں۔ ان باتوں سے کچھ نہیں ہوگا آپ کو عمل کی دنیا میں آنا پڑے گا۔ عبدالقدیر خان کو جرم حق گوئی میں گرفتار کر دیا گیا جس روز اس کے مقدمے کی تاریخ تھی کشمیر کے لاتعداد مسلمان اپنے اس محسن کے دیدار کے لیے اُمڈ پڑے۔ جب ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو موذن اذان دینے لگا جوں ہی اس نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی ڈوگرہ کے سپاہیوں نے اس کے سینے میں گولی پیوست کر دی وہ شہید ہو کر گر پڑا۔ جہاں اس نے اذان چھوڑی تھی دوسرا مسلمان نوجوان اٹھا اس نے وہاں سے اذان شروع کر دی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ بائیس مسلمان شہید ہوئے تب اذان مکمل ہوئی، اس تاریخی حقیقت سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں یہ آزادی کا کارواں 1930ء سے چل رہا ہے یہ نصف صدی سے زائد کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ کشمیری مسلمان اتنے طویل عرصہ سے اپنی آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں اور بالخصوص گزشتہ چار برسوں سے کشمیری نوجوانوں نے بھارتی فوج کی ظالمانہ کاروائی کا جواب دینے کے لیے بندوق اٹھا لی ہے اور صدیوں کی غلامی، ظلم و ستم اور محکومیت سے نجات کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کر رہے ہیں آج پوری وادی کشمیر آزادی کے نعروں سے گونج رہی ہے کشمیری مسلمانوں نے اپنی آزادی کے لیے جو مظالم برداشت کیئے ہیں۔ ان کی مثال نہیں ملتی پچاس سے ستر ہزار کشمیری آزادی کی راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں ساٹھ ہزار سے

زائد لوگ ہندوستان کے طول وعرض میں بغیر کسی مقدمے کے قید خانوں میں پڑے ہوئے ہیں، تقریباً ایک لاکھ پچپن ہزار مستقل اپاہج ہو گئے ہیں ہزاروں عفت مآب خواتین اپنی عزتیں کھو بیٹھی ہیں سکولوں کو بچوں سمیت مقفل کر کے جلا دیا گیا۔ بوڑھوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی مساجد کو منہدم کر دیا گیا بستیوں کی بستیاں نذر آتش کر دی گئیں، کپواڑہ، ہندواڑہ، بارہمولہ، اسلام آباد، بڈگام یہ سب شہر راکھ کے ڈھیر بنائے گئے مگر اس کے باوجود آزادی کے لیے جان کی بازی لگانے والوں کی تحریک دبائی نہ جا سکی۔ جیسے جیسے ظلم میں اضافہ ہوتا گیا ایسے ہی مجاہدین کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔ گزشتہ ماہ مسلمانوں کے ایک مقدس ومحترم مقام درگاہ حضرت بل پر بھارتی فوج نے گولہ بارود کے ساتھ حملہ کر کے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے اس حملہ سے عمارت کے کئی حصے جل کر تباہ ہو گئے، درگاہ حضرت بل کا محاصرہ کر کے اس کے اندر محصور مسلمانوں کے لیے خوراک اور پانی بجلی بند کر کے جس بہیمت اور درندگی کا ثبوت دیا ہے اس کے خلاف کشمیر اور پوری دنیا میں آواز بلند کی جا رہی ہے۔

درگاہ حضرت بل میں حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کا موئے مقدس ہے جس کی زیارت کے لیے دور دور سے مسلمان درگاہ حضرت بل پہنچتے ہیں اور تمام غیر ملکی مسلمان سیاح موئے مبارک کی زیارت کے لیے درگاہ حضرت بل ضرور حاضری دیتے ہیں۔

تاریخی روایات کے اعتبار سے مدینہ منورہ کے ایک بزرگ سید عبداللہ نامی ۱۰۴۴ ہجری کو ہندوستان تشریف لائے تھے وہ اپنے ہمراہ تین تبرکات لائے تھے ان میں سے ایک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گیسوئے مقدس کا موئے مبارک، ایک دستار شریف اور ایک حضرت علیؓ کے گھوڑے کی زین تھی۔ ان دنوں ہندوستان کے تخت پر مغل بادشاہ شاہجہاں جلوہ افروز تھا۔ شاہجہاںؒ نے ان تبرکات کی وجہ سے

سید عبداللہ کی تکریم کی اور ان کو بیجا پور میں جاگیر عطا کی۔ سید عبداللہ کی وفات کے بعد یہ موئے مبارک ان کے بیٹوں نے ایک کشمیری تاجر خواجہ نورالدین عشائی کو عطا فرمایا ان دنوں اورنگزیب عالمگیر کا عہد حکومت تھا۔ خواجہ نورالدین موئے مبارک کو لے کر کشمیر روانہ ہوئے مگر بادشاہ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو خواجہ نورالدین سے موئے مقدس حاصل کرنے کا حکم دیا۔ اس کے حکم سے نورالدین کو لاہور میں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا کہ موئے مبارک کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ مبارک میں رکھا جائے اجمیر شریف میں موئے مبارک کو رکھے ہوئے نو دن گزرے تھے کہ بادشاہ کو سرور کائنات ﷺ کی زیارت ہوئی اور بارگاہ رسالت مآب ﷺ سے حکم ملا موئے مبارک کو کشمیر بھیج دیا جائے بادشاہ نے فوری حکم کی تعمیل کی اور موئے مبارک کو کشمیر روانہ کر دیا گیا۔ اور اسی دوران خواجہ نورالدین لاہور میں انتقال کر چکے تھے۔ جب کشمیر کے علماء ومشائخ کو موئے مبارک کے کشمیر لائے جانے کے بارے میں خبر ملی تو وہ ریاست کی سرحد تک استقبال کیلئے آئے اور موئے مقدس کی صندوقچی کو سر پر اٹھائے ہوئے سرینگر پہنچے۔ مرزا قلندر بیگ نے موئے مبارک کشمیر پہنچنے کا یہ تاریخی قطعہ لکھا۔

محتاجاں را بوقت حاجت طلبی — موئے مدد است یارسول عربی

تاریخ نزول موئے من ہاتف گفت — کشمیر مدینہ شد از موئے نبی

ترجمہ۔ حاجت مندوں کو بوقت ضرورت یارسول اللہ موئے مبارک سے مدد ملتی ہے موئے مبارک کے کشمیر میں آنے کی تاریخ مجھے فرشتہ غیب نے بتائی کہ کشمیر نبی اکرم ﷺ کے موئے مبارک سے مدینہ بن گیا ہے۔

ابتداء میں موئے مبارک درگاہ نقشبند میں رکھا گیا مگر لوگوں کے زبردست ہجوم

کی وجہ سے جھیل ڈل کے مغربی کنارے پر واقع صادق آباد کی مسجد میں رکھ دیا گیا تب سے یہ اسی نام سے موسوم ہے۔ درگاہ حضرت بل کی زیارت کا شرف حاصل کرنے والے زائرین کا بیان ہے کہ ہر جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد موئے مبارک کا دیدار کروایا جاتا ہے۔ کشمیر میں نماز جمعہ کا منظر جامع مسجد اور خانقاہ معلیٰ میں بھی قابل دید ہوتا ہے مگر سوز وگداز کی جو کیفیت حضرت بل کی درگاہ میں نظر آتی ہے اس کی مثال بہت کم نظر آئے گی۔ نماز کے وقت سے کئی گھنٹے پہلے یہاں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان جمع ہو جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہو کر جب باآواز بلند اجتماعی درود و سلام کا ورد شروع ہوتا ہے اور حضور ﷺ کا موئے مبارک سامنے آتا ہے تو ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کو سرورِ کائنات ﷺ سے کس قدر عقیدت و محبت ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ موئے مبارک کا دیدار کر کے پاکیزہ اور پر خلوص آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں موئے مبارک کی زیارت ہر جمعہ کے علاوہ سال میں دس دن کروائی جاتی ہے تین دن معراج النبی کے موقع پر اور تین دن ربیع الاول کے دوسرے ہفتے میں عید میلاد النبی کے موقع پر چار دن چاروں خلفاء راشدینؓ کے ایام وصال کے موقع پر۔ درگاہ حضرت بل کی بے حرمتی پر کشمیری مسلمانوں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح کیوں نہ ہوں کہ وہاں پر حضور ﷺ کا موئے مبارک ہے اور ہر وہ چیز جس کی نسبت تاجدار مدینہ ﷺ سے ہو اس کی تعظیم و توقیر اور اس کی حفاظت و صیانت مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ایمان بلکہ روح ایمان ہے اور آپ کی تعظیم و توقیر فرض عین بلکہ تمام فرائض کی اصل ہے۔ حضور ﷺ کی ذات اقدس سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر اس چیز سے محبت کیجائے اور اس کی تعظیم و تکریم کی جائے جو آپ کی ذات مبارک سے منسوب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اجمعین حضور ﷺ کے ساتھ جن

اشیاء کی نسبت ہوتی ان کی بہت ہی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ حتیٰ کہ حضور ﷺ کے لباس مبارک اور ان اشیاء کو جنہیں آپ کے مقدس جسم کے ساتھ لگنے کا شرف حاصل ہوتا بہت ہی بابرکت نافع اور دافع البلاء والامراض سمجھتے اور کسی تبرک کا اپنے پاس ہونا اپنی خوش قسمتی سمجھتے اور اس کو دنیا و مافیہا سے بہتر خیال کرتے تھے۔

حضرت محمد بن سیرین تابعی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ سے کہا ہمارے پاس تاجدار مدینہ ﷺ کے کچھ بال مبارک ہیں جو ہمیں حضرت انس ؓ سے ملے ہیں تو انہوں نے فرمایا میرے پاس ان مبارک بالوں میں سے ایک بال کا ہونا دنیا و ما فیہا سے محبوب تر ہے۔ (بخاری شریف ص ۲۹ ج ۱)

حضرت انس بن مالک سے مروی ہے حضور ﷺ مزدلفہ سے منیٰ میں تشریف لائے اور جمرہ عقبہ پر کنکریاں ماریں اور قربانی کر کے اپنی قیام گاہ میں تشریف لائے پھر حجام کو بلایا اور اپنے سر مبارک کی داہنی جانب حجامت بنوائی اور حضرت ابوطلحہ انصاری کو بلا کر وہ بال انہیں عطاء فرمائے۔ اور پھر سر مبارک کی بائیں جانب سے حجامت بنوائی اور بال مبارک حضرت ابوطلحہ انصاری کو عطا فرمائے اور ان سے فرمانے لگے۔

اقسم بین الناس ان تمام بالوں کو لوگوں میں تقسیم کر دو۔ (مشکوٰۃ شریف)

صحیح مسلم شریف میں حضرت انس بن مالک ؓ سے ہی روایت ہے کہ فرماتے ہیں میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ حجام آپ کے سر مبارک کی حجامت بنا رہا تھا اور آپ کے صحابہ آپ کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے۔ اور وہ یہی چاہتے تھے کہ آپ کا جو بال مبارک بھی گرے وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ میں ہو۔ (مسلم کتاب الفضائل)

حضرت ام المومنین ام سلمہ ؓ کے پاس حضور ﷺ کا موئے مقدس تھا جس کو

انہوں نے ایک چاندی کی ٹلی میں رکھا ہوا تھا جب کسی کو نظر لگتی یا کوئی بیمار ہوتا تو حضرت ام سلمہ اس موئے مبارک والی چاندی کی ٹلی کو پانی کے برتن میں ڈال کر ہلا دیتیں اور وہ پانی مریض کو پلایا جاتا تو شفا ہو جاتی۔ (مشکوٰۃ ص ۳۹)

حضرت خالد بن ولیدؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس خوش قسمتی سے حضور ﷺ کی پیشانی مبارک کے بال تھے جو میں نے اپنی ٹوپی کے اگلے حصے میں محفوظ رکھے ہوئے تھے ان مقدس بالوں کی برکت تھی کہ عمر بھر ہر جہاد میں مجھے فتح و نصرت حاصل ہوتی رہی۔ (شفا شریف، والاصابہ)

جنگ یرموک کے موقع پر خالد بن ولیدؓ کا مقابلہ نسطور نامی پہلوان سے ہو رہا تھا اچانک حضرت خالد کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ جس کی وجہ سے حضرت خالد کی ٹوپی جو انہوں نے پہنی تھی زمین پر گر گئی۔ حضرت خالد اپنے رفقاء سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ میری ٹوپی مجھے دو ایک ضرب کاری لگائی کہ نسطور پیوند خاک ہو گیا۔ بعد میں کسی نے عرض کی کہ دشمن آپ پر وار کرنے کے قریب تھا اور آپ کو ٹوپی کی فکر لگی ہوئی تھی جو شاید دو چار آنے کی ہو گی۔ حضرت خالد نے فرمایا اس ٹوپی میں حضور ﷺ کے ناصیہ مبارک کے بال ہیں جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ ہر جنگ میں ان مبارک بالوں کی وجہ سے فتح یاب ہوتا ہوں۔ میری بے قراری انہیں مبارک بالوں کی وجہ سے تھی کہ کہیں یہ برکت میرے پاس نہ رہے اور کافروں کے ہاتھ لگ جائے۔

(شفاء شریف ص ۲۲ ج ۲)

حضرت ثابت بنانی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے خادم حضرت انس بن مالک نے مجھ سے فرمایا تھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک بالوں میں ایک بال ہے جب میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو اس موئے مقدس کو میری زبان کے نیچے رکھ دینا

چنانچہ میں نے ان کی وصیت کے مطابق ان کے انتقال کے بعد موئے مقدس ان کی زبان کے نیچے رکھ دیا اور اسی حالت میں دفن کر دیئے گئے۔ (اصابہ)۔

طبقات ابن سعد وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے کچھ بال مبارک اور ناخن مبارک منگوائے اور وصیت کی کہ یہ میرے کفن میں رکھ دیئے جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

(طبقات ابن سعد جز خامس ص ۳۰۰)

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اور صالحین امت حضور ﷺ کے موئے مقدس کو بہت ہی بابرکت اور قابل تعظیم سمجھتے تھے اور ان مقدس بالوں میں سے کسی بال مبارک کا اپنے پاس ہونا دنیا و مافیہا سے بہتر سمجھتے تھے اور برکت حاصل کرنے کی خاطر سفر و حضر میں اپنے پاس رکھتے بعد از وفات کفن میں رکھنے کی وصیت فرماتے۔ اللہ کے حبیب ﷺ کے جسم سے جن اشیاء کو لگنے کا شرف حاصل ہو ان کی تعظیم و تکریم بہت خیر و برکت کا باعث ہے اسی لیے علماء کرام فرماتے ہیں کہ:

جس سرزمین کی مٹی کو حضور ﷺ کے جسم اقدس کے ساتھ لگنے کا شرف حاصل ہوا ہے لازم ہے اس کے میدانوں کی بھی تعظیم کی جائے اور اس کی ہواؤں کو سونگھا جائے اور اس کے در و دیوار کو بوسہ دیا جائے۔ (شفا شریف ص ۴۶ ج ۲)

اسی لیے تو حضرت امام مالکؒ نے اس شخص کو تیس درے مارنے کا حکم دیا تھا جس نے یہ کہا تھا کہ مدینہ منورہ کی مٹی خراب ہے آپ نے فرمایا جس سرزمین میں افضل الخلائق آرام فرما ہیں تو کہتا ہے کہ اس سرزمین کی مٹی خراب ہے۔ تو اس لائق تھا کہ تیری گردن اڑا دی جائے۔

کفار سے برسرپیکار

مجاہدین اسلام سے خطاب

مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی کتاب النظرات کے ایک باب خطبۃ الحرب کا ترجمہ۔

عربی ادب میں معروف ترین نام مصطفیٰ لطفی منفلوطی مصری کسی بھی اہل علم کیلئے اجنبی نہیں۔ ہمارے دینی مدارس اور جامعات میں ان کی مایہ ناز کتب بڑے شوق سے پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔ ادیب کسی بھی قوم ملک یا معاشرے کا حساس ترین اور معتبر فرد ہوتا ہے اس لحاظ سے منفلوطی نہ صرف ادیب ہے بلکہ وہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور بطور خاص تاریخ کو مدنظر رکھ کر اپنی خوبصورت تحریروں کے ذریعے مسلمانوں میں اُنکی دینی اقدار اور قومی وملی شعور اجاگر کرنے میں بڑے نمایاں ہیں۔ زیر نظر مضمون انکی مشہور کتاب النظرات کا ایک باب ہے ہمارے مہربان مفتی شیخ فرید صاحب نے علمی وادبی چاشنی سے بھرپور ترجمے کا خوبصورت سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سے پچھلے شمارے میں علامات عظمت کے نام سے ایک تحریر چھپ چکی ہے۔ امید ہے قارئین اس فکر انگیز علمی وادبی سلسلے سے ضرور حظ اٹھائیں گے۔

(ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے مقام برقہ کے بہادرو، طرابلس کے شیرو، سرحدوں کے نگہبانو، قبیلوں اور قلعوں کے محافظو، میدان موت میں تھوڑے سے صبر و استقلال سے کام لو۔ وہ دیکھو! فتح و نصرت کا ستارہ آسمان کے کناروں میں چمک رہا ہے۔ اس کے نور سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں فتح یاب فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے اور تم نے اس کے ساتھ صبر کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ لہٰذا تم اپنا وعدہ پورا کرو وہ تمہارے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا فرمائے گا۔

اے شجاعت کے پیکرو! رزم گاہ حق و باطل سے فرار کا سوچو بھی نہیں قسم بخدا اگر تم فرار اختیار کرو گے تو تمہارا یہ فرار ایسی عزت سے فرار ہوگا جس کا کوئی دفاع کرنیوالا نہیں ہوگا اور ایسے شرف سے فرار ہوگا جس کا کوئی محافظ نہیں ہوگا اور ایسے دین سے فرار ہوگا جو بارگاہ خداوندی میں ایسی قوم کی شکایت کرے گا جس نے اس کو ضائع کر دیا ہے اور ایسے مددگار و انصار کی جنہوں نے اس کو ذلیل کر دیا ہے۔

اے مجاہدو! تم طاقتور مردوں کا مقابلہ نہیں کر رہے بلکہ تمہارے مدمقابل تو ایسی خیالی صورتیں ہیں جو تمہیں جہازوں کے بیڑوں کے سائیوں میں نظر آ رہی ہیں اور ایسے خیالات ہیں جو دیواروں اور فصیلوں کے کونوں میں پناہ لیئے ہوئے ہیں۔ ان پر ایسا کامیاب وار کرو جس کے ذریعے ان کی بچی کھچی عقلیں اڑ جائیں اور ایسے حواس باختہ ہو جائیں، کہ انہیں اپنی رائفلیں سنبھالنے کے لیے کوئی ہتھیلی اور تلواریں اٹھانے کے لیے کوئی بازو میسر نہ ہو۔

اے غازیان اسلام (تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ) تمہارے دشمن فانی زندگی تلاش کر رہے ہیں اور تم تو شہادت کی موت تلاش کر رہے ہو جو درحقیقت دائمی زندگی ہے وہ تو اپنے خالی پیٹوں کو بھرنے کے لیے مال و دولت کے متلاشی ہیں اور تم ایسی جنت کے طلبگار ہو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ لہٰذا ظاہری ساز و سامان دیکھ کر ان کے مقابلے میں ہرگز نہ گھبراؤ۔ جام موت تو مومنوں کے لیے کوئی تلخ حقیقت ہے ہی نہیں۔ اے سرفروشان اسلام تم تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ اور اس کے عدل و رحمت پر یقین رکھتے ہو۔ موت کی جانب بغیر کسی شک و تردد کے قدم بڑھاتے جاؤ۔ اللہ کریم تمہیں ہرگز رسوا نہیں فرمائے گا اور نہ ہی تمہیں تنہاء چھوڑے گا۔ تم تو سچی جماعت ہو۔

تمہارے جسموں سے ٹپکنے والے یہ خون کے قطرے کل سرخ ناری شعلے بن کر تمہارے دشمنوں کے سروں کے اوپر سے گریں گے جو انہیں جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیں گے۔ تمہارے سینوں سے اٹھنے والی آہیں دراصل لہو کی وہ دعائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی جانب محو پرواز ہیں کہ وہ تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب و کامران اور دشمنوں پر فتح و غلبہ سے نوازے، بے شک اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرمانے والا ہے۔

تم دیکھتے نہیں ان دشمنوں نے تمہارے معصوم بچوں کو تہہ تیغ کیا تمہاری عفت مآب خواتین کے پیٹ چاک کیئے تمہارے عظیم بزرگوں کی داڑھیاں نوچیں اور انہیں موت کے گڑھوں تک پہنچا دیا اب تم اپنے بارے میں کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟

اپنے دشمنوں پر سواروں اور پیادوں کے ذریعے کامیاب ترین حملہ کرو ان کے ساتھ شدت سے پیش آؤ۔ انہیں جہاں کہیں بھی پاؤ جہنم رسید کر دو۔ انہیں ہر راستے اور زمین کے ہر کونے اور آسمان کے ہر گوشے کے نیچے تلاش کرو۔ ان پر عرصہ حیات تنگ

کر دو حتیٰ کہ انہیں کھانے، پینے اور سونے جاگنے کی مہلت بھی نہ دو۔

کتنا ہی شیریں اور فرحت بخش ہوتا ہے موت کا وہ جام جو ظالموں کی زندگیاں مکدر کرنے اور ان پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی خاطر نوش کیا جاتا ہے۔ اسلام کے عظیم سرفروشو! اپنے لیے اپنی تلواروں سے قبریں کھودو اور یاد رکھو کہ وہ قبر جو تلوار سے کھودی جاتی ہے وہ جہنم کے گڑھوں میں سے گڑھا نہیں ہوا کرتی" بلکہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہوا کرتی ہے"

حق و باطل کے دو راستوں کے درمیان تیسرا راستہ اور دو اطراف کے درمیان کوئی تیسری سمت مت تلاش کرو اور نہ ہی وہ زندگی تلاش کرو جو موت کی طرح ہوتی ہے فیصلہ دوٹوک ہے یا تو دائمی زندگی تلاش کرو یا دائمی موت۔

اے جانبازو! تمہارے دشمن کل تک تمہارے وطن کی عزت اور تمہارے ملک کے تقدس کو پامال کر دیں گے تمہاری مستورات کو لونڈیاں اور تمہارے بچوں کو غلام بنا لیں گے اور اپنے گھوڑوں کی سموں سے تمہاری مساجد اور عبادت گاہوں کو روند ڈالیں گے۔ تمہارے نتھنوں میں ایسی نکیلیں ڈالیں گے جن کے ذریعے کھینچ کر تمہیں اس طرح ذلت و رسوائی کے مقامات تک لے جائیں گے جس طرح نکیل ڈالے ہوئے بے بس اونٹ کو اس کے باڑے تک لے جایا جاتا ہے۔ بس اپنی جانوں کا اللہ کی راہ میں ایسا نذرانہ پیش کرو جس کے ذریعے تم اس ذلت آمیز انجام سے بچ کر شہادت کی موت پا جاؤ۔

بزدل کی کیا زندگی وہ تو جیتے جی مرا ہوا ہوتا ہے۔ جبکہ شجاعت کے پیکر کی حیات اس کی موت میں مضمر ہوتی ہے۔ بس حیات جاودانی کے حصول کی خاطر موت کو

اپنے سینوں سے لگالو۔

اللہ تعالیٰ کی قسم ذلیل کوئی زندہ نہیں رہا اور معزز کوئی بھی مرا نہیں ساحلوں پر کھڑے ان بیڑوں سے اور تمہاری طرف دھانے کھولے ہوئیں توپوں اور تمہارے سینوں کی طرف سیدھی کی ہوئی ان بندوقوں سے ناممکن ہے کہ کوئی ایسی مضبوط فصیل تیار ہو جائے جو تمہیں اس دنیا سے آخرت کی جانب کوچ کرنے سے روک دے۔ تم اپنی آخرت کی راہ پر چل پڑو۔

کیا ہوا اگر دشمن تمہاری دنیاوی زندگی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں (یہ زندگی کونسی دائمی ہے۔ اصل تو حیات اخروی ہے) تمہاری آخرت کی راہ میں تو رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

یاد رکھو موت کا متلاشی مرا نہیں کرتا اور قتل کا طلب گار مقتول نہیں ہوا کرتا تاریخ شاہد ہے کہ دشمن کی جانب پیش قدمی کرنے والوں کی نسبت ان لوگوں کی ہلاکت زیادہ ہوئی ہے جو میدان جنگ سے منہ موڑ کر بھاگنے والے تھے پس اگر تم حیات جاوداں تلاش کرنا چاہتے ہو تو آگے بڑھ کر اس کو موت کے جبڑوں سے چھین لو۔

مؤرخین اپنے پوروں میں قلمیں تھامے ہوئے اوراق اپنے سامنے رکھ کر اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ تم ان سے کیا لکھوانا چاہتے ہو، اچھائیاں یا برائیاں؟ لہٰذا تم ان مورخین سے اپنے کارناموں میں سے شجاعت کے وہ انمول نقش ثبت کراؤ جو ان کے قلوب میں ایسا اثر چھوڑیں جو اثر تمہارے دلوں میں عظیم بہادر لوگوں کے بارے میں تاریخ کے لکھے ہوئے چمکدار اوراق نے چھوڑا ہے۔

کل ذلت کی حالت میں مرنے سے قبل آج عزت کی حالت میں مر جاؤ، اس

سے قبل مرو کہ تمہیں موت تلاش کرنی پڑے اور وہ نایاب اور اس کا حصول دشوار ہو جائے آج رزم گاہ میں شہادت پا جاؤ تا کہ تمہیں تمہارے کپڑوں میں کفنایا جائے اور تمہیں تمہارے خونوں سے نہلایا جائے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے تمہاری بخشش و مغفرت طلب کریں۔ اس سے قبل کہ اللہ کی تقدیر آ پہنچے اور تم میں سے کوئی اس حال میں مرے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھنے اور نعش کو اٹھا کر قبر تک پہنچانے اور دفنانے کے لیے کوئی مسلمان نہ ملے۔

بیشک حضرت ابوبکر و عمر اور حضرت علی و خالد، حضرت حمزہ و زبیر حضرت سعد و ابو عبیدہ، حضرت طارق بن زیاد و عقبہ بن نافع رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور تمام سابقین و اولین، مجاہدین و صابرین اسلام کے محافظ و نگہبان آسمان کی بلندیوں سے تمہیں جھانک کر دیکھ رہے ہیں کہ تم ان کی اس میراث کے معاملے میں کیسی روش اختیار کر رہے ہو جو انہوں نے تمہارے پاس چھوڑی تھی۔

لہٰذا تم اپنی حقیقی راہ پر چل پڑو اور اپنی تلواروں سے موت کے اس حجاب کو چاک کر دو جو تمہارے اور ان بزرگوں کے درمیان حائل ہے اور ان سے عرض کرو کہ ہم تمہارے ساتھ ملنے اور تمہارے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔

بے شک آج کے دن کے لیے مستقبل ہے۔ پس تم اپنی گردنیں دشمنوں کے سپرد مت کرو اگر تم نے ایسا کیا تو یاد رکھو ہمیشہ کے لیے روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کی جائے گی۔

کانپتا ہے دل ترا اندیشہ طوفاں سے کیا
ناخدا تو بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

اے انسان تیری بربادی میں کون کون شامل ہے

مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی کتاب النظرات کے ایک باب افسدک قومک کا اردو ترجمہ

مشہور مصری ادیب اور نقاد مصطفیٰ لطفی منفلوطی نے اس مضمون میں بڑی خوبصورتی سے ان افراد اور عوامل کا تذکرہ کیا ہے جو انسان کی زندگی میں مثبت یا منفی تبدیلیاں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ گھر، معاشرہ وحکومت اگر صالح ماحول پیدا کریں تو کسی شخص کی زندگی منفی ڈگر پر چل کر تباہی کا موجب نہیں بن سکتی۔ تربیتی مقاصد کے پیش نظر اس مختصر تحریر کو اردو میں نظر قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خزائن سے نفیس ترین اشیاء کو چھیننے والے اور ارواح کو اجسام سے سلب کرنے والے دلیر مجرم! میں تجھ پر تیرے جرم سے زیادہ سرزنش نہیں کرتا اور نہ ہی میں تجھے اس آنکھ سے دیکھتا ہوں جس آنکھ سے تیرے خلاف فیصلے میں درشتی برتنے والا قاضی دیکھتا ہے۔ کیونکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ بہت سارے لوگ تیرے ساتھ جرم کے ارتکاب میں شریک ہیں۔ لہٰذا مجھ پر لازم ہے کہ میں تیرے ساتھ انصاف سے پیش آؤں۔ اگر چہ میں تجھے کوئی نفع تو نہیں دے سکتا۔

سب سے پہلے تیرے ساتھ جرم کے ارتکاب میں تیرا باپ شریک ہے۔ کہ اس نے بچپن سے ہی تیری تربیت نہیں کی اور نہ ہی تیرے اور جرائم پیشہ افراد کے اختلاط وصحبت کے درمیان حائل ہوا۔ بلکہ کئی مرتبہ جب تو اپنے کسی ہم عمر پر حملہ آور ہوا تو تجھے شاباش دی اور جب کبھی تجھے اپنے بھائی کے جیب سے ایک روپیہ اچکنے یا اس

کے سامنے سے ایک لقمہ اٹھانے میں کامیاب ہوتے ہوئے دیکھتا تو تجھے تھپکیاں دینے اور تالیاں بجانے لگا۔

بس تیرا یہ باپ ہی تو ہے جس نے تیرے باطن میں جرم کا پودا کاشت کیا پھر اس کو سیراب کرتا رہا حتیٰ کہ وہ پودا بڑھا، اور بار آور ہوا یہ رسی جس کے ساتھ تو جکڑا ہوا ہے اسی پودے کا ہی ثمر ہے، تیرا یہ باپ جو آج تجھ پر آنسو بہا رہا ہے اور سسکیاں بلند کر رہا ہے، اگر وہ جانتا کہ یہ جرم اسی کا ہے اور اس کے پودے کو اسی نے اپنے ہاتھوں سے تیرے اندر کاشت کیا تھا تو وہ آج قانون کی غفلت پر خوشی سے ہنستا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ شکر ادا کرتا کہ تیرے گلے میں پڑا ہوا یہ پھندا اس کے گلے میں اور تیرے ہاتھوں میں پڑی ہوئی یہ ہتھکڑیاں اس کے ہاتھوں میں نہیں پڑیں۔

تیرے جرم میں انسانی فاسد معاشرہ بھی شریک ہے جو تجھے فریب دیتا رہا اور تیرے لیے ارتکاب جرم کی راہ ہموار کرتا رہا۔ تو جب کسی کو قتل کرتا تو یہ معاشرہ ہی تو تھا جو تجھے بہادر کہتا تھا اور جب تو چوری کرتا تو تجھے ذہین و فطین کہتا اور جب تجھے کوئی حیلہ و بہانہ تراشتے دیکھتا تو تجھے علم والا کہتا اور جب تو دھوکہ دہی کا مرتکب ہوتا تو تجھے عقلمند کہتا۔ اور تجھ سے اس طرح ہیبت کھاتا جیسے فاتحین سے ہیبت کھائی جاتی ہے اور تیری اس طرح عزت کرتا جیسے فاضلین کی عزت کی جاتی ہے۔

تو نے کئی مرتبہ اس معاشرے کے آئینے میں اپنے چہرے کو بے داغ دیکھنا چاہا اور اس حسن و جمال کے دوام کی تمنا کرتا رہا بس اگر یہ معاشرہ تیرے ساتھ خیر خواہی سے پیش آتا اور تیرے منہ پر تیرے بارے میں سچی بات کرتا اور تیرے جرم کو تیرے سامنے اس کی بری صورت کے ساتھ پیش کرتا تو اپنی ناک کٹنے کے ڈر سے تمنا کرتا کہ کاش اس برائی کے ارتکاب سے قبل تجھے زمین نگل لیتی اور موت تیرے اور اس جرم

کے درمیان حائل ہو جاتی۔

تیرے ساتھ جرم کے ارتکاب میں تیرے ملک کی حکومت بھی شریک ہے جو یہ جانتی تھی کہ بہت ساری کڑیوں پر مشتمل زنجیر کی آخری کڑی جرم کی ہے اور تجھے دیکھ رہی تھی کہ تو نے اس زنجیر کو ایک کڑی کے ذریعے پکڑا ہوا ہے اور یہ بات بھی حکومت کے علم میں تھی کہ تیرا معاملہ کہاں جا کر انجام پذیر ہوگا مگر اس کے باوجود اس نے تیرے ہاتھوں کو نہیں روکا اور نہ ہی تیری راہ میں رکاوٹ بنی اگر حکومت ایسا اقدام کرتی تو تو آج اس انجام کو نہ پہنچتا۔

تیرے ملک کی حکومت تجھے تعلیم دینے اور مہذب بنانے کی قدرت رکھتی تھی اور تجھ پر شراب خانوں اور بازار حسن کے دروازے بند کر سکتی تھی۔ اشرار لوگوں کو زمین کے بے نشان جنگلوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف دھکیل کر تجھے ان کی بری صحبت سے بچا سکتی تھی اور مقتول کے بارے میں تیرا کینہ اپنے مقام تک پہنچنے سے قبل مقتول کے خلاف تیری مدد کر سکتی تھی۔ اور تیرے جوان ہونے سے قبل تیری اچھی تربیت کر سکتی تھی۔ لیکن تیرے بارے میں وہ بے اعتنائی برتتی رہی اور تیرے معاملے میں غفلت کی طویل نیند سوئی رہی حتیٰ کہ جب تو نے اپنا کام پورا کیا تو مقتول کی چیخ سن کر بیدار ہوئی اور جھوٹی شجاعت کا منظر پیش کرنے کے لیے تیار ہو گئی اور اپنی پولیس اور فوج کو بلانے اور ان سے مدد طلب کرنے لگی اور اپنے جلادوں اور نوجوانوں کو تیار کرنے لگی بس جو کچھ بھی کیا وہ یہی تو تھا کہ تجھے صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

یہ سب لوگ جرم کے ارتکاب میں تیرے شریک ہیں۔ اللہ کی قسم میں قاضی ہوتا تو میں تیرے حصہ جرم کے مطابق سزا دیتا اور تیرے دیگر شرکاء کے درمیان اس سزا کو تقسیم کرتا لیکن میں تجھے نفع پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

منصب دعوت وارشاد پھولوں کی سیج یا وادی پُر خار

مصطفیٰ لطفی منفلوطی مصری کی کتاب النظرات کے ایک مضمون الدعوۃ کا ترجمہ

دعوت وتربیت اور تبلیغ وارشاد جہاں پیغمبرانہ منصب ہے وہاں مشکل اور صبر آزما ریاضت بھی ہے عصر حاضر میں اسلام کو درپیش مسائل وحالات کے پیش نظر یہ منصب جلیل اور بھی چیلنج بن چکا ہے اس مضمون میں بڑے منطقی انداز سے مبلغین کو طبعی مشکلات سے آگاہ کیا گیا ہے تاکہ اس منصب پر فائز حضرات پیش آمدہ مشکلات سے گھبرا کر اعلائے کلمۃ الحق سے منہ نہ موڑ لیں۔ (ادارہ)

جو شخص بھی کسی انسانی معاشرے میں گمراہی اور شریعت سے متصادم نو ایجاد امور کے ترک کی دعوت کا فریضہ انجام دینا چاہتا ہے درحقیقت وہ اپنے آپ کو ایسی جنگ کے لیے تیار کرتا ہے جس کی آگ اور چولہے اس وقت تک جلتے رہتے ہیں جب تک وہ برائیاں ختم نہیں ہوتیں یا وہ شخص خود ان کے مقابلے میں ہلاک نہیں ہو جاتا۔

میدان کارزار کے سپاہی کا موقف دعوت وارشاد کے میدان میں داعی ومرشد کے موقف سے زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اجسام سے ارواح کو جدا کرنے کی نسبت نفوس میں راسخ شدہ عادات اور خواہشات کو الگ کرنا مقصود کے حصول میں زیادہ مفید ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی کسی بھی مملوکہ چیز پر اتنا بخل نہیں کرتا جتنا وہ اپنے ان نظریات وعقائد پر بخل سے کام لیتا ہے جن پر اس کا باطن مشتمل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اپنے عقیدے ونظریئے کی حفاظت وصیانت کی خاطر اپنا خون تو بہا دیتا ہے لیکن اپنی جان کے تحفظ کے لیے اپنے عقائد کو ہرگز

قربان نہیں کرتا۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جتنے بھی خون ریز معرکے ہوئے، جتنے بھی خون بہے اور انسانی اعضاء بکھرے وہ سب کے سب نظریات کے تحفظ کی خاطر بہے اور بکھرے۔ ہمیشہ سے ہر قوم میں دعوت وارشاد کا فریضہ انجام دینے والوں کو دشمن سمجھا گیا کیونکہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کے نفوس میں برائیوں کے جو ذخائر ہیں ان میں کمی کی جائے اور ان کے من بھاتے امور میں درمندی پیدا کی جائے۔

داعیوں اور مبلغوں کے لیے پختہ عزائم اور اس راہ میں آنے والی تکالیف اور مصائب برداشت کرنے والے قلوب کی زیادہ ضرورت ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے مقصد تک رسائی حاصل کر لیں یا اس راہ میں اپنی جان قربان کر دیں۔

سچے داعی اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ لوگ انہیں خائن کہیں یا جاہل، زندیق کہیں یا ملحد، گمراہ کہیں یا کافر، کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ اس راہ پر چلنے والوں کا سابقہ ضرور پڑتا ہے۔ سچے داعی اور مبلغین بخوبی جانتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنی حیات ظاہری اس طرح بسر فرمائی کہ کبھی آپ کو ساحر کہا گیا اور کبھی کذاب (العیاذ باللہ) اور جس وقت دنیا سے پردہ فرمایا تو آپ سید المرسلین تھے۔

حضرت امام غزالیؒ پر زندگی میں کبھی کفر کے فتوے لگے اور کبھی الحاد کے اور بوقت وفات حجۃ الاسلام تھے۔ ابن رشد کی زندگی میں اس حد تک تذلیل وتوہین کی گئی کہ لوگ انہیں دیکھ کر تھوکا کرتے تھے اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت وہ اسلام کے مایہ ناز فلسفی تھے۔

سچے داعی چاہتے ہیں کہ وہ اپنی موت وحیات میں ان عظیم بزرگوں کی طرح بن جائیں بہت سارے لوگ سوچتے ہیں کہ کسی بھی جماعت میں دعوت وارشاد کا پرچم بلند کرنے والے کو اس کی دعوت وارشاد کوئی نفع نہ دے گی نہ ہی وہ جماعت اس کے بارے میں حسن ظن رکھے گی اور نہ ہی اس کی بات کو سننے کو تیار ہوگی۔ اس جماعت کو نفع پہنچانا تو دور کی بات ہے بلکہ اپنا ہی نقصان کر بیٹھے گا کہ لوگوں کے نزدیک وہ جاہل ترین اور احمق کہلانے لگے گا۔

یہ وہ شیطانی وسوسہ ہے جو کمزور اور جاہل قسم کے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور یہ وہ مرض ہے جو بہت سارے علماء میں پایا جاتا ہے جو ان کی زبان کو حق گوئی کے فریضہ کی ادائیگی اور انہیں ہدایت وارشاد کی راہ پر چلنے سے روک رہا ہے جس کی وجہ ان کا کام صرف لوگوں کے سامنے انہیں چیزوں کے تکرار اور اعادہ کے سوا کچھ نہیں جن چیزوں سے لوگ پہلے سے ہی بخوبی واقف اور جو ان کے ذہنوں میں اچھی طرح راسخ ومحفوظ ہیں پس ان کے اس عمل کی وجہ سے اذہان جامد اور حواس کند ہو چکے ہیں اور عقول ایسی تاریک جیل کے اندر داخل ہو چکیں ہیں جہاں پر نہ سورج طلوع ہو سکتا ہے اور نہ وہاں سے ہوا گزر سکتی ہے۔ جہالت ایک ایسا دبیز پردہ ہے جو عقل پر چھا جاتا ہے اور علم ایک بھڑکنے والی آگ ہے جو اس پردے کو چھوتے ہی آہستہ آہستہ اس کو جلا دیتی ہے جب تک عقل اور اس آگ (علم) کے درمیان وہ پردہ (جہالت) حائل رہتا ہے اس وقت تک عقل اس آگ کی حرارت سے درد والم محسوس کرتی رہتی ہے لیکن جب اس آگ کی عقل تک رسائی کی وجہ سے پردہ ہٹ جاتا ہے تو اس وقت عقل اس نار کو نور اور اس درد والم کو لذت وسرور محسوس کر لیتی ہے۔

باطل میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ حق کو مغلوب کر سکے کیونکہ حق تو ایک وجود ہے

اور باطل عدم۔

حق کو صرف علماء کی حق کی قوت سے ناواقفیت اور غلبہ حق کے بارے میں قنوطیت اور اس کی تشہیر و دعوت میں غفلت ہی مغلوب کرتی ہے۔

یہ بات ناممکن ہے کہ فرد واحد زمان واحد میں باطل کے ایوان کو منہدم کر دے بلکہ باطل کے ایوان کو متعدد افراد مختلف زمانوں میں منہدم کرتے ہیں ایک آتا ہے وہ اس کو حرکت دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی دیواروں میں دراڑیں پڑتی ہیں پھر دوسرا آتا ہے وہ اس کے ایک پتھر کو توڑتا ہے پھر تیسرا آتا ہے یونہی سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک اس کے کسی پتھر کے اوپر دوسرا پتھر باقی نہیں رہتا۔

جہلاء مریض کی طرح ہوتے ہیں اور اہل علم طبیب کی مانند۔ طبیب کے لیے یہ مناسب نہیں ہوتا کہ وہ مریض کی بے قراری یا اس کے چیخنے، چلانے سے ڈر کر یا اس کے سب و شتم سے بچنے کی خاطر عمل جراحی کو ترک کر دے کیونکہ عنقریب ہی یہ مریض اسکو مخلص دوست اور محبوب ترین فرد تصور کرے گا۔

بہت کم ایسا ہوا کہ کسی جاہل جماعت میں دعوت وارشاد کا فریضہ انجام دینے والے انسان کو اس جماعت نے پسند کیا ہو مگر اس وقت کہ جب وہ اپنی دعوت میں خیانت کرے یا نمود و نمائش کی راہ پر چل پڑے یا مداہنت اختیار کرے اور ایسا بھی بہت کم ہوا ہے کہ جس قوم میں دعوت وارشاد کا فریضہ انجام دیا جا رہا ہو اس میں عوام کی جانب سے داعی نے اکرام و اجلال کا لطف اٹھایا ہو مگر تلخ دوا کا گھونٹ بھرنے کے بعد شفاء کی حلاوت و لذت محسوس ہوتی ہے۔

اس قوم میں داعیوں اور مبلغوں کی اتنی کثرت ہے کہ جن سے فضاء اور زمین و

آسمان بھرے ہوئے ہیں۔مگر ممکن نہیں ان میں سے ایک بھی حقیقی داعی ملے کیونکہ ان میں جرات مند ایک بھی نہیں مصنفین اور مولفین، جامع مساجد کے خطباء و ممبروں کے واعظین سب کے سب حق کی دعوت دیتے ہیں اور سب نصیحت و وعظ کرتے ہیں اور سب امر بالمعروف و نھی عن المنکر کا کام کرتے ہیں لیکن (ایسے حالات) ممکن نہیں کہ ان میں کوئی ایسی ذات ملے جو دعوت کی راہ میں نقصان برداشت کرسکے اور تکلیف اٹھا سکے۔

داعیوں کی اقسام

میں اس قوم میں چار قسم کے آدمی دیکھتا ہوں۔

۱۔ ایک تو وہ شخص ہے جو حق کی معرفت رکھنے کے باوجود اس کو اپنی کمزوری اور بزدلی کی وجہ سے چھپاتا ہے۔پس وہ اپنی پوری زندگی میں خاموش رہتا ہے نہ ہی خیر کا اظہار کرتا ہے اور نہ ہی شر کا۔

۲۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جو حق کی معرفت بھی رکھتا ہے اور اس کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن دعوت وارشاد میں حکمت و تدبر کی راہ سے ناواقف ہے۔جس کی وجہ سے وہ لوگوں کے سامنے وہ کچھ بیان کرتا ہے جو ان کی بے قراری و نفرت کا باعث ہوتا ہے لوگ قریب آنے کے بجائے دور بھاگتے ہیں۔ایسے شخص کو اس ماہر طبیب کا طریقہ اختیار کرنا چاہے جو کڑوی دوا کو برشامہ (کیپسول) میں ڈال کر دیتا ہے تاکہ مریض آسانی سے نگل سکے۔

۳۔ اور تیسرا شخص وہ ہے جو نہ حق کی معرفت رکھتا ہے اور نہ باطل کی وہ اپنی دعوت و تبلیغ میں اس طرح ڈگمگاتا ہے جیسے انکھوں کے مرض میں مبتلا اونٹنی بیابان میں ڈگمگاتی پھرتی ہے وہ بیک وقت خیر و شر، حق و باطل، نافع و ضار کی طرف بلاتا ہے گویا وہ

امرو القیس کے اس گھوڑے کی مانند ہے جس کے بارے میں وہ کہتا ہے

مکر مفر مقبل مدبر معاً

(بیک وقت پلٹنے، بھاگنے، آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے والا)

اور چوتھا شخص وہ ہے جو حق کی معرفت رکھنے کے باوجود قوم کو باطل کی جانب بلاتا ہے اور یہ شخص ان سب سے خبیث ترین اور سب سے زیادہ فساد برپا کرنے والا ہے کیونکہ یہ اپنی خواہش کا غلام ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے قوم کو راستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ اور یہ شخص دوست کے لباس میں دشمن ہے کہ قوم کو ہدایت و رہنمائی کے نام پر ہلاکت و تباہی کے مقامات پر لے جا رہا ہے۔

افسوس ہے کہ قوم ان چاروں میں سے کس سے رہنمائی حاصل کرے گی؟

اس قوم کی بڑی بدبختی اور بدترین مصیبت یہ ہے کہ اس کے رہبروں کے لیے بھی رہبروں کی ضرورت ہے جو انہیں دعوت و تبلیغ کا طریقہ سکھائیں اور انہیں یہ بتائیں کہ دعوت و ارشاد کی راہ میں آنے والی تکالیف کے برداشت کا اپنے اندر کیسے مادہ پیدا کریں۔

کاش! کب یہ لوگ سیکھیں گے اور پھر پوری قوم کی رہنمائی کریں گے؟

علاماتِ عظمت

مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی کتاب۔ النظرات کے ایک باب العظمۃ کا اردو ترجمہ۔

جدید عربی ادب میں جن لوگوں نے انتہائی کامیابی کے ساتھ اپنا لوہا منوایا اور رہتی دنیا تک جن کے نام عربی ادب کی تاریخ میں سرفہرست رہیں گے مصر کے مصطفیٰ لطفی منفلوطی بھی انہیں میں سے ایک ہیں منفلوطی کی کتب دنیا میں ہر اس جگہ معروف ہیں جہاں عربی زبان اور ادب سے شغف رکھا جاتا ہے۔ زیر نظر مضمون ان کی مشہور زمانہ کتاب ''النظرات'' میں شامل ''باب العظمۃ'' کا سلیس اور خوبصورت اردو ترجمہ ہے مترجم علامہ مفتی شیخ فرید صاحب جو بذات خود جواں سال فاضل اور بے نظیر علمی و ادبی شغف رکھتے ہیں انہوں نے موضوع زیر نظر کا انتخاب کر کے عوام و خواص کو عظمت کی حقیقت اور کسی عظیم ہستی کی علامات سمجھانے کی ایک لائق تحسین سعی کی ہے مجلّہ افادہ قارئین کے لئے ان کی سعی مذکور شامل اشاعت کر رہا ہے۔

(ادارہ)

عظیم انسان کی علامات اور عظمت کے تقاضے۔

جب آپ کسی شاعر، عالم یا اپنی قوم میں معزز شخص یا اپنی جماعت کے کسی داعی کو دیکھیں کہ اس کے بارے میں لوگوں کا زاویہ نگاہ مختلف اور اس کے مرتبہ و مقام کے تعین میں لوگوں کے درمیان گروہ بندی پائی جاتی ہے اور اس کے بارے میں لوگوں کے درمیان اختلاف کی خلیج کی اس حد تک وسیع ہو چکی ہو کہ کچھ لوگ تو اس کی عقیدت میں اس حد تک مبالغہ کرتے ہوں کہ اسے فرشتے کے مرتبہ تک پہنچا رہے ہوں اور کچھ

لوگ اس قدر شدید نفرت رکھتے ہوں کہ اسے شیطان کے مرتبہ تک گرانے میں بھی باک محسوس نہ کرتے ہوں تو سمجھ لو کہ وہ ایک عظیم انسان ہے۔

عظمت تو شعر گوئی، علم، امارت و وزارت اور ثروت و جاہ کے سوا ایک الگ چیز ہے۔ دنیا میں علماء، شعراء اور رؤساء کی تعداد تو کثیر ہے مگر ان میں عظیم لوگ قلیل ہیں عظمت ایک روحانی اور وہبی و غیر کسبی قوت ہوتی ہے جو عظیم انسان کے باطن میں یہ شعور بیدار کرتی ہے کہ وہ اپنی ذات مزاج اور عقل میں ایک اجنبی شخص ہے اور وہ اپنے افکار کی عمدگی اور اپنی سوچ و فکر کے اسالیب و طریقوں میں عام انسان کی نسبت۔ ایک جداگانہ حیثیت اور مقام کا مالک ہے۔ اور وہ جب اپنی ذات کے لیے اس مقام تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر کسی شئے کو بھی اپنی آنکھ کے سوا کسی آنکھ سے نہیں دیکھتا اور نہ ہی اپنے کام کے سوا کسی کان سے سنتا ہے اور نہ ہی اپنے لیے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی راہ کے سوا کسی راہ پر چلتا ہے نہ ہی اپنی رائے اور فکر میں نہ ہی کسی کی مخالفت و موافقت میں کسی عقل کو اپنے اوپر حجت تسلیم کرتا ہے چاہے اس عقل اور عقل والے کی شان کتنی ہی بلند و بالا کیوں نہ ہو۔

بلکہ وہ اپنی ذات پر شدت وثوق و اعتماد کی وجہ سے اور عام لوگوں کے اپنی ذات پر ضعف اعتماد کو جاننے کی بناء پر چاہتا ہے کہ تمام لوگوں پر لازم و ضروری ہے کہ وہ اسے اپنا رہنما تسلیم کر لیں اور اس کے فکر و فلسفہ کے سامنے اپنی گردنیں خم کر لیں اس عظیم آدمی کے اعمال و آثار عام لوگوں کے اعمال و آثار۔۔۔ کے مقابلے میں عجیب و غریب نظر آئیں گے۔ جن کے ملاحظہ سے آنکھیں خیرہ نگاہیں دہشت زدہ اور دل ہیبت و خوف سے معمور ہو جائیں۔

اگر وہ عظیم انسان شاعر ہو گا تو اپنے معانی و اسلوب بیان میں جدت فکر پیدا

کرنے والا ہوگا اور اگر مصنف ہوگا تو لوگوں کی عقل وحواس اور ان کی پسندیدگیوں پر گرفت کریگا اور اگر وہ فقیہہ ہوگا تو قدیم اجتہادات سے ہٹ کر اپنے زمانے کے مطابق نئے اجتہاد سے قوم و مذہب کی خدمت کرے گا۔ اور گر بادشاہ ہوگا تو تاریخ عالم کے صفحات ایسے کارہائے نمایاں سے مزین کرے گا جو اس سے قبل کسی سے بھی صادر نہیں ہوئے ہوں گے۔ اور اگر وہ سیاستدان ہوگا تو اپنی قوم میں ایک جدید سیاست کی طرح ڈالے گا جس کی مثال اس سے قبل نظر نہیں آئے گی۔ اور اگر وہ قائد ہوگا تو ایسی نئی ضرب لگائے گا کہ جس کی آواز ''جوزاء'' کی بلندیوں میں سنائی دے گی۔ یہ ہے عظمت اور یہ عظیم انسان اور جس کی یہ شان ہو وہ لوگوں کی جلوتوں اور خلوتوں میں تعجب کا باعث ان کی نگاہ ودانش کا مرکز اور اپنے مقام ومرتبہ کے تعین کے بارے میں لوگوں کے اختلاف و پھوٹ کا مدار بن جاتا ہے۔ اور وہ طبیعتیں جو ہر اجنبی شخص سے تعجب اور ہر جدید چیز پر فریفتہ ہوتی ہیں وہ اس پر تعجب کرنے لگتی ہیں اور ان کا یہ تعجب اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے افعال واعمال اور حرکات پر فریفتگی اور محبت میں استغراق اور اس کی عقیدت کی خاطر گروہ بندی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اور جب اس کے عجائب وغرائب کی ہر گلی وکوچہ اور ہر محفل ومجلس میں تشہیر ہونے لگتی ہے تو یہ چیز اس کے ساتھ حسد رکھنے اور اس کی ہمسری کرنے والوں اور اس کی عبقریت و نابغیت کے منکروں کو بری لگتی ہے اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس کی عقیدت ومحبت میں روز بروز لوگوں کے استغراق میں اضافہ ہوتا جارہا ہے تو مقابلہ و غلبہ حاصل کرنے کے قاعدے کے مطابق اس کے ساتھ بغض وعداوت میں ڈوبنے اور جلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں پاتے اور یہاں سے ہی اس کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان ایک ہولناک معرکہ شروع ہو جاتا ہے اور آپس میں لڑنے اور جھگڑنے کا

آغاز ہو جاتا ہے اس کے مخالفین چاہتے ہیں کہ اس سے یہ عظمت کسی طرح سلب ہو جائے اور اس کے حامی و خیر خواہ اس عظمت کو اس کے پاس باقی دیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور وہ شخص ان کے درمیان مطمئن بیٹھ کر اپنی نگاہوں سے جائزہ لیتا ہے نہ ہی وہ غمگین ہوتا ہے اور نہ ہی مایوس کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے اردگرد چلانے اور شور مچانے والی آوازیں تو اس کی شہرت و عظمت کے ڈنکے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عظیم آدمی اپنی ہر رائے اور اپنے ہر فعل اور اپنے لیے اور لوگوں کے لیے جو خطوط اور راہیں استوار کرتا ہے ان میں مصیب اور درست ہوتا ہے کیونکہ کبھی اس سے ضعیف ترین اور غیر مشہور آدمی کی نظر و فکر زیادہ صائب و صادق ثابت ہو جاتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عظیم انسان کے سوا کوئی شخص بھی ادیبوں کے قلموں اور مفکرین کی عقلوں اور ناطقین کی زبانوں اور محبین و مخالفین کے دلوں کو مشغول و مائل نہیں کر سکتا۔

چند مثالیں:

ایک گروہ نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے اس حد تک محبت میں مبالغہ کیا (کہ حد الوہیت تک پہنچا کر) کفر کا مرتکب ہو گیا اور ایک گروہ شدید نفرت و عداوت میں مبتلا ہو کر کافر بن گیا۔

لوگوں کی ایک جماعت نے سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو شیخ المسلمین قرار دیا ہے اور ایک گروہ سرے سے ہی ان کی صحابیت اور اخلاص کا منکر ہو گیا۔ محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ تعالیٰ کو ایک گروہ قطب الاولیاء کا درجہ دیتا ہے اور ایک فرقہ انہیں شیخ الملحدین کہتا ہے۔

مسلمانوں کے ایک طائفہ نے ابن رشد پر اتنا ناز و فخر کیا کہ انہیں فیلسوف اسلام قرار دیا اور ایک طبقہ ان سے شدید نفرت رکھتا تھا حتیٰ کہ جامع مسجد میں ان کے چہرے پر تھوکا گیا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک جماعت نے اس قدر عقیدت کا مظاہرہ کیا کہ انہیں حجۃ الاسلام کا لقب دیا اور ایک طبقہ اس قدر متنفر تھا کہ اس نے ان کی کتاب احیاء العلوم کو پرزے پرزے کر کے ہواؤں میں بکھیرنے میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔

مشہور شاعر معری نے بھی اپنے دوستوں اور مخالفوں میں اس طرح زندگی بسر کی کہ دوست ان کے جوتوں کی خاک چاٹنے اور بوسے دینے کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے اور مخالف انہیں منہ کے بل شاہراہوں پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔ سقراط نے اپنی مصیبت پر خوش ہونے اور مسکرانے والے چہروں اور غمگین و اشکبار آنکھوں کے درمیان زہر نوش کیا۔

کچھ لوگوں نے متنبّی کی اس قدر مدح و ثناء کی کہ اسے سید الشعراء قرار دیا اور کچھ لوگوں نے اتنی مذمت کی کہ اسے سب سے بڑا تصنع کرنے والا قرار دیا۔ ایک قوم نے شیکسپیئر کو کمال انسانی کے مرتبہ تک پہنچاتے ہوئے نابغۃ الدہر کا لقب دیا اور ایک جماعت نے اسے حقارت و خست کے ادنیٰ ترین مرتبہ پر پہنچاتے ہوئے نقال و کذاب قرار دیا۔

نابلیون اول کے پرستاروں نے اس قدر عقیدت و محبت کا مظاہرہ کیا کہ انبیاء کرام کے مقام تک پہنچایا اور اس کے مخالفین نے اس حد تک نفرت کا اظہار کیا کہ اسے احمقوں کی صف میں شامل کیا۔ لوتھر اور کالفین، غلیلو اور فویسٹر، نیٹشے اور ٹولسٹوئے

میں سے ہر ایک کی محبت وعداوت کے جام کے آخری قطرے تک کو نوش کیا گیا اور انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا۔ اسی طرح جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، سعد زغلول، مصطفیٰ کامل اور علی یوسف وقاسم امین کے بارے میں ان کے زمانے میں لوگوں کے درمیان جتنا اختلاف پایا گیا اتنا کسی میں نہیں پایا گیا۔ ان مذکورہ افراد میں سے کوئی بھی شخص اس مقام ومرتبہ کا ہرگز مالک نہیں تھا جس کے قائل اس کے ساتھ عقیدت رکھنے والے تھے یا جس کے قائل اس کے ساتھ بغض وعداوت میں غلو کرنے والے تھے۔

لیکن وہ بہر حال عظیم لوگ تھے کیونکہ ان کے بارے میں لوگوں کے درمیان اتنا بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور لوگوں میں اتنا بڑا اختلاف صرف عظیم آدمی ہی کے بارے میں پایا جاسکتا ہے۔

زندگی کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی اپنے لیے ایک ایسی سرنگ بنالے جس کا ایک کنارہ اس کی مہد اور دوسرا کنارہ اس کی لحد سے ملا ہوا ہو اور وہ اس سرنگ میں اپنے آپ کو اس طرح گھسیٹتا چلا جائے کہ نہ کوئی آنکھ اسے دیکھے اور نہ کوئی کان اس کی آواز سنے۔ یہاں تک وہ اپنی انتہاء کو پہنچ جائے۔ جس طرح کہ گھاس کے تنکوں میں کیڑے مکوڑے اور پیٹ کے بل زمین پر رینگنے والے جانوروں کا حال ہوتا ہے۔ زندگی تو کانوں کو کھٹکانے، نگاہوں کو مائل کرنے اور دلوں کو جھنجھوڑنے، رکے ہوئے قلموں کو حرکت دینے، اخیار کے دلوں میں محبت کی آگ اور اشرار کے قلوب میں بغض کی چنگاری بھڑکانے سے عبارت ہے

عظمت تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کی خدمت اس کے دوست اور دشمن دونوں کرتے ہیں اور اس کی ہیکل کے پتھر کو اس کے بنانے اور گرانے والے ہر دونوں

اپنے سروں پر اٹھاتے ہیں۔ جہاں تمہیں دشمنوں کا لشکر نظر آئے گا وہاں دوستوں کا لشکر بھی ضرور ہوگا اور جہاں کہیں تمہیں دونوں کا اجتماع نظر آئے تو سمجھ لو کہ وہاں عظمت موجود ہے۔

عظمت تو ایک ایسا مضبوط محل ہے جو ایسے دوستونوں پر قائم ہے جو دوستوں کی محبت اور دشمنوں کی عداوت و بغض سے تراشے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور یہ محل اس وقت تک اپنے مقام پر ثابت و قائم رہتا ہے جب تک یہ ستون قائم رہتے ہیں، جب ان میں سے ایک گر پڑتا ہے تو دوسرا بھی اس کے گرنے سے کمزور پڑتے پڑتے آخر کار ساقطہ ہو جاتا ہے اور دونوں کے سقوط سے وہ محل بھی ساقط ہو جاتا ہے۔

اس بات کو مت پسند کرو کہ تمام لوگ تمہاری محبت و عقیدت کا دم بھرنے لگیں کیونکہ سب لوگ ضعیف و حقیر آدمی کی محبت میں تو متفق ہو سکتے ہیں جو اپنی ذات و رائے اور عقل و حواس سے خالی و مجرد ہو اور پھر ان کے قدموں میں اس ذلیل کتے کی طرح بیٹھ جائے جسے پیٹا جاتا ہے تو برداشت کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ لوگ کھیلتے ہیں تو وہ ان کی خوشنودی کی خاطر اپنی دم ہلاتا ہے اور بلاتے ہیں تو قریب آ جاتا ہے اور دھتکارتے ہیں تو دور بھاگ جاتا ہے۔ اور نہ ہی اس بات کو پسند کرو کہ سب لوگ تمہارے ساتھ بغض و عداوت سے پیش آئیں کیونکہ سب لوگ بغض و عداوت کا مظاہرہ صرف ایسے خبیث و شریر لوگوں سے کرتے ہیں جو نہ کسی کو اچھا سمجھتے ہوں اور نہ ہی لوگ انہیں اچھا سمجھتے ہوں تم اپنے بارے میں اس بات کو پسند کرو گے کہ لوگ تمہارے مقام و مرتبہ کے تعین میں مختلف خیالات رکھیں۔ کیونکہ یہی عظمت کی علامت اور یہی مرد عظیم کی شان ہے۔

معاشرے میں علماء حق کا مقام وکردار

قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

شهد الله انه لا اله الا هو والملائكه واولوا العلم قائماً بالقسط لا اله الا هو العزيز الحكيم. (آل عمران ۳:۱۸)

اللہ نے (اس بات پر) گواہی دی (گویا آسمان وزمین پر منادی ہوئی) کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور اہل علم نے بھی اپنے مقام پر یہ گواہی بھی دی کہ اللہ ہی عدل قائم رکھنے والا ہے (اللہ تعالیٰ انصاف کے ساتھ کارخانہ قدرت کو سنبھالے ہوئے ہے) اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زبردست حکمت والا ہے۔

اس آیت مقدسہ میں اللہ تعالیٰ نے تین شہادتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ رب کریم کی شہادت، فرشتوں کی شہادت اور اہل علم کی شہادت۔ قرآن حکیم میں جب لفظ شہادت اپنے سیاق وسباق کے ساتھ بیان ہوتا ہے تو شہادت سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید اس کے کلمہ حق وصداقت کی اشاعت و بیان سے دنیا کی غفلت وضلالت کی تاریکیوں کی بیخ کنی، معصیت وجہالت کی شب دیجور کا خاتمہ اور شمع ہدایت کے نور سے بزم جہاں کو فروزاں کرنا ہوتا ہے۔

لہٰذو وہ تمام امور جو دعوت، تعلیم، اظہار، اعلان، بیان قیام وقوام، دعوت اور کلمہ حق کی بلندی سے تعلق رکھتے ہیں، لفظ شہادت میں وہ سب شامل ہوتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے روز بارگاہ خداوندی میں عرض کریں گے:

وكنت عليهم شهيدا ما دمت فيهم (المائدہ ۵: ۱۱۲)

جب تک میں ان میں رہا ان کی نگہبانی کرتا رہا۔

اور میرے رفع آسمان کے بعد جس گمراہی میں وہ مبتلا ہوئے اپنی موجودگی میں اس ضلالت و گمراہی سے منع کرتا رہا اور جس گمراہی مین وہ میرے رفع کے بعد مرتکب ہوئے اس سے روکتا رہا۔

سورۃ نساء میں ہے؛ **فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید** (النساء۴:۴۱)

پھران کا کیا حال ہوگا جب (قیامت کے دن) ہم ہر امت میں سے ایک گواہ (یعنی ان کے نبی کو) لائیں گے (جو ان کے اعمال پر شاہد ہوں گے)

اس آیت کریمہ میں شہید سے مراد حق وصداقت کا علمبر دار اور دعوت و ہدایت کا اصلی منبع انبیاء کرام کا گروہ ہے۔

جب غافل انسان شہادت الٰہی سے اپنے کان اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے تو پھرایک تیسری شہادت کی ضرورت ہوتی ہے جو خود انسانوں کے درمیان سے بلند ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شہادت اور ملائکہ کی شہادت کے ادراک ومعرفت کی راہیں کھولنے والی ہوتی ہے اور اللہ کی شہادت کی حامل اور مبلغ ہوتی ہے۔اور وہ شہادت اہل علم کی شہادت ہے اور یہ شہادت قولی، عملی اور اخروی شہادتوں کو شامل ہے۔اس شہادت کے حاملین کا اصل اور بنیادی طبقہ انبیاء کرام علیہم السلام ہیں اور پھران کے واسطے سے ان کی امت کے علماء حق اور اولیائے عظام بھی اصحاب شہادت میں داخل ہیں۔جن کی حیات ہمیشہ انسانیت کے لے مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہے اور جن کا مقصد حیات رشد و ہدایت کی قندیلیں روشن کرنا اور ضلالت و گمراہی اور عصبیت و غفلت میں مبتلا انسانیت کو راہ حق بتانا اور اللہ کی زمین کو حق وصداقت کی شہادت سے معمور رکھنا ہوتا ہے۔اس شہادت الٰہی کے حاملین ہر زمانہ میں موجود رہے۔جب سرور کائنات خاتم الانبیا ﷺ کی بعثت ہوئی تو یہ منصب بھی آپ کو قیامت تک تفویض ہوا اور علماء حق

آپ کے نائب ووارث بنائے گئے۔ قرآن حکیم میں تاجدار کائنات ﷺ کے اس منصب کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھدا و مبشرا و نذیرا وداعیا الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا. (الاحزاب ۳۳:۴۸)

اے نبی ہم نے آپ کو گواہ (بنا کر) اور خوشخبری سنانے والا اور نصیحت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور (آپ کو) اللہ کے اذن (اس کے اشارہ) سے اللہ کی طرف بلانے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے (آپ نور علی نور ہیں ﷺ)

نیز ارشاد فرمایا:

وکذالک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا. (البقرۃ ۲:۱۴۳)

اور (اب لوگوں کو ہدایت پر لانا اپنے عمل کو دوسروں کے لیے نمونہ بنانا آپ ہی کی امت کے لیے خاص ہے کیونکہ جس طرح ہم نے تحویل قبلہ کیا ہے) اسی طرح ہم نے (اے مسلمانو) تم کو اعتدال پر رہنے والی امت بنایا تا کہ (افراط وتفریط سے پاک ہو کر کعبہ کی طرح امم عالم کے لیے مرکز ومحور ہدایت بنو اور) تم لوگوں پر نگران رہو اور (ہمارا) رسول تم پر نگران رہے (تمارا نگران حال ہو تمہارے عمل صالح پر گواہ ہو)

حدیث پاک میں حضور نبی اکرم ﷺ نے امت کے علمائے حق کی نیابت نبوت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

العلماء ورثۃ الانبیاء — علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔

حضور ﷺ نے جس حق وصداقت کی شہادت اپنی امت کو پہنچائی تھی اس کے اظہار وقیام کی ذمہ داری اپنے متبعین صادقین پر ڈال دی تا کہ اس سراج منیر کے نور

سے کائنات مستفید و مستنیر ہوتی رہے اور نبوت کا یہ فیضان تا قیامت جاری رہے۔
علماء حق اور حاملین شہادت الٰہی کا طبقہ امت میں قلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح انسانی جسم میں قلب (دل) کی اہمیت مسلم ہے کہ جسم کا سارا نظام اس پر موقوف ہے جب تک قلب اپنے وظائف احسن طریقے سے ادا کرتا رہتا ہے اس وقت تک جسم کا پورا نظام درست رہتا ہے اگر قلب میں کوئی خرابی واقع ہو جائے تو پورا جسم اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔

حدیث پاک میں ارشاد ہے:

الا ان فی الجسد مضعة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا و ھی القلب (صحیح بخاری)

خبردار انسانی جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو جسم کا پورا نظام درست رہتا ہے اور اگر اس میں فساد آ جائے تو پورا جسم بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے یاد رکھو وہ دل ہے۔

اس انسانی جسم کے قلب کے لیے تین امور کا حامل ہونا ضروری ہے تا کہ وہ اپنا کام صحیح طریقے سے جاری رکھ سکے اور جسم کا نظام جادہ اعتدال پر قائم رہے وہ تین امور حیات، حرکت اور حرارت ہیں۔ اگر قلب کی حیات کی ڈوری کٹ جائے یا حرکت قلب بند ہو جائے تو روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس لیے قلب کو اپنا فطری وظیفہ احسن طریقہ سے ادا کرنے کے لیے ذی حرارت ہونا بھی لازمی ہے۔ اسی طرح امت کے قلب یعنی علماء حق اور حاملین شہادت الٰہی کے لیے بھی حیات، حرکت اور حرارت کا ہونا لازمی ہے۔

علماء حق کی حیات مسلمانوں کی روحانی زندگی اور ان کے نظام حیات کی بقاء کا

ذریعہ ہے۔ اسی لیے حدیث پاک میں رفع علم بسبب رفع علماء حق کو علامت قیامت میں شمار کیا گیا ہے۔

ان من اشراط الساعة ان یرفع العلم، یکثر الجھل . (مشکوٰۃ المصابیح : ۴۶۹)

دوسری حدیث پاک میں صراحت فرما دی گئی ہے کہ علم کو لوگوں کے سینوں سے نہیں چھینا جائے گا بلکہ علماء حق اٹھائے جانے کے سبب علم اٹھایا جائے گا۔

ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء. (مشکوٰۃ المصابیح : ۳۳)

اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے چھین کر نہیں اٹھائے گا بلکہ علماء کو اٹھا کر علم کو اٹھا لے گا۔

اسی لیے کہا جاتا ہے:

موت العالم موت العالم عالم ربانی کی موت عالم کی موت ہے۔

قلب امت یعنی علماء ربانیین کا متحرک ہونا بھی ضروری ہے اور ان کی حرکت دین کی راہ میں جہد مسلسل اور عمل پیہم سے عبارت ہے ہماری تاریخ شاہد ہے کہ امت کے علماء حق نے شہادت الٰہی کی ادائیگی اور دین متین کی اشاعت وتحفظ اعلائے کلمہ حق اور تحفظ ناموس رسالت کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں فرمایا۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کی جانب سے جو جام ہدایت قرآن و سنت کی شکل میں ملا تھا اس کو گردش مین لاتے رہے اور اس نور سے چار دانگ عالم کو منور کرتے رہے، دامن انسانیت کو علم ومعرفت کی دولت سے مالا مال کرتے رہے، دنیا کے ہر خطے میں پیغام حق کی ترویج واشاعت کی خاطر ان گنت مساجد اور تعلیمی ادارے ان کے ساتھ لاتعداد کتب خانے قائم فرمائے اور ان مساجد و مدارس مین تعلیم وتدریس وعظ ونصیحت اصلاح وتربیت کے دھارے بہنے لگے ان علمائے حق میں سے

ہر عالم دین ایک ''دارالعلوم'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ سفر و حضر میں مسجد و خانقاہ میں، مدرسہ و گھر میں، جہاں بھی جاتا علم و معرفت کے انوار بکھیرتا جاتا۔

جب کبھی بھی اسلام کے خلاف کوئی سازش کی گئی کوئی فتنہ ابھرا تو علماء حق نے بڑی جرأت و استقامت سے اس کا مقابلہ کیا اور دین حق کے تحفظ کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ اور انہیں کلمہ حق کی بلندی اور شہادت الٰہی کی ادائیگی، ناموس رسالت کے تحفظ کی خاطر جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بھی جانا پڑا، اپنی پیٹھ پر کوڑوں کی ضربات بھی سہنا پڑیں اور اپنے اعضاء اور گردنیں بھی کٹوانا پڑیں، مرحلہ وار دار و رسن سے بھی گزرنا پڑا مگر یہ ہوش فرسا حوادث ان کے بلند عزائم کو پست نہ کر سکے اور دنیا کی کوئی ہیبت و سطوت اور کوئی خوف و لالچ انہیں اپنے راستے سے باز نہ رکھ سکی۔

سید التابعین حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کی پیٹھ پر تازیانے برسائے جاتے ہیں مگر حُکام کا یہ جور و ستم انہیں شہادت حق سے باز نہیں رکھتا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

حضرت امام اعظم کا سفر عزیمت

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب وقت کے حکمرانوں کی خلاف شرع حرکات پر تنقید کی اور انکے خلاف آواز حق بلند کرنے لگے تو آپ کو وزارت خزانہ کے عہدے کا لالچ دیا جاتا ہے مگر آپ عہدہ قبول کرنے سے انکار فرما دیتے ہیں تو آپ کو جیل میں قید کر دیا جاتا ہے اور روزانہ جسم پر چودہ کوڑے لگائے جاتے ہیں اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ہر کوڑے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس امتحان میں کامیابی کی دعا مانگتے ہیں۔ دوسری مرتبہ ابو جعفر منصور عباسی کے حکم سے آپ کو بغداد کے جیل خانہ میں قید کر

دیا جاتا ہے۔ آپ اس قید و بند کے دور میں بھی نہایت ہی اطمینان اور سکون کے ساتھ درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور علم و معرفت کے انوار بکھیرتے ہیں۔ طلباء دین کی ایک کثیر تعداد آپ سے علمی استفادہ کرتی ہے اور ان ہی حضرات میں حضرت امام محمدؒ بھی ہیں جو بلا شبہ دنیائے اسلام کی ایک عظیم شخصیت ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے علمی وقار کے تحفظ اور آزادی کے ساتھ شہادت کی ادائیگی کی خاطر یہ سب صعوبتیں اور مظالم برداشت فرما کر قیامت تک آنے والے علماء حق کو درس دیا کہ کامیاب تو وہ ہیں جو ہر حال میں شہادت الٰہی کی ادائیگی کی ذمہ داری کی تکمیل کرتے ہیں۔

حضرت امام مالک، حضرت امام احمد بن حنبل، حضرت امام شافعی اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہم اللہ و دیگر علماء حق بھی اعلان حق اور ادائیگی شہادت الٰہی و اظہار حق و صداقت ہی کی پاداش میں بے شمار صعوبتوں اور حکام وقت کے جور و ستم سے دوچار ہونا پڑا مگر یہ صعوبتیں اور مظالم انکے پائے ثبات میں ذرہ بھر بھی تذبذب پیدا نہ کر سکے۔

ہر دور میں علماء حق نے نہایت ہی استقلال و استقامت اور جرأت فرماتے ہوئے امت کی ہدایت و رہنمائی اور امتیاز حق و باطل کا فریضہ انجام دیا۔

تحریک آزادی میں علماء کا کردار

برصغیر میں جب انگریزوں نے ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست پر اپنا تسلط قائم کیا تو برصغیر کے علمائے حق ہی تھے جنہوں نے انگریزوں کا مقابلہ کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھا اور کفن بدوش سر بکف میدان عمل میں اتر آئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مین کفر و باطل کو للکارنے والے علمائے حق ہی تھے اسیر جزیرہ انڈمان علامہ فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا سید احمد اللہ شہید مدراسی، مولانا

کفایت علی کافی شہید مراد آبادی رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان کے احباب و دیگر علمائے ربانیین نے فرنگی سامراج کی شدید مخالفت کی اسی لیے فرنگی انتقام کے شعلے ان ہی کی طرف لپکے علماء حق کو کالے پانی کی سزا دی گئی سینکڑوں کو جلاوطن کر دیا گیا اور ہزاروں علماء کرام کو درختوں کے تنوں سے باندھ کر گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء علمائے حق اور مشائخ عظام کے جذبہ اسلام اور حمیت دینی کا ایک روشن باب ہے۔ اس کے بعد ابھرنے والی تمام تحریکوں کو اگر اسی تحریک کے سلسلہ کی کڑیاں اور جذبہ حریت کے اس عظیم مینار کی روشنی کی کرنیں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا اس تحریک آزادی کو انگریزوں نے بظاہر کچل تو دیا مگر مسلمانوں کے دلوں سے جذبہ حریت نہ نکال سکے۔

مولانا احمد رضا خان کی انگریز سے نفرت کا عالم

علمائے حق انگریزوں سے شدید درجہ عداوت و نفرت رکھتے تھے جس کا اظہار بانگ دھل کرتے تھے۔ اسی نفرت ہی کا نتیجہ تھا کہ دنیائے اسلام کی عظیم شخصیت حضرت امام احمد رضان خاں رحمہ اللہ ''ڈاک کے لفافے پر ہمیشہ الٹا ٹکٹ چسپاں فرماتے تھے اور برملا کہتے تھے ''میں نے جارج پنجم کا سر نیچا کر دیا ہے'' ملت اسلامیہ کے اس بطل جلیل نے عمر بھر فرنگیوں کی حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا امام احمد رضا خان نے کبھی بھی انگریزوں کی عدالت میں حاضری نہیں دی ایک مرتبہ انہیں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں عدالت طلب کیا گیا مگر انہوں نے توہین عدالت کے باوجود حاضری نہ دی اور یہ کہا میں انگریزوں کی حکومت ہی کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کی عدالت کو کیسے تسلیم کروں؟ انہیں گرفتار کر کے عدالت حاضر ہونے کے احکام جاری کر دیئے گئے۔ مگر ان کے

ہزاروں جانثار سر پر کفن باندھ کر ان کے گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ آخر عدالت کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔

امام احمد رضا خانؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے ۱۸۹۷ میں دوقومی نظریہ کا تصور پیش فرمایا اور ۱۹۲۱ء میں ان کی رحلت ہوئی لیکن اپنے پیچھے علمائے حق کی ایسی جماعت چھوڑ گئے جس نے اس مشن کو آگے بڑھایا چنانچہ آپ کی زندگی ہی میں ان حضرات نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ آپ کے صاحبزدگان، خلفاء، تلامذہ اور متعلقین و دیگر علمائے حق و مشائخ عظام نے تحریک پاکستان میں مثبت کردار ادا کیا۔ تحریک پاکستان میں علمائے حق اور مشائخ کرام کی قائم کردہ فعال تنظیم ''آل انڈیا سنی کانفرنس'' کی جدوجہد مثالی اور تاریخ کے روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے اس تنظیم کے تحت ملک بھر میں تحریک پاکستان کے حق میں موثر کانفرنسوں کا سلسلہ جاری رہا اور اسی تنظیم کے زیر اہتمام بنارس کے مقام پر ایک عظیم الشان کانفرنس ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوئی جس میں ہزاروں علمائے حق اور مشائخ عظام کے علاوہ لاکھوں مسلمان شریک ہوئے اسی موقع پر آل انڈیا سنی کانفرنس نے جو متفقہ موقف اختیار کیا وہ یہ تھا کہ پاکستان ہماری زندگی ہے۔ اس کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ مین خدانخواستہ مسلم لیگ اگر مطالبہ پاکستان سے دستبردار بھی ہو جائے تو آل انڈیا سنی کانفرنس اس مطالبہ سے دستبردار نہ ہو گی۔

یوں علمائے حق اور مشائخ عظام نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کی محنتوں و کاوشوں کے نتیجہ میں مملکت خداداد پاکستان ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آجاتی ہے۔

علماء بنی اسرائیل کا کردار

جن امتوں پر زوال آیا اور جو صفحہ ہستی سے مٹ گئیں درحقیقت اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے قلب نے اپنا وظیفہ حیات ادا کرنا ترک کر دیا تھا۔ عیسائیت اور یہودیت کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کے تھوڑے عرصہ بعد ان کے قلب نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے؛

یا ایھا الذین اٰمنو ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل الله . (التوبۃ ۹: ۳۴)

اے ایمان والو (اہل کتاب کے) بہت سے عالم اور درویش، لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور (لوگوں کو) خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔

بنی اسرائیل کا قلب احبار ورھبان یعنی علماء و مشائخ تھے جو کام انہیں کرنا چاہیے تھا وہ چھوڑ دیا اور جو نہ کرنے کا تھا وہ کرنے لگے ان کا کام تو اللہ کی طرف رہنمائی کرنا تھا الٹا راستہ روکنے لگ گئے بجائے رہبر بننے کے راہزن بن گئے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خاتم الانبیاء ﷺ کے وارثوں سے بزم جہاں کبھی بھی خالی نہیں رہی مخبر صادق ﷺ کا ارشاد ہے۔

لا تزال طائفۃ من امتی قوامۃ علی امر اللہ لا یضرھا من خالفھا. (ابن ماجہ)

میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ جادۂ حق پر قائم رہے گی اس کی مخالفت کرنے والا اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

جس طرح قلب کے لیے حیات وحرکت کے علاوہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے ایسے ہی قلب امت کے لیے بھی حیات وحرکت کے علاوہ حرارت کا ہونا بھی لازمی ہے اور اس قلب امت کی حرارت کا سرچشمہ اور منبع سرور کائنات ﷺ کی ذات اقدس ہے اس کی حرارت عشق مصطفیٰ ﷺ اور محبت مصطفیٰ ﷺ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی حرارت سے دینی حمیت، مذہبی غیرت، مجاہدہ و جہاد فی سبیل اللہ کا جوش وخروش ابھرتا ہے اور اسی سے روحانی کمالات و مقامات تک رسائی ممکن ہوتی اور باطل سے ٹکرانے کی ہمت و جرأت اور مشکلات میں استقلال و استقامت کی دولت ملتی ہے اور اسی سے دنیا میں امن و امان و سلامتی عدل و انصاف، مہر و وفا، ایثار و ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور اسی حرارت سے حق و باطل کے میدان مین امتیاز کی بصیرت میسر آتی ہے۔

انگریز جب انتہائی مظالم و استبداد کے باوجود برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں سے اپنی نفرت اور جذبہ حریت کو ختم کرنے میں ناکام ہوا تو اس نے مسلمانوں کو دبانے کے لیے دیگر ذرائع سے کام لیا۔

مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ماضی کے حالات سے تجزیہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی اس دینی حمیت، مذہبی غیرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا جوش وخروش اور باطل سے ٹکرانے کا حوصلہ و ہمت کا سبب اور ان کی وحدت کا مرکز حضور ﷺ کی ذات سے وابستگی اور آپ کا عشق و محبت ہے۔ لہٰذا اگر ان پر حکومت کرنی اور انہیں شکست دینی ہے تو حب رسول ﷺ کی یہ انمول دولت ان سے چھین لو۔

وہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا روح محمد اس کے بدن سے نکال دو

مگر یہی علمائے حق تھے جو عظمت مصطفیٰ ﷺ کے خلاف اٹھنے والے ہر طوفان کے سامنے سد سکندری ثابت ہوئے اور عظمت مصطفیٰ ﷺ کے خلاف ابھرنے والے

ہر فتنہ کی سرکوبی کے لیے تن من دھن کی قربانیاں دیں۔ اور عشق مصطفیٰ کی شمع کو ملت اسلامیہ کی سینوں میں فروزاں رکھنے کے لیے ہر باطل کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

جب برصغیر میں انگریزی استعمار کا تسلط مضبوط ہو گیا تو انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنے دین سے بیگانہ کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو یکسر نظر انداز کر کے اپنا نظام تعلیم رائج کیا، جس سے علوم اسلامیہ کو بے دخل کر دیا گیا تو اس صورتحال کو بھانپتے ہوئے علمائے حق نے دین کو ان کے دست برد سے بچانے کے لیے دینی مدارس کی طرف بھی زیادہ توجہ دی۔ چنانچہ علامہ فضل حق خیر آبادی انگریزوں کی اس ناپاک سازش کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں؛

انگریزوں نے بچوں اور ناسمجھ لوگوں میں اپنے دین وزبان کو رواج دینے کے لیے دیہاتوں اور شہروں میں مدارس قائم کیے اور علوم و معارف کے دانش کدے و مدارس اور وہ تعلیمی ادارے جو ماضی میں قائم کیے گئے تھے سب کے نام ونشان تک مٹا دیے۔ اور ان جدید مدارس میں (اپنے مذہب وزبان) کی تعلیم وتلقین اور گمراہی وفتنہ پھیلانے کی غرض سے پادریوں اور راہبوں کی تعیناتی عمل میں لائی گئی۔

(مقالہ علامہ فضل حق خیر آبادی: ۳۵۱)

ان حالات میں علمائے حق نے دین حق کو یہودیت وعیسائیت کی جانب سے چلنے والی گمراہ کن آندھیوں اور تاریکیوں سے بچانے کے لیے دینی مدارس کے قیام پر زیادہ توجہ دی۔ اور یہ عمل یقیناً وقت کی ایک اہم ضرورت تھی ۔ ان مدارس نے مسلمانوں کی سیاسی بیداری، دینی تعلیم، علماء وفقہاء کی ایک بھاری تعداد پیدا کرنے میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ اور انہیں مدارس نے اپنے دور اولین میں ایسے رجال کار پیدا کیے جن کا علم حیات بخش، جن کا عمل نمونہ زندگی تھا اور ان کے کردار نے

ہر شعبہ کو حیات نو کا پیغام دیا۔

ہمارا المیہ

بدقسمتی سے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد بھی اس ملک میں دو متوازی نظام تعلیم رائج رہے۔ایک دینی مدارس کا نظام تعلیم اور دوسرا جدید مروجہ تعلیمی نظام۔ جدید تعلیمی نظام بھی دو عملی کا شکار ہے اس میں ایک طرف عوام کے بچوں کے لیے عام تعلیمی ادارے ہیں جن میں ٹاٹ اور ڈیسک سے لے کر تربیت یافتہ اساتذہ تک ہر چیز کی کمی ہے اور دوسری طرف انگلش میڈیم سکول ہیں جن کے بھاری اخراجات صرف امیر خاندان ہی برداشت کر سکتے ہیں۔

اس جدید مروجہ تعلیمی نظام نے ایسے افراد تو مہیا کیے جو متوارث نظام حکومت چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن علوم اسلامیہ سے نابلد ہونے کی وجہ سے وہ ایک نظریاتی ریاست کو اسلام کے انقلابی اصولوں کے تحت تعمیر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

قومی ترقی و تعمیر کی بنیاد نظام تعلیم پر ہے۔لیکن قیام پاکستان کے بعد اتنے طویل عرصے میں نہ تو دینی مدارس نے کوئی انقلابی قدم اٹھایا اور نہ جدید مروجہ نظام ہائے تعلیم نے اصلاحی اقدامات کیے دونوں نظام محتاج اصلاح ہیں۔

ہمارے دینی مدارس کا نصاب اپنی افادیت کے باوجود ہر دم رواں دواں زندگی سے ہم آہنگ نہ ہونے اور غیر ملکی آقاؤں کی گہری سازش کی وجہ سے معاشرے میں اس نصاب کے فیض یافتہ مردان صالح کا اثر و نفوذ کم ہو کر رہ گیا۔

جب تک ہمارے دینی مدارس کا نصاب زمانے کے تقاضوں کے مطابق تھا

ان مدارس سے نکلنے والے لوگوں کا زمانہ استقبال کرتا تھا اور علوم و فنون کے شعبہ جات کے علاوہ ملک کے انتظامی معاملات کی باگ ڈور بھی ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔

مگر اس کے بعد زمانہ پوری تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا گیا لیکن ہمارے دینی مدارس وہیں ٹھہرے رہے۔ جہاں پر سینکڑوں برس پہلے قدم رکھا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مدارس جہاں سے فارغ ہونے والے ملک کے بہترین منتظم اور مدبر اور اعلیٰ عہدیدار بننے کی قابلیت کے حامل ہوتے تھے۔ آج ان کی تعلیم کو زمانے کی مانگ سے رشتہ نہ رہا۔

مروجہ مغرب زدہ جدید تعلیمی نظام بھی دینی اخلاقی، معاشرتی، تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے ہماری نئی نسل کی اکثریت اپنے مذہبی، دینی، اخلاقی و روحانی اقدار سے بیگانہ اور مزاج و عادات و معاشرت میں اہل مغرب کی نقال بنتی جا رہی ہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ علمائے حق اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے دینی مدارس کے نصاب میں انقلابی تبدیلیاں لا کر اس کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں؟ زمانے اور نظام تعلیم کے بُعد کو ختم کرنے کی کوشش کریں؟ زمانے کی چال اور نظام تعلیم کو مربوط کرنے کی کوشش کریں؟ اور ایسا متوازی نظام تعلیم تشکیل دیں جو ایسے افراد تیار کرے جو اخلاقی دینی و روحانی اقدار پر غیر متزلزل ایمان و عقیدہ اور عمل کی راستی کے حامل ہونے کے علاوہ بازی گاہ عالم میں محض نقال نہ ہوں بلکہ اپنی تگ و تاز سے ایک نئی دنیا کے معمار ہوں؟

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کا فقہی مقام

فتاویٰ رضویہ کی روشنی میں

زمانہ کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ نشیب وفراز آتے رہتے ہیں۔ زمانے کا عمل جس طرح اجسام کو متاثر کرتا ہے۔ ایسے ہی ذہن وعقل کو بھی متاثر کرتا ہے۔ جس سے اقوام کے حالات دیگر گوں ہونے لگتے ہیں۔ جب ملت کے حالات دگر گوں ہوتے ہیں تو پھر وہ رب ذوالجلال اپنی عادت کے مطابق انقلاب آفریں شخصیات اور مصلحین کو بھیجتا ہے۔ وہ تشریف لا کر ملت کے بگڑے ہوئے حالات کو سنوارتے ہیں اور تمام تر تاریکیوں کو اپنی ضیاء پاشیوں سے منور فرماتے ہیں۔ چنانچہ دروازہ نبوت کے بند ہونے سے قبل یہ منصب انبیاء کرام علیہم السلام کو عطا فرمایا جاتا تھا لیکن رسالت ونبوت کے ختم ہونے کے بعد یہ اعلیٰ منصب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت کے اولیاء وعلماء کو عطا فرمایا کہ وہ دنیا میں تشریف لا کر دین متین کی اشاعت وترویج میں مصروف عمل ہوں اور باطل کی سرکوبی، طاغوتی اور شیطانی قوتوں کا سر توڑ مقابلہ کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس ملت مسلمہ کے اندر بڑی بڑی ہستیاں اور مجددین ومصلحین بھیجے جن کے زندگی کے سارے معمولات اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، گفتگو کرنا، خاموش رہنا، خوش ہونا، رنجیدہ ہونا اور محبت اور غصے کا اظہار کرنا تمام کے تمام صرف رضا الٰہی اور اتباع رسول ﷺ کی خاطر ہوتے تھے۔

جب برصغیر کی امت مسلمہ کے حالات دیگر گوں ہورہے تھے اور لوگ پھر سے ایسے رہبر کی تلاش میں تھے کہ جو برصغیر پاک وہند کے اندھیروں میں عشق مصطفیٰ ﷺ کی شمع کو روشن کرے تو اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ جیسی ہستی

کو پیدا فرمایا جو میدان علم میں تحقیق و تدقیق کے شاہسوار، اخلاق و عادات میں لائق تقلید اور عبادت و ریاضت میں یگانہ روزگار اور آسمان فقہ کے درخشندہ آفتاب تھے۔

آپ کی عظمت و کردار نے بیگانوں سے اپنا لوہا منوایا اور آپ کے خلوص و للہیت نے نفسانفسی کی اس دنیا میں تصنع اور نمود و نمائش کے بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا آپ آسمان علم کے وہ مہر تاباں تھے جس نے قلوب و ضمائر کو مستنیر کیا، آپ حقائق و دقائق کے وہ بحر ناپیدا کنار تھے جس کی ایک ایک بوند علم و عرفان کے پیاسوں کی تشنگی بجھاتی رہی۔ اعلیٰ حضرت کی ذات وہ ذات ستودہ صفات ہے جس نے عشق رسول ﷺ کی شمع برصغیر کے گوشے گوشے میں روشن فرمائی امام احمد رضا کی ذات ایک ماہ درخشاں کی حقیقت رکھتی ہے جس کی ضیاء پاشیوں سے برصغیر پاک و ہند بلکہ تمام عالم اسلام میں مسلک اہل سنت کی اشاعت ہوئی اور عشق رسول کی ٹمٹمانے والی شمع دوبارہ سے روشن ہوئی۔

مجدد ملت اعلیٰ حضرت کی شخصیت وہ شخصیت ہے جس نے ناموس رسالت پر ہونے والے تمام ناپاک حملوں کا تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر کے ذریعہ مقابلہ فرما کر معاندین اسلام اور مخالفین اہل سنت کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ آج اپنے علم پر فخر و ناز کرنے والے آپ کی تصنیفات کو سمجھ بھی نہیں سکتے اور اپنی اس علمی کمزوری اور جہالت پر پردہ ڈالنے کے لیے اعلیٰ حضرت پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کی کتب میں ابہام و تعقید پایا جاتا ہے چنانچہ ایک صاحب نے یہ اعتراض کر کے اپنی جہالت کا خود ثبوت فراہم کیا ہے۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علمی و فنی انداز پر بات کرتے ہیں لیکن جن لوگوں کا مبلغ علم صرف حماسہ، مقامات، متنبّی اور عربی ادب کی چند کتب اور ریاض الصالحین ہو تو وہ علمی اور فنی باتیں کیا سمجھ سکیں گے۔ ہمارا دور دقت نظر کی کمی اور علم

وعمل کے انحطاط کا دور ہے۔ اور وہ شعور و فکر و فہم اور جو ہر دقت نظر مفقود ہے جو ہمارے اسلاف کا گرانقدر سرمایہ تھا۔ علم و فکر کا وہ دور ارتقاء ختم ہو گیا۔ تحقیق و تجسس اور تفحص و تفکر کے راستوں پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ نئے راستے ہی نہیں قدیم راستے بھی چھپ گئے۔

مدتوں سے قدم ان راستوں سے نا آشنا ہو گئے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلاف کرام کی گرانمایہ خدمات اسلامیہ کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا جائے اور ان علمی و فکری کارناموں سے لوگوں کو متعارف کرایا جائے تا کہ نئی نسلیں اپنے ان عظیم مذہبی پیشواؤں کے بتائے ہوئے خطوط کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے میں مدد لیں اور ان کی پاکیزہ زندگیوں کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ ان کی دینی خدمات جلیلہ کو دیکھ کر ان کے دلوں میں بھی اسلام کی خدمت کا جذبہ و اشتیاق پیدا ہو بالخصوص امام اہل سنت مولانا شاہ احمد رضا فاضل بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمات جلیلہ سے دنیا والوں کو روشناس کرایا جائے۔

اس عظیم ہستی نے علم و آگہی کا گراں بہا گنجینہ چھوڑا ہے۔ اگر اس سے استفادہ کیا جائے تو ثریا پر کمندیں ڈالی جا سکتی ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ کی علمی کاوشیں اپنوں کی بے توجہی پر نوحہ کناں ہیں۔ امام احمد رضا سے عقیدت کا دم بھرنے والے تو بہت ہیں مگر اپنے اس عظیم محسن کو صحیح معنوں میں متعارف کرانیوالوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

اکثر و بیشتر عقیدت کا دعویٰ کرنے والے اعلیٰ حضرت کو ان کے علمی کارناموں کے ذریعہ متعارف کرانے کے بجائے تقریروں میں داد حاصل کرنے کی خاطر آپ کے نعتیہ اشعار پڑھتے ہیں جس سے آپ عوام میں مشہور تو ہو گئے مگر ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے حالانکہ وعظ و تقریر اور زبانی دعوؤں سے ارباب علم و دانش کو متاثر نہیں

کرایا جاسکتا بلکہ انہیں حقائق وشواہد اور دلائل سے متاثر کرایا جاسکتا ہے ان حقائق کے پیش نظر ہمیں ذرائع ابلاغ کا موثر ترین ذریعہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور وہ موثر ترین ذریعہ تصنیف وتالیف ہے کہ جس کے ذریعہ ہم امام احمد رضا کے علمی حقائق اور فقیہانہ موشگافیاں دنیا والوں کے سامنے پیش کر کے یہ ثابت کر دیں کہ ہمارے دعووں کی بنیاد محض عقیدت پر نہیں بلکہ حقیقت پر قائم ہے۔

بحمدہٖ تعالیٰ حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ ادارہ رضا فاؤنڈیشن اور ادارہ تحقیقات امام احمد رضا، مرکزی مجلس رضا، اور رضا اکیڈمی نے اس سلسلہ میں اہم اور قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔

میں نے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ کے فقہی مقام کے بارے میں کچھ تفویض قلم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے قلم میں وہ زور اور توانائی کہاں کہ میں مجدد دین وملت امام اہل سنت امام احمد رضا کے فقہی مقام کی توضیح وتشریح کروں۔

میں نے اپنے مطالعے اور فہم کے مطابق واپنے مقالے کو مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کیا۔

۱۔ اعلیٰ حضرت کا مختصر تعارف — ۲۔ فقہ کی لغوی واصطلاحی تعریف
۳۔ طبقات فقہاء کرام — ۴۔ وضع ضوابط کلیہ
۵۔ ندرت تخریج — ۶۔ تطبیق بین الاقوال المتعارضیہ
۷۔ ترجیح بین الاقوال المتبائنہ — ۸۔ اقوال سلف کی توجیہات
۹۔ تنقیح مسائل — ۱۰۔ اصلاح واضافہ
۱۱۔ تکاثر دلائل — ۱۲۔ علوم عصریہ سے فقہ کی تائید
۱۳۔ فقہاء متقدمین اور اعلیٰ حضرت — ۱۴۔ معاصرین اور اعلیٰ حضرت

۱۵۔ اعلیٰ حضرت کی اصول فقہ میں تحقیقات

ہر عنوان کے تحت دو سے لیکر پانچ تک نظیریں ذکر کر کے عنوان کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دنیائے اسلام کے بطل جلیل، چودھویں صدی کے مجدد، امام اہل سنت حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے فقہی مقام کے بارے میں کچھ تفویض قلم کرنے سے قبل اختصار سوانحی خاکہ پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

مختصر تعارف

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ کی پیدائش ۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۵۶ء بروز اتوار بریلی کے محلہ جسولی میں ہوئی۔ پیدائشی نام محمد اور تاریخی نام المختار ہے۔ جد امجد حضرت مولانا رضا علی خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے آپ کا نام احمد رضا رکھا۔ اعلیٰ حضرت نے اپنی ولادت کا سن ہجری اس آیت کریمہ سے نکالا ہے۔

اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایّدھم بروح منه (المجادلة ۵۸)

اعلیٰ حضرت کا بچپن بہت ناز و نعم میں گزرا فطری طور پر ذہین تھے۔ اور حافظہ بلا کا قوی تھا چار سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کیا چھ سال کی عمر میں اردو، فارسی، کی کتب پڑھنے کے بعد میزان منشعب وغیرہ کی تعلیم مولانا مرزا غلام قادر بیگ سے حاصل کی۔ پھر تمام دینیات کی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا نقی علی خان رحمۃ اللہ تعالیٰ سے مکمل کی تیرہ برس دس ماہ کی عمر میں تفسیر، حدیث کلام، فقہ، وغیرہ تمام علوم دینیہ کی تکمیل کر لی۔ فراغت کے بعد آپ کے والد ماجد مولانا نقی علی خان نے افتاء کی ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی۔ آپ کی تمام عمر درس و تدریس، افتاء و تصنیف میں بسر

ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس سے والہانہ عشق تھا۔ ذکر وفکر کی ہر مجلس میں تصور رسالت سے ذہن سرشار رہتا۔

آپ نے علم وعمل کے ہر پہلو میں عظمت رسول کو اجاگر کیا۔ ناموس رسالت پر حملے کرنے والوں کا غیرت ایمانی سے محاسبہ کیا۔ اور اپنی تمام زندگی عقائل اسلامیہ کی حفاظت میں گزاری۔

اعلیٰ حضرت دومرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت روضہ نبوی سے مشرت ہوئے دونوں سفروں میں عرب کے اسلامی وعلمی مراکز کا بھی مشاہدہ کیا۔ اور وہاں کے جید علماء کرام سے ملاقات کی اور معاملات دینیہ میں مشورے بھی کیے۔ حرمین طیبین کی یگانہ روزگار علمی ہستیوں نے اعلیٰ حضرت قدس سرہ کو نابغہ روزگار اور عدیم النظیر محقق تسلیم کیا۔

آپ کی تصانیف عربی، فارسی اردو زبانوں میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ ایک ہزار سے زائد ہیں۔ پچاس سے زائد فنون پر آپ کی تصنیفات مشتمل ہیں۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے اپنی تصانیف کے قیمتی ذخائر اور علمی وفکری سرگرمیوں سے بھرے خزانے چھوڑے ہیں۔

یہ علم وعمل کا نیر اعظم ۱۸ صفر ۱۳۴۰ھ بمطابق ۱۹۲۱ء دوپہر دو بجکر ۳۸ منٹ پر شفق محبت کی گود میں ہمیشہ کے لیے محبوب کی معیت میں سو گیا اور اپنے وصال کی تاریخ قرآن مجید کی اس آیہ کریمہ سے استخراج کی:

ویطاف علیهم بانیة من فضة واکواب ؛ (الدهر . ۷۶)

فقہ کا لغوی معنیٰ

فقہ کا لغوی معنیٰ کسی شئے کا جاننا اور سمجھنا ہے جیسا کہ صاحب منجد نے فقہ کا معنیٰ العلم بالشئی والفھم بہ کیا ہے۔علامہ میر سید شریف فقہ کی لغوی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الفقہ ھو فی اللغۃ عبارۃ من فھم غرض المتکلم من کلامہ (التعریفات)

یعنی متکلم کے کلام سے اس کی مراد کو سمجھنے کو فقہہ کہا جاتا ہے۔

فقہ کی اصطلاحی تعریف

اصطلاحی شرح میں احکام شرعیہ عملیہ کو ادلہ تفصیلیہ کے ساتھ جاننے کو فقہ کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت صدر الشریعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ توضیح میں رقمطراز ہیں:

علم بالاحکام الشرعیۃ العملیۃ من ادلتھا التفصیلیۃ

(التوضیح والتلویح ص ۳۰)

حضرت علامہ محبّ اللہ بہاری رحمہ اللہ الباری نے بھی مسلم الثبوت کے اندر یہی تعریف کی ہے۔حضرت امام الائمہ سراج الامہ، امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کے مطابق فقہ انسان کے مالہ، وما علیہ کی معرفت کا نام ہے۔جیسا کہ صاحب توضیح نے نقل فرمایا ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فقہ کی تعریف **معرفۃ النفس مالھا وما علیھا** ہے۔ (التوضیح والتلویح ص ۲۸)

حضرت صدر الشریعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وغیرہ اصولیین نے فقہ کی جو تعریف کی ہے اس تعریف کے مطابق فقیہ کا اطلاق صرف مجتہد پر صادق آسکتا ہے اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب فاضل بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ اگرچہ فقیہ

مجتہد فی الشرع اور مجتہد مطلق تو نہیں لیکن اجتہاد کی جھلک آپ کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔آپ نے ایسے متعدد قواعد وضوابط ایجاد فرمائے ہیں کہ جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتے اور ان تمام قواعد وضوابط کا استنباط قرآن وسنت سے کیا ہے۔اگر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ کے ان اجتہادی کارناموں کو امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پیش کیا جاتا تو وہ بھی نظر تحسین سے دیکھتے جس نے اعلیٰ حضرت کی فقاہت کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو وہ بلاخوف وتردید آپ کی شخصیت کو اجتہادی شان کی حامل قرار دے سکتا ہے۔

اب ہم مزید وضاحت کے لیے طبقات فقہاء کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد اعلیٰ حضرت کی فقہی تحقیقات کا ذکر ہوگا تا کہ یہ معلوم کرنا کوئی مشکل نہ رہے کہ آپ طبقات فقہاء میں کس مقام ومرتبے کے مالک ہیں۔

طبقات فقہاء:

علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فقہاء کو سات طبقات میں منقسم فرمایا ہے۔

۱۔ **مجتہدین فی الشرع:** اس طبقے میں وہ لوگ شامل ہیں جو قواعد و اصول مقرر فرماتے ہیں اور احکام فرعیہ کا اصول اربعہ سے استخراج کرتے ہیں اور اصول وفروع میں کسی کے تابع نہیں ہوتے جیسا کہ امام اعظم ،امام مالک وامام شافعی و امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ۔

۲۔ **مجتہدین فی المذہب:** یہ وہ حضرات ہیں جو صرف اصول میں امام کے تابع ہوتے ہیں اور ادلہ اربعہ سے فروع کے استنباط کی قدرت رکھتے ہیں اور بعض مقامات میں مسائل فرعیہ کے اندر امام کی مخالفت بھی کرتے ہیں جیسا کہ امام

قاضی ابو یوسف وامام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ۔

۳۔ **مجتہدین فی المسائل:** یہ وہ فقہاء کرام ہیں جو اصول وفروع میں امام کے تابع ہوتے ہیں البتہ جن مسائل میں امام سے کوئی روایت نہ ہو تو پھر یہ حضرات امام کے مقرر کردہ قواعد کے مطابق استنباط کرتے ہیں۔

۴۔ **اصحاب تخریج:** یہ وہ حضرات ہیں جو مجتہد تو نہیں ہوتے لیکن اصول اور ماخذ اصولی پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اسی لیے یہ قول مجمل کی تفصیل پر قدرت رکھتے ہیں جیسے حضرت ابوبکر رازی وجصاص کرخی رحمہما اللہ تعالیٰ۔

۵۔ **اصحاب ترجیح:** یہ بعض روایات کو بعض پر ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسا کہ امام ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

۶۔ **ممیّزین:** یہ وہ حضرات ہیں جو روایات میں صحیح، راجح، قوی، ضعیف ظاہر اور نوادر وغیرہ کے درمیان امتیاز دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس بارے میں گہری نظر کے مالک ہوتے ہیں۔

۷۔ **محض مقلدین:** یہ وہ حضرات ہیں جنہیں مذکورہ امور میں سے کسی پر بھی قدرت نہیں ہوتے۔ (عقود رسم المفتی ص ۴ تا ۵)

امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تصانیف کو نظر عمیق سے مطالعہ کرنے والے پر یہ بات نظری نہیں رہتی کہ مجتہدین فی المسائل کی تمام خصوصیات آپ میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کے زمانے میں سائنس ارتقائی منازل میں داخل ہو چکی تھی جس کی وجہ سے بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو چکے تھے جن کے بارے میں امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سے کوئی روایت نہ تھی آپ نے ان مسائل کو امام صاحب کے اصول وفروع کو مدنظر رکھتے

ہوئے استخراج و استنباط فرمایا۔ فتاویٰ رضویہ میں اس کی بکثرت امثلہ موجود ہیں۔ ایسے ہی اصحاب ترجیح و اصحاب تخریج وممیزین کی اکثر خصوصیات کے مالک ہیں۔ جس کی وضاحت آپ کی فقہی تحقیقات کے ضمن میں ہوگی جو آئندہ صفحات میں پیش کی جائیں گی۔

اصول فقہ میں اعلیٰ حضرت کی تحقیقات

اعلیٰ حضرت ایک فطری فقیہ کا مزاج رکھتے تھے اور یہ بات مسلم ہے کہ ایک فقیہ کے لیے جہاں علوم کثیرہ میں مہارت و حذاقت کی ضرورت ہے وہاں اصول فقہ میں غایت درجے کی نظر عمیق کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ علم فقہ کی سب سے قریب ترین اساس اصول فقہ ہے۔ نیز اس کے بغیر قرآن وسنت کے مفہومات و ارشادات، معارف و رموز تک رسائی ناممکن ہے اسی لیے جملہ فقہاء کرام کی کتب اور ارشادات اصول فقہ پر مبنی ہیں۔ امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فتاویٰ میں جا بجا اصول فقہ کے مسائل اور ابحاث پر تحقیقات فرمائی ہیں جو آپ کی اصولی بصیرت و مہارت کی تابندہ دلیلیں ہیں۔

آپ نے بعض مقامات پر اہل اصول سے اختلاف بھی کیا اور کہیں لاینحل مسائل کی عقدہ کشائی بھی فرمائی۔ آپ کی ان تحقیقات میں سے کچھ بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

ا۔ تقسیم احکام

افعال عباد سے جو احکام متعلق ہیں ان کی تقسیم مین اہل اصول کے اقوال میں تضاد پایا جاتا ہے۔ بعض نے پانچ قسمیں کی ہیں یعنی۔ ا۔ ایجاب ۲۔ ندب ۳۔ تحریم

۴۔مکروہ ۵۔اباحت اور بعض حضرات نے سات اقسام میں منقسم فرمایا ہے۔
۱۔فرض ۲۔واجب ۳۔سنت ۴۔نفل ۵۔حرام ۶۔مکروہ ۷۔مباح۔لیکن اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز نے حکم کی گیارہ قسمیں قرار دی ہیں جو آپ کی وقت نظری اور بصیرت اصولی کی بین دلیل ہے۔

۱۔فرض: جس فعل کا ثبوت ولزوم دلالت قطعی کے طور پر ہو اور اس کا انکار کفر، ترک موجب استحقاق عذاب ہو ترک خواہ دائما ہو یا نادراً۔

۲۔واجب: جس فعل کا ثبوت ولزوم دلالت قطعی کے طور پر نہ ہو اور اس کا انکار کفر نہ ہو لیکن اس کا ترک موجب استحقاق عذاب ہو خواہ ترک دائما ہو یا نادراً۔

۳۔سنت موکدہ: جس فعل کا تا کد مواظبت رسول ﷺ سے ثابت ہو اور اس کا عادۃ ترک موجب عذاب ہو اور نادراً ترک موجب استحقاق عتاب ہو۔

۴۔سنت غیر موکدہ: جس فعل کا ترک کرنا موجب استحقاق عتاب ہو خواہ ترک عادتاً ہو یا نادراً۔

۵۔مستحب: جس کام کے کرنے پر ثواب ہو اور ترک پر نہ ثواب نہ عتاب ہو خواہ عادتاً ہو یا نادراً۔

۶۔مباح: جس کا کرنا نہ کرنا برابر ہو نہ فعل پر عتاب نہ ترک پر خواہ عادۃً ہو یا نادرا۔

۷۔حرام: جس کام سے روکنے کا لزوم ثبوتاً ودلالۃً قطعی ہو اور اس کا انکار کفر ہو اور اس کا فعل موجب استحقاق عذاب ہو خواہ فعل دائما ہو یا نادراً۔

۸۔مکروہ تحریمی: جس کام سے روکنے کا ثبوت ولزوم دلیل ظنی سے ہو اور اس کا انکار کفر نہ ہو لیکن اس کا فعل موجب استحقاق عذاب ہو خواہ فعل دائما ہو یا نادراً۔

۹۔اسأت: جس کام کا عادۃ کرنا موجب استحقاق عذاب اور نادراً کرنا موجب عتاب ہو۔

۱۰۔ مکروہ تنزیہی: جس کا مطلقاً کرنا موجب استحقاق عتاب ہو خواہ عادۃ ہو یا نادراً۔

۱۱۔ خلاف اولیٰ: جس کام کا نہ کرنا موجب استحقاق ثواب اور کرنا نہ موجب استحقاق عذاب ہو اور نہ ہی موجب استحقاق عتاب خواہ عادۃ کیا جائے یا نادراً۔

یہ وہ تقسیم ہے جس کے بارے میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں اس تقریر منیر کو حفظ کر لیجئے کہ ان سطور کے غیر میں نہ ملے گی اور ہزار ہاء مسائل میں کام دے گی اور صدھا عقدوں کو حل کرے گی۔ کلمات اس کے موافق و مخالف سب طرح ملیں گے مگر بحمد اللہ تعالیٰ حق اس سے تجاوز نہیں۔ فقیر طمع رکھتا ہے اگر حضور سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حضور یہ تقریر عرض کی جاتی تو ضرور ارشاد فرماتے کہ یہ عطر مذہب وطراز مذہب ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ا۔ ب ص ۹۰۷ تا ۹۰۹)

تقسیم احکام کے بعد تعریفات و قیود کا مرحلہ آتا ہے امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ اس موقع پر ماہر اصولی نظر آتے ہیں اصول فقہ کے مسائل میں سے فرض وواجب کی تعریف اور پھر ان کی اعتقادی و عملی کی طرف تقسیم ہے لیکن اس بارے میں علماء کے اقوال جامعیت کے ساتھ نہیں ملتے لیکن اعلیٰ حضرت نے تعریف و قیود میں مکمل جامعیت کو ملحوظ رکھا ہے۔

فرض اعتقادی و واجب اعتقادی

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں مجتہد جس شئی کی طلب جزمی حتمی کا ایسا اذعان کرے جو اصول میں معتبر ہو تو فرض اعتقادی ہوگا ورنہ واجب اعتقادی یعنی اگر مجتہد کسی شئی کی طلب جزمی حتمی ایسا اذعان نہ کرے جو اصول میں معتبر ہے تو وہ واجب اعتقادی ہوگا۔

اس تعریف کے مطابق فرض اعتقادی وہ ہوگا جس پر تمام ائمہ دین کا اتفاق و

اجماع ہو۔

فرض عملی: وہ فرض ہے جس کا ثبوت مجتہد کی نظر میں بحکم دلائل شرعیہ تیقن سے ہو کہ جس کے کیے بغیر آدمی بری الذمہ نہ ہو یہاں تک کہ اگر وہ کسی عبادت میں فرض ہو تو وہ عبادت بدون اس کے باطل و کالعدم ہو۔

واجب عملی: واجب عملی وہ واجب اعتقادی ہے کہ جس کے کیے بغیر بری الذمہ ہونے کا احتمال ہو لیکن غالب اس کی ضرورت پر ہو واجب عملی کے بغیر عبادت ناقص رہتی ہے صاحب کافی نے فرض عملی کی تعریف بما یفوت الجواز بفوتہ اور تحریر میں ماقطع بلزومہ سے کی تھی۔

لیکن ان دونوں تعریفوں پر اعتراض ہوتا ہے کہ صاحب کافی کی تعریف جامع نہیں کیونکہ چوتھائی حصہ سر کا مسح فرض عملی ہے لیکن یہ قطعی اللزوم نہیں لہٰذا ان کی تعریف کے مطابق سر کے چوتھائی حصے کا مسح کرنا فرض عملی سے خارج ہوتا ہے۔ لیکن صاحب نہایہ نے اس اعتراض سے بچنے کے لیے یہ احتمال پیدا کیا کہ ممکن ہے کہ مقدار مسح کے بارے میں فرض بمعنی واجب ہو صاحب بحر نے اس کی تاویل یہ کی کہ خصوصیت مقام سے فرض کی قطعیت وظنیت کا فرق ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے قطعیت کو تین قسموں میں تقسیم فرمایا۔

۱۔ **عام:** کہ جس میں عوام وخواص مشترک ہوں یہ ضروریات دین میں سے ہوتی ہے۔

۲۔ **خاص:** کہ جو ماہرین علم کے ساتھ خاص ہوتی ہے یہ اجتماعی فرض اعتقادی میں پائی جاتی ہے۔

۳۔ **اخص:** جو بعض مخصوص علماء کے ساتھ خاص ہوتی ہے جو کسی عالم کے ذہن کو قرائن و

شواہد کی وجہ سے درجہ تیقن تک پہنچا دیتی ہے لیکن دوسرے اس مرتبے سے محروم ہوتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ کسی صحابی نے حضور علیہ ﷺ سے بلا واسطہ کوئی حکم سنا ہو تو یہ حکم ان صحابی کے لیے قطعی ویقینی ہے لیکن سامع کے لیے یہ خبر واحد ہونے کی وجہ سے ظنی لہٰذا فرض اعتقادی کی قطعیت پر تمام اہل علم کا یقین ضروری ہے اور جس چیز کی فرضیت صرف ایک مجتہد کی نظر میں بالیقین ہو تو وہ فرض عملی ہے۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے علامہ شامی کا ایک قول نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ صاحب بحر کا قول جملہ اہل اصول کے خلاف ہے کیونکہ اہل اصول کے نزدیک فرض کی تعریف۔ ماثبت بدلیل قطعی لاشبهة فیہ ہے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں علامہ شامی کا یہ اعتراض برمحل نہیں کیونکہ اہل اصول کی اصطلاح کی ہر جگہ پابندی لازمی نہیں ہوتی بلکہ اہل اصول خود فرض کا اطلاق ظنی و قطعی دونوں پر کرتے ہیں مثلاً الوتر واجب الوتر فرض اور تعدیل الارکان واجب تعدیل الارکان فرض وغیرہ۔

آخر میں فرماتے ہیں صحیح یہی ہے کہ قطعیت صرف نظر مجتہد میں ضروری ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۔ الف ص ۲۴۰)

دلائل سمعیہ کی تقسیم:

علامہ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ نے دلائل سمعیہ کی جو تقسیم فرمائی اس کو نقل کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک اعتراض کیا اور اسکے بعد جامع تقسیم فرمائی۔ علامہ طحاوی وغیرہ علماء کرام نے مندرجہ ذیل تقسیم فرمائی۔

۱۔ قطعی الثبوت وقطعی الدلالۃ جیسا کہ قرآن حکیم واحادیث متواترہ۔

۲۔ قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ جیسا قرآن مجید کی آیات مئولہ۔

۳۔ ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ جیسا کہ وہ اخبار احاد جنکے مفہومات ظنی ہوں۔

صرف استحباب کا فائدہ دیتی ہے۔

پوری بحث کا خلاصہ یوں نکلا کہ طلب فعل کی احادیث ستائیس اقسام پر منحصر ہیں۔ کیونکہ دلیل میں طلب محض ترغیباً ہے یا تاکیداً یا بطور لزوم پھر ان تینوں میں سے ہر ایک کی نسبت ثبوت واثبات میں یقین، ظن، شک کی طرف کی جائے تو کل ستائیس قسمیں بن جائیں گی۔ جن میں سے قطعی الثبوت والاثبات مع الطلب الجازم سے فرض ثابت ہوگا اور ظنی الثبوت والاثبات مع الطلب الجازم اور ظنی الثبوت قطعی الاثبات اور قطعی الثبوت وظنی الاثبات مع الطلب الجازم تینوں سے وجوب ثابت ہوگا اور چار سے سنت کا ثبوت ہوگا وہ یہ ہیں:

۱۔ قطعی الاثبات والثبوت مع الطلب الموکد غیر جازم۔

۲۔ ظنی الثبوت والاثبات مع الطلب الموکدہ غیر جازم۔

۳۔ ظنی الثبوت قطعی الاثبات مع الطلب الموکد غیر جازم۔

۴۔ قطعی الثبوت ظنی الاثبات مع الطلب الموکد غیر جازم۔ باقی انیس دلیلوں میں ثبوت یا اثبات میں شک ہوگا یا ثبوت واثبات تو یقینی یا ظنی ہونگے لیکن طلب بطور جزم نہ ہوگی بلکہ بطور ترغیب ہوگی تو ان تمام دلیلوں سے استحباب ثابت ہوگا۔

اعلیٰ حضرت نے دلائل سمعیہ جو تقسیم ثبوت واثبات کے اعتبار سے کی ہے یہ ایک ایسی نفیس اور جامع تقسیم ہے جو اس ترتیب و جامعیت کے ساتھ دیگر کتب میں نہیں ملتی۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۔ الف ص ۲۵۹)

وضع ضوابط کلیہ۔

جس طرح اصول فقہ علم فقہ کی قریبی اساس ہے ایسے ہی ضوابط کلیہ اور قواعد کلیہ فقہیہ بھی علم فقہ کے اہم ترین امور میں سے ہیں کیونکہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا

الصلوٰۃ والسلام اصول وفروع پر مشتمل ہے اور اصول پھر دو قسم کے ہیں:

۱۔ اصول فقہ ۲۔ ضوابط کلیہ۔

اعلیٰ حضرت جس طرح اصول فقہ میں یگانہ روزگار تھے ایسے ہی قواعد کلیہ میں بھی نوید عصر تھے بلکہ آپ نے خود بہت سارے ضوابط کلیہ وضع بھی فرمائے ہیں جن سے آپ کی خداداد صلاحیت علمیہ اور بصیرت فقہیہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ اعلیٰ حضرت علم فقہ میں اپنی مثال آپ تھے اور یہ طے شدہ امر ہے کہ علم فقہ بنی نوع انسان کے تمام معاملات کو محیط ہے اور اس علم کا تعلق براہ راست قرآن وسنت سے ہے لہٰذ جو فقہ کا عالم ہوگا وہ درحقیقت قرآن وحدیث کا عالم ہوگا اور قرآن وحدیث کا صحیح معنوں میں عالم وہ ہے جس پر علوم ومعارف کے سربستہ راز کھول دیئے گئے ہوں اور جس کے سینے پر رموز واسرار خود بخود منکشف ہو گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ حضرت کو یہ خصوصی مقام عنایت فرمایا تھا آپ کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے علوم ومعارف کے گنجینے کی حیثیت عطا فرمائی تھی یہی وجہ ہے کہ آپ نے ایسے ضوابط وضع فرمائے ہیں جو نہ تو متاخرین ومتقدمین کی کتب میں ملتے ہیں نہ ہی آپ کے معاصرین علماء کرام کی کتب میں۔ اب ہم آپ کے وضع کردہ ضوابط کلیہ وقواعد فقہیہ میں سے چند ضابطے بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔**ضابطہ کلیہ** : مفطرات صوم کے بارے میں اعلیٰ حضرت نے ایک ضابطہ کلیہ وضع فرمایا ہے روزہ دار کے پیٹ میں داخل ہونے والی اشیاء تین قسم کی ہیں۔ ۱۔ جن سے بچنا محال ہو۔ ۲۔ جن سے کلی طور پر احتراز کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہو یعنی کبھی نہ کبھی انسان کا ان کے ساتھ سابقہ ضرور پڑتا ہے جیسا کہ دھواں وغیرہ۔ ۳۔ وہ

اشیاء جن سے ہمیشہ بچ سکتا ہے اگر چہ بعض حالات میں مجبور ہو جیسے طعام وشراب۔
اس کے بعد فرمایا کہ پہلی قسم کی اشیاء بہر صورت مفطرات سے خارج ہیں اور قسم دوم بے قصد واختیار مفطر صوم نہیں اور بقصد وارادہ مفطر ہیں اور قسم سوم سے ہر صورت میں مفطر صوم ہیں خواہ قصد ہو یا نہ۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ص ۴۹۰ تا ص ۴۹۴)

۲۔ **ضابطہ کلیہ:** کسی حرام نجس شئی کا دوسری شئی میں مخلوط ہونے کے بارے میں یقین کیسے اور کب حاصل ہوگا اس بارے میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز نے ایک ضابطہ کلیہ وضع فرمایا کہ کسی حرام شئی کا دوسری شئی میں خلط ہونے کے متعلق یقین دو طرح حاصل ہوگا۔ ا۔ شخصی طور پر کہ کسی فرد خاص کے متعلق یقین ہو کہ اس میں خلط نجاست ہوا ہے مثلاً نجاست کو کنوئیں میں گرتے ہوئے آنکھوں سے دیکھا گیا ہو۔
۲۔ نوعی کہ جہاں مطلق نوع کے بارے میں یقین ہو کہ اس میں نجاست مخلوط ہوئی ہے ۔ پھر اس نوعی کو دو قسموں میں منقسم فرمایا۔ ا۔ اجمالی۔ جس میں صرف یہ ثابت ہو کہ اس نوع میں اختلاط واقع ہوتا ہے نہ یہ کہ اس نوع کے ہر فرد کے بارے میں علے العموم معلوم ہو۔ ۲۔ کلی۔ یعنی نوع کی نسبت بہ وجہ شمول وعموم اور دوام واستمرار اس معنے کا ثبوت ہو مثلاً تحقیق سے یہ ثابت ہو کہ فلاں نجس یا حرام شئی اس ترکیب کا جزو خاص ہے اور بناتے وقت اس میں شریک کرتے ہیں اور یہ تیقن تب حاصل ہوگا جبکہ بنانے والوں کو بالخصوص اس شئی حرام کے مخلوط کرنے میں کوئی غرض خاص مقصود ہو ورنہ بلا وجہ حرام متیقن نہیں ہو سکتا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۴ص ۵۲۸)

۳۔ **ضابطہ کلیہ:** ماءِ مستعمل کے بارے میں امام اہل سنت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا ضابطہ کلیہ وضع فرمایا کہ جس وجہ سے ماءِ مستعمل کے بارے میں فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے درمیان جتنے بھی اختلافات تھے وہ سب ختم ہو گئے اس ضابطے کے

بارے میں اعلیٰ حضرت خود فرماتے ہیں کہ اس قسم کی جامعیت ان سطروں کے علاوہ کہیں بھی نہ ملے گی۔ آپ فرماتے ہیں ماء مستعمل وہ قلیل پانی ہے جس کے ذریعہ یا تو نجاست حکمیہ کی تطہیر کر کے کسی واجب کو ساقط کیا گیا ہو یعنی انسان کے کسی ایسے پارہ جسم کو مس کیا ہو کہ جس کی تطہیر وضو یا غسل سے بالفعل لازم تھی یا ظاہر بدن پر اس کا استعمال خود کار ثواب تھا اور استعمال کرنے والے نے اپنے بدن پر اسی امر ثواب کی نیت سے بالفعل استعمال کیا اور یوں اسقاط واجب یا اقامت قربت کر کے عضو سے جدا ہوا اگر چہ ہنوز کسی جگہ مستقر نہ ہو بلکہ روانی میں ہو۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۳۹)

مائے مطلق کے بارے میں اعلیٰ حضرت نے ایک ضابطہ وضع فرمایا کہ جو اس جامعیت کے ساتھ نہ متقدین کی کتب میں مذکور ہے نہ متاخرین نے ذکر فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ مائے مطلق وہ پانی ہے جو اپنے رقت طبعی پر باقی ہو اور اس کے ساتھ کوئی ایسی شئے مخلوط و ممتزج بھی نہ ہو جو اس سے مقدار میں زائد یا مساوی ہو نہ ایسی جو اس کے ساتھ ملکر مجموع ایک دوسری شئی بن کر دوسرے مقصد کے لیے کہلائے اس ضابطے کو آپ نے فارسی کے دو شعروں میں منضبط فرمایا:

مطلق آب ست کہ بر رقت خود است — نہ در و مزج دگر چیز مساوی یا بیش
نہ مخلطے کہ بترکیب کند چیزے دگر — کہ بود ز آب جدا در لقب و مقصد

(فتاوی رضویہ ج ۲ ص ۴۵۱)

جانوروں کی قے کا حکم

جانوروں کی قے کی طہارت و عدم طہارت کے بارے میں امام احمد رضا قدس سرہ نے ایک ضابطہ وضع فرمایا کہ ہر جانور کی قے اس کی بیٹ کا حکم رکھتی ہے یعنی جس کی بیٹ پاک اس کی قے بھی پاک ہوگی مثلاً چڑیاں کبوتر وغیرہ اور جس کی بیٹ

نجاست خفیفہ کے حکم میں ہو اس کی قے بھی نجاست خفیفہ ہوگی جیسا کہ باز کوا وغیرہ اور جس کی بیٹ نجاست غلیظہ ہو تو اس کی قے بھی نجاست غلیظہ ہوگی جیسے بطخ یا مرغی وغیرہ کیونکہ قے سے مراد وہ کھانا پینا ہے جو پوٹے سے باہر نکلے۔ لہٰذا جس جانور کی بیٹ ناپاک ہوگی اس کا پوٹا معدن نجاست ہوگا اور پوٹے سے جو چیز نکلے گی وہ خود نجس ہوگی یا نجس سے ملکر آئے گی بخلاف اس چیز کے جو ابھی پوٹے تک نہیں پہنچی تھی کہ خارج ہوگئی تو یہ شئی بیٹ کے حکم میں داخل نہیں ہوگی کیونکہ یہ قے نہیں بلکہ سور ہے لہٰذا یہ جھوٹے کا حکم رکھے گی کیونکہ یہ نجاست بھی نہیں اور نہ ہی محل نجاست میں پہنچی۔ اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ مرغی پانی پی رہی تھی کہ اسے اچھالگا اور جو پانی ابھی گلے میں ہی تھا وہ باہر نکل گیا اس ضابطے کو ذکر فرمانے کے بعد اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اقول اتقن ھٰذا التحقیق النفیس فلعلک لا تجدہ مصرحا بہ فی متداولات الاسفار وانما استنبطناہ بحمد اللہ من کلمات العلماء استنباطا واضحا کالصبح حین الاسفار. (فتاویٰ رضویہ ج ۴ ص ۳۹۰)

یہ وہ چند نظیریں پیش کی گئی ہیں جن سے اعلیٰ حضرت کی شان تفقہ پر خوب روشنی پڑتی ہے کہ جہاں آپ احکام کی زلف زولیدہ سلجھانے میں یکتائے زمانہ ہیں وہی کتاب وسنت کے رموز واسرار اور جواہر مکنونہ کے کھولنے میں بھی نرالی شان کے حامل ہیں آپ کے یہ وضع کردہ ضوابط کلیہ آپ کی دقت نظر، ندرت استنباط حق درک کے واضح دلائل ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ آپ نے میدان فقاہت میں اپنی شہسواری کا لوہا منوایا اور اپنے معاصرین واقران کے درمیان امتیازی شان کے مالک بنے اور آئندہ آنے والی

نسلوں کے لیے مشعل راہ بنے۔

ندرت تخریج : فقیہ اس کو نہیں کہا جاتا جو فقہ کی کتب سے عبارت نقل کر کے اپنا فیصلہ سنا دے بلکہ فقیہ وہ شخصیت ہوتی ہے جس کی نظر قرآن و حدیث پر ہوتی ہے اور جو جہاں قرآن وسنت کے صریح جملوں سے مسائل کے استنباط کی قوت کا مالک ہوتا ہے وہاں شارع کے اشارات و کنایات سے بھی تخریج مسائل کی قدرت رکھتا ہے کسی فقیہ کی بصیرت و فقاہت صحیح معنوں میں تب ظاہر ہوتی ہے جبکہ وہ قرآن و حدیث کے اشارات و کنایات سے مسائل کا استنباط کرے۔

اللہ تعالیٰ نے امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس عظیم مقام سے نوازا تھا آپ صحیح معنوں میں فقیہ تھے آپ کے سامنے قرآنی آیات اور احادیث بھی تھیں اور عبارات فقہیہ بھی۔ آپ نے جہاں قرآن و حدیث کے واضح الدلالۃ جملوں سے مسائل کا استنباط فرمایا وہاں قرآن وسنت کے اشارات و کنایات سے بھی تخریج مسائل فرمایا جو آپ کی شان تفقہ، قوت نگاہ، عمیق نظر پر شاہد و عادل ہے لہٰذا ندرت تخریج کی چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

ا۔ دعا بعد نماز عید

بعض حضرات نماز عید کے بعد دعا مانگنے کو ناجائز و بدعت کہتے تھے اور اس پر مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کا فتویٰ پیش کرتے تھے کہ انہوں نے منع فرمایا ہے اعلیٰ حضرت نے متعدد آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے دعا بعد صلوٰۃ العید کے جواز پر استدلال فرمایا ان احادیث میں سے ایک بیہقی کی حدیث پیش فرمائی کہ:

العامل انما یوفی اجرہ اذا قضی

مزدور کو عمل سے فارغ ہوتے ہی اجر ملتا ہے تو بندہ بھی جب اپنے مولیٰ جل جلالہ کی اطاعت و بندگی سے فارغ ہوتا ہے تو اس کے لیے بارگاہ خداوندی سے اپنی حاجات طلب کرنے کا بہترین موقع ہے جس میں بندہ اپنے خالق حقیقی سے اپنی مشکلات کے حل اور اپنی حاجات کی طلب کے لیے گڑ گڑا کر دعا مانگتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی اس دعا کو درجہ قبولیت واجابت عطا فرمائے گا اس حدیث پاک سے آپ کا یہ نفیس استنباط آپ کی فقہی بصیرت کی واضح دلیل ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۹ ص ۲۳۹)

۲۔ مسئلہ تکرار نماز جنازہ

نماز جنازہ اگر ولی نے پڑھی یا اس کی اجازت سے پڑھی گئی ہو تو اس کے نماز جنازہ کا تکرار احناف کے نزدیک ممنوع ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اس ممانعت تکرار پر ایک عجیب استنباط فرمایا۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ فرماتے ہیں کہ صحیحین کے اندر ایسی متعدد حدیثیں ہیں جن کا مضمون ہے کہ ایک مسلم کے دوسرے مسلم پر جو حقوق متعین ہیں ان میں سے نماز جنازہ میں شرکت کرنا بھی ہے اور بعض احادیث میں یہ بھی ارشاد ہے کہ مومن کی نماز جنازہ میں شریک ہونے والے بخش دیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے برابر کس کا حق ہو سکتا ہے اور آپ کی نماز جنازہ سے بڑھ کر ہماری بخشش کے لیے کونسی نماز ہوگی حالانکہ عہد صحابہ سے لیکن آج تک کسی بھی فقیہ نے آپ کی نماز جنازہ بعد از دفن نہیں پڑھی۔ جس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ کا تکرار جائز نہیں اس پر ایک اعتراض ہو سکتا تھا کہ نماز جنازہ پڑھنے کے لیے لاش کے سلامت رہنے کا ظن ضروری ہے ہو سکتا ہے کہ فقہاء امت نے اس شبہ کی بناء پر نماز جنازہ نہ پڑھی ہو۔ اعلیٰ حضرت نے اس شبہ کا یوں ازالہ فرمایا کہ معاذ اللہ حضور ﷺ

کے جسد اقدس کے بارے میں اس قسم کا احتمال قطعاً نہیں ہو سکتا کیونکہ صریح حدیث موجود ہے کہ:

ان اللّٰہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء.

(فتاویٰ رضویہ ج ۹ ص ۲۶۹ تا ۳۱۲)

آپ کا یہ استنباط نہایت ہی اعلیٰ درجے کا ہے اور اس استنباط میں اعلیٰ حضرت منفرد ہیں اس استنباط میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ممانعت تکرار اجماع امت کے درجے میں ہے۔

۳۔ مسئلہ انتظار دعا بعد از فراغ نماز

مساجد میں نماز سے سلام پھیرنے کے بعد آئمہ مساجد کچھ ذکر کر کے دعا مانگتے ہیں اور مقتدی دعا کی انتظار کرتے رہتے ہیں اگر کوئی اٹھ کر چلا جائے تو ناپسندیدگی سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ شریعت نے تو نماز ادا کرنے کے بعد نکلنے کی اجازت دی ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

فاذا قضیتم الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض.

اعلیٰ حضرت نے اس کا جواب یوں دیا کہ یہ ناپسندیدگی کوئی مذموم و خلاف شریعت بات نہیں بلکہ مطابق شرع ہے کیونکہ ارشاد الٰہی ہے:

اذا کانوا معہ علیٰ امر جامع لم یذھبوا.

آپ کا اس آیت کریمہ کے عموم سے استنباط حکم فرمانا آپ کی علمی بصیرت اور باریک بینی و قرآن فہمی کی بین دلیل ہے اور اس آیت سے اس حکم کے استنباط کی ندرت اہل علم پر مخفی نہیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۵۲۱)

۴۔ مسئلہ نکاح مع بنات الاعمام

قرآن حکیم نے محرمات کے بیان میں چودہ عورتوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں بہنوں کے ساتھ نکاح کرنے کی حرمت کو بیان فرمایا۔ اجماع امت ہے کہ ان بہنوں سے مراد وہ بہنیں ہیں جو ماں و باپ دونوں طرف سے ہوں یا صرف ماں کی طرف سے یا باپ کی طرف سے لیکن چچا زاد اور پھوپھی زاد کے ساتھ نکاح کے جواز پر کوئی آیت دلالت نہیں کرتی اعلیٰ حضرت نے ایک آیت پیش کی کہ:

یا ایھا النبی ان احللنالک ازواجک التی اتیت اجورھن وما ملکت یمینک مما افاء اللہ وبنت عمک وبنت عماتک وبنت خالک وخالتک

مگر یہاں بظاہر یہ شبہ پڑتا ہے کہ یہاں پر ہوسکتا ہے کہ یہ خطاب حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ خاص ہے اور حکم بھی آپ کے ساتھ خاص ہو اس شبہ کے ازالے کے لیے آپ نے دوسری آیت پیش کی تاکہ اس حکم کی تعمیم ثابت ہو جائے اور خصوصیت کا احتمال ختم ہو جائے۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور آپ نے باتباع وحی ان سے نکاح فرمایا تو اس کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

فلما قضی زید منھا وطرا زوجنا کھالکی لا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیاھم اذا قضوا منھا وطرا.

اس آیت میں نکاح کی وجہ بتائی گئی ہے کہ مسلمانوں پر حرج و تنگی نہ رہے اس سے ثابت ہوا کہ پہلی آیت میں خطاب حکم عام ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۱)

ندرت تخریج کے بارے میں چند نظیریں بطور نمونہ کے پیش کی گئیں جن سے امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ کی شان تفقہ اور صائب فکری قوت استدلال اور طرز استنباط کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام احمد رضا اگرچہ مجتہد علی الاطلاق تو نہیں لیکن امام کی فقہی

خدمات کا رشتہ مثلاً قیاس، تخریج اور توضیح تاویل اور تطبیق و ترجیح جیسے مسائل میں اسی طبقے سے لگا بندھا ہے، جس پر آپ کی جملہ تصانیف خصوصاً فتاویٰ رضویہ شاہد ہے۔

تطبیق بین الاقوال المتعارضہ

اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی فقہی تحقیقات مختلف انواع پر منقسم ہیں کہیں تو آپ نے جدید مسائل کا حل قرآن وسنت سے پیش فرمایا اور کہیں اصلاح و اضافہ فرمایا اور کبھی قواعد کلیہ وضع فرمائے اور بعض مسائل میں فقہائے متقدمین کے اقوال میں جو اضطراب پایا جاتا تھا اس کو تطبیق کے ذریعہ رفع فرمایا اور کہیں متعارض اقوال میں ترجیح دی اب آپ نے اقوال متبائنہ اور دلائل مختلفہ میں جہاں تطبیق دیکر اضطراب کو رفع فرمایا ہے ان میں سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ فقہ کی کتب میں یہ مسئلہ ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر امام قعدہ اولیٰ چھوڑ کر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے تو مقتدی بیٹھنے کا اشارہ نہ کرے کیونکہ اگر امام کے سیدھا کھڑے ہونے کے بعد اشارہ کیا تو فقہاء احناف کے نزدیک مقتدی کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اس مقام پر صاحب بحر الرائق نے طرفین اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک اختلاف نقل کیا کہ اگر امام ظہر کی نماز میں قعدہ اولیٰ بھول کر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا اور مقتدی نے پیچھے سے سبحان اللہ کہہ کر امام کو سہو کی خبر دی تو کیا مقتدی کی نماز فاسد ہوگی یا کہ نہیں صاحب مجتبیٰ کی عبارت نقل کی کہ:

ولو قام الیٰ الثالثة فی الظهر قبل ان یقعد فقال المقتدی سبحٰن الله قیل لا تفسدو عن الکرخی تفسد عندهما.

یعنی امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو نماز مقتدی فاسد ہو جائے گی لیکن طرفین کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اعلیٰ حضرت نے ان دونوں قولوں کے

درمیاں یوں تطبیق دی کہ قیل لاتفسد میں قیام سے مراد ارادہ قیام ہے اور کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت میں قیام کا حقیقی معنی مراد ہے اور قیام قرآن مجید میں ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً:

یا ایھا الذین اٰمنو اذا قمتم الیٰ الصلوٰۃ

میں قیام سے مراد ارادہ ہے اور

قام عبداللہ یدعوہ

میں قیام اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہے لہٰذا اب دونوں قولوں کے درمیان کوئی تعارض نہ رہا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۲۱۳)

۲۔ مسئلہ جماعت وتر

فقہاء کرام کے درمیان یہ اختلاف چلا آرہا تھا کہ جس نے رمضان شریف کے مہینے میں عشاء کے فرض منفرداً پڑھے تو کیا وتر کی نماز کے لیے جماعت میں شریک ہوسکتا ہے کہ نہیں۔ ایسے ہی اگر نماز فرض تو باجماعت ادا کی ہو لیکن نماز تراویح باجماعت ادا نہیں کی تو کیا وہ وتر کی جماعت میں شریک ہوسکتا ہے یا کہ نہیں۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ اگر نماز فرض باجماعت ادا نہیں کی تو نماز وتر بھی باجماعت ادا نہیں کرنی چاہیے اور اگر نماز فرض باجماعت ادا کی ہو خواہ کسی امام کے پیچھے پڑھی ہو تو وتر کی جماعت میں شریک ہوسکتا ہے اگرچہ نماز تراویح اس نے باجماعت ادا کی ہو یا نہ یا بالکل سرے سے نماز تراویح پڑھی ہی نہ ہو تب بھی نماز وتر باجماعت پڑھ سکتا ہے

اس کے بعد علامہ برجندی اور صاحب مجمع الانہر کے دو قولوں کے درمیان تطبیق بھی دی کہ صاحب مجمع الانہر فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے نماز تراویح باجماعت ادا

نہیں کی تو وہ وتر کو بھی با جماعت ادا نہیں کر سکتا اور علامہ برجندی فرماتے ہیں کہ اگر صرف نماز فرض با جماعت ادا کی ہو تو وتر بھی با جماعت ادا کر سکتا ہے اور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ صاحب مجمع الانہر نے ہر نمازی کی ذات کا اعتبار کیا ہے اگر اس نمازی نے بذات خود نماز تراویح با جماعت ادا کی ہے تو نماز وتر بھی با جماعت ادا کر سکتا ہے ورنہ نہیں خواہ لوگوں نے نماز تراویح با جماعت ادا کی ہو اور علامہ جندی ہر نمازی کی ذات کا اعتبار نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس بات کا اعتبار کرتے ہیں کہ نماز تراویح فی الجملہ با جماعت ادا کی گئی ہے یا کہ نہیں اگر فی الجملہ یعنی بعض لوگوں نے با جماعت ادا کی ہو اور بعض نے نہیں کی تو اب پیچھے رہنے والے نماز وتر با جماعت ادا کر سکتے ہیں کیونکہ اب وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے بعد واقع ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج۷ ص۴۶۸)

۳ : وضو میں بلا سبب پانی خرچ کرنے کے بارے میں اقوال متبائنہ کے مابین تطبیق

وضو میں بلا سبب پانی خرچ کرنے کے بارے میں فقہاء کرام کی عبارات میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے حرام قرار دیا اور بعض فرماتے ہیں مکروہ تحریمی ہے اور کچھ حضرات فرماتے ہیں بغیر کسی سبب کے پانی کا صرف کرنا مکروہ تنزیہی اور بعض حضرات کے نزدیک بلا سبب وضو میں پانی کا خرچ کرنا خلاف اولیٰ ہے۔

سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ اقوال باہم متبائن و متضاد نظر آتے ہیں لیکن امام احمد رضا قدس سرہ نے ان چاروں قولوں کا الگ الگ محل بیان فرما کر ان میں تطبیق دی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔ جن حضرات نے حرام قرار دیا ہے اس کا محل یہ ہے کہ وضو

میں سنت سمجھ کر بلا ضرورت پانی خرچ کیا جائے اور مکروہ تحریمی کا محل یہ ہے بلا اعتقاد سنت و بلا ضرورت وضو میں پانی اس طرح خرچ کیا جائے کہ وہ پانی ضائع ہو جائے۔ اور مکروہ تنزیہی اس صورت میں ہے کہ نہ سنت کا اعتقاد ہو اور نہ پانی ضائع کرنے کا ارادہ لیکن عادۃً بلا ضرورت پانی خرچ کیا جائے اور خلاف اولیٰ اس صورت میں کہ نہ اعتقاد سنت ہو اور نہ اضاعۃ ہو نہ بلا ضرورت خرچ کرنے کی عادت ہو بلکہ نادراً بلا ضروت پانی خرچ کیا ہو۔ اس تحقیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر ان وجوہ اربعہ کے علاوہ کسی غرض صحیح میں وضو کرتے ہوئے تین مرتبہ سے زائد پانی استعمال کرے تو بلا شبہ جائز اور صحیح ہے اور اس کی بھی چار صورتیں بیان کیں۔

۱۔ گرمی کی شدت سے بچنے اور بدن کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے زیادتی کی جائے۔

۲۔ بدن سے گندگی و میل کے ازالہ کرنے اور تنظیف کی خاطر تین سے زیادہ مرتبہ دھویا جائے۔

۳۔ دو یا تین بار میں شک پڑ جائے تو ازالہ شک کے لیے تین سے زائد مرتبہ پانی استعمال کیا جائے اور اقل مقدار پر بناء کر کے ایک مرتبہ کا اضافہ کیا جائے۔

۴۔ وضو نور علی نور کے مقصد سے تین بار سے زیادہ کیا جائے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۸۷۵)

اس قسم کے اقوال متباینہ میں تطبیق دینا اعلیٰ حضرت کی شان فقاہت اور قوت تدبر و فکر اور علمی گہرائی و گیرائی کی واضح دلیل ہے۔ حقیقت بات یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت علم و فن بھی جانتے تھے اور فن کی باریکیوں پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ انہیں معنی فہمی بھی آتی تھی اور نکتہ آفرینی بھی وہ رمز آشنائے فقہ بھی تھے اور قرآن و حدیث کے معنی شناس بھی تھے چنانچہ وہ جب فقہ کے اسرار و رموز واشگاف کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کا طائر خیال لا مکانی بلندیوں پر پرواز کر رہا ہے۔

اقوال متبائنہ میں ترجیح

حقیقت بات یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے جہاں تطبیق وتخریج کے ذریعہ فقہ کی خدمت کی وہاں آپ نے آئمہ سابقین وعلماء متقدمین کی تخریجات میں جو تسامح ہوا ہے اس کی بھی نشاندہی فرمائی اور بیشتر مقامات کی تنقیح بھی فرمائی اور فقہاء متقدمین کے اقوال متبائنہ میں ترجیح بھی فرمائی۔ آپ کے فتاویٰ میں اس قسم کے متعدد مسائل ہیں جو تشنہء ترجیح تھے آپ نے اسباب وعلل کی روشنی میں ترجیح فرمائی چنانچہ اس دعوے کے ثبوت پر چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ اعلیٰ حضرت نے رقت وسیلان کی فقہی تعریف کے بارے میں ایک تحقیقی رسالہ تحریر فرمایا جس کا نام الرقۃ والتبیان لعلم الرقۃ والسیلان ہے جو فتاویٰ رضویہ کی جلد اول میں شامل ہے۔ اس میں آپ نے تحقیق وتدقیق کے وہ جوہر دکھائے کہ اہل علم حضرات کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے اس مسئلے کی ایسی تحقیق اور ایسا جامع بیان کہ دوسری فقہی کتاب میں نہیں ملتا اس رسالے میں آپ نے بہت سارے عنوان قائم کیے ہیں جن میں سے ایک عنوان کے تحت رقت وسیلان کا معنیٰ بیان کیا اور رقت و سیلان کے معنے میں علماء کرام کی عبارات میں اختلاف پایا جاتا تھا آپ نے اس کا ایسا معنیٰ بیان کیا کہ تمام عبارات کا اختلاف ختم ہو گیا۔ اور علماء کرام کے بیان کردہ معانی میں ترجیح بھی دی اور اس کے علاوہ رقت کی دو قسمیں رقت بالفعل، رقت بالقوہ کا ذکر بھی کیا اور پھر ان کے متعلق احکام کی بحث بھی فرمائی۔ شرعی طور پر جو رقت معتبر ہے اس کے بارے میں علمائے کرام کی عبارات میں اضطراب واختلاف تھا اس کی بھی محققانہ اصلاح فرمائی آپ کا یہ رسالہ اپنی تحقیقی حیثیت سے منفرد ہے ایسا تحقیقی اور جامع بیان کسی دوسری کتاب میں نہیں ملے گا۔ (فتاویٰ ج ۳ ص ۱۴۱)

۲۔ فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے مابین مسواک کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ مسواک قبل از وضو سنت ہے یا کہ بوقت کلی۔ علماء کرام کی ایک جماعت کلی کے وقت مسواک کرنے کو سنت قرار دیتی ہے امام ابن ہمام رحمۃ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور بعض حضرات قبل از وضو مسواک کو سنت قرار دیتے ہیں اور صاحب حلیہ بھی اسی کے قائل ہیں چنانچہ ان کی عبارت ہے:

ان یکون فی حالۃ المضمضۃ علی قول بعض المشائخ

اور امام ابن ہمام نے اپنے مختار کو ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث بھی پیش کی کہ:

لو لا ان اشق علیٰ امتی لا مرتھم بالسواک عند کل وضوء

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کی پیش کردہ حدیث سے مسواک کا وضو کے اندر ہونا تو کیا وضو کے متصل ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے عند کل وضوء کے لفظ سے استدلال کیا ہے حالانکہ لفظ عند عام ہے خواہ وہ وضو کے اندر ہو یا متصل ہو یا غیر متصل، نیز حدیث مذکور میں وقت مضمضہ کا بھی ذکر نہیں اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے حضرت ابن ہمام کی تائید میں تین حدیثیں پیش فرمائیں۔ پھر اپنی طرف سے ان کا محققانہ جواب دیا کہ ان احادیث سے ان کا موقف واضح طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ درحقیقت مسواک قبل از وضو ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کے پچیس صحابہ کرام نے آپ کے وضو کی کیفیت روایت کی ہے لیکن کسی نے بھی مسواک کا ذکر نہیں کیا بلکہ وضو اور مسواک سے متعلق صدھا احادیث سامنے ہیں کسی ایک حدیث سے بھی وضو کے اندر مسواک کا ہونا ثابت نہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے فقہاء کرام نے خود تصریح فرمائی ہے کہ اگر مسواک کلی کے وقت سنت ہو تو یہ خرابی لازم آئے گی کہ بسا اوقات مسوڑوں سے خون جاری ہو جاتا ہے اگرچہ شافعیہ کے نزدیک خون ناقض وضو نہیں لیکن بالاجماع نجس تو ہے لیکن ان کی تصریح سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ

مسواک وضو میں کلی کے وقت مسنون نہیں ہونا چاہیے ورنہ افعال سابقہ کا اعادہ لازم آئے گا کیونکہ خروج خون مظنون ہے نیز مسلم شریف کی حدیث بھی پیش کی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

انہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم تسوک و توضأثم قام فصلی

جس سے مسواک قبل از وضو کا اشارہ ملتا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ:

ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لا یرقدمن الیل و لاالنھار فیستیقظ الاتسوک قبل ان یتوضا. (فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۸۰۴)

اقوال سلف کی توجیہات

اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے جس طرح فقہاء کرام کے اقوال متبائنہ میں تطبیق و توفیق دیکر ان کے الگ الگ محل بیان کر کے اختلاف کو ختم کیا اور جہاں تطبیق نہ بن سکی تو ترجیح کا قول فرمایا اس طرح سلف کے ایسے اقوال جو بظاہر باعث اعتراض اور نا قابل عمل تھے ان کی توجیہات و تاویلات فرما کر ناظرین و قارئین کے شکوک و شبہات کا ازالہ فرمایا ان تاویلات میں سے کچھ بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ اعلیٰ حضرت کے پاس ایک استفتاء پیش کیا گیا کہ غیر مقلدین کہہ رہے ہیں کہ مخدوم صاحب نے اپنے کسی رسالے میں تمام مخلوق کو مینگنی سے تشبیہ دی ہے اور اسماعیل دہلوی نے چمار سے دی ہے ان دونوں تشبیہوں میں کیا فرق ہے حالانکہ اسماعیل دہلوی کو تو نشانہ طعن بنایا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اس کا چند وجوہ سے جواب دیا۔

۱۔ کسی کتاب کا کسی بزرگ کی طرف منسوب ہونا اس بزرگ سے ثبوت قطعی کو مستلزم نہیں۔ بہت سارے رسالے خصوصاً حضرات چشت کے نام منسوب ہیں لیکن جن کا اصلا کوئی ثبوت نہیں۔

۲۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ کتاب فلاں بزرگ کی ہے تو یہ ثبوت اس کتاب کے ہر ہر فقرے کے ثبوت کو مستلزم نہیں کیونکہ بہت سارے اکابر کی کتب میں الحاقات ہیں خصوصاً شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تو بے شمار الحاقات جو صریح کفر ہیں یہ شیخ کی کتابوں میں بعض یہودیوں نے اضافہ کیا ہے ایسے ہی مخدوم صاحب کی کتاب میں بھی کسی جاہل نے اضافہ الحاق کیا ہے کیونکہ مخدوم صاحب کی کتاب عقائد کے ایک مقام کی ایک عبارت اس بات اس پر شاہد و عادل ہے۔ کہ ان کی کتابوں میں لوگوں نے الحاقات سے کام لیا ہے اس کتاب کی عبارت ہے کہ ہاشم کے باپ کا نام قریش تھا اور ان کے دو بیٹے تھے ایک کا نام ہاشم اور دوسرے کا نام تیم تھا حالانکہ یہ صریح جہالت ہے ہم ہرگز اس کی نسبت مخدوم صاحب کی طرف نہیں کر سکتے اور نہ مان سکتے ہیں بلکہ کسی جاہل کا الحاق ہے۔

۳۔ کسی مسلمان کی طرف کسی کبیرہ کی نسبت بغیر تحقیق کے حرام ہے جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لا تجوز نسبة كبيرة الى مسلم من غير تحقيق.

جب کبیرہ گناہ کی نسبت بغیر تحقیق کے ناجائز ہے تو کفر کی نسبت بغیر تحقیق کے کیسے جائز ہوگی صرف کتاب چھپ جانا اس کتاب کو متواتر نہیں بنا دیتا۔ علماء کرام کے نزدیک کسی کتاب کے ثبوت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ناقل سے لیکر مصنف کتاب تک اس کا ثبوت سند متصل بذریعہ ثقات سے ہوتا ہے اس پر متعدد عبارت پیش کیں۔ مخدوم

صاحب کے اس قول کے بارے میں ایسی سند ہی نہیں برخلاف اسماعیل دہلوی کی عبارت کے وہ تواتر سے ثابت ہے مخالفین وموافقین سب اس کے ثبوت پر متفق ہیں۔

۴۔ آخر میں اعلیٰ حضرت نے اس قول کی ایک تاویل کی کہ ایسی جگہ مخلوق سے مراد وہ مخلوق ہوتی ہے جس کو عظمت دینی سے اصلا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس پر قرآن کی آیات اور احادیث پیش کیں۔

لہٰذا صوفی جہاں غیر خدا کی تحقیر کرتا ہے وہ قطعا ایسی مخلوق کی تحقیر کرتا ہے جس کی تعظیم، تعظیم الٰہی نہیں ہوتی۔ انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء عظام ودیگر عظمت دینی رکھنے والی مخلوق کی تعظیم تو تعظیم الٰہی ہوتی ہے۔

۲۔ ایک نا قابل عمل قول کی توجیہ

فقہاء کرام کے درمیان ایک مدت سے حضرت صدر الشریعۃ صاحب شرح الوقایۃ کا ایک قول موضوع بحث اور نا قابل عمل بنا ہوا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے اس قول کی ایک حسین وجمیل تاویل فرمائی کہ کسی کو بھی انگشت نمائی کی گنجائش نہ رہی۔ اصل مسئلہ کچھ یوں ہے کہ اگر کوئی آدمی جنب ہو اور اس کے ساتھ کوئی ایسا حدث بھی لاحق ہو جو موجب وضو ہو تو اس صورت میں علماء حنفیہ کے نزدیک یہ حکم ہے کہ جواز تیمّم کی صورت میں صرف تیمّم ہی کافی ہے وضو کی ضرورت نہیں اگرچہ وضو کرنے میں کوئی ضرر بھی نہ ہو اور وضو کے قابل پانی بھی موجود ہو اور وقت میں گنجائش بھی ہو۔ کیونکہ جو تیمّم جنابت کیلئے کر رہا ہے وہ حدث کے لیے بھی رافع ہوگا۔ لیکن صدر الشریعۃ کی شرح وقایہ میں ایک عبارت ہے جو ظاہر مذہب کے مخالف معلوم ہوتی ہے اور وہ عبارت یہ ہے کہ:

اذا کان للجنب ماء یکفی للوضوء لا الغسل یتیمم ولا یجب علیه التوضی

عندنا خلافا للشافعی اما اذا کان مع الجنابة حدث یوجب الوضوء یجب علیه الوضوء. الخ.

اس عبارت کے بارے میں علماء کرام نے اپنی اپنی تصانیف میں بحث کی ہے اور امام اہل سنت نے بھی اس بحث پر ایک رسالہ طلبۃ البدیعۃ فی قول صدر الشریعۃ کے نام سے لکھا ہے اور متعدد کتب سے ثابت کیا کہ اگر جنب کسی عذر کی بناء پر غسل نہیں کر سکتا اور وضو کر سکتا ہے تو تب بھی وضو نہ کرے بلکہ رفع جنابت کے لیے عذر کی وجہ سے جو تیمّم کرے گا وہ تیمم حدث کے رفع کے لیے بھی کافی ہوگا اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے بیس سے زائد کتب کی عبارتیں پیش کیں بلکہ خود شرح وقایہ کی عبارت سے تحقیق کی اور اس کے بعد مسلک حنفیہ کی تائید میں چند نصوص بھی ذکر کیں۔

پھر صدر الشریعۃ کے قول کی صحیح تاویلات پیش کر کے عبارت کی ایسی تشریح کی کہ جس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ تمام تاویلات و توجیہات نقل کی جائیں تو پورا مقالہ انہیں پر لکھنا پڑے گا۔ لہٰذا مقام کے متحمل نہ ہونے کی بناء پر تاویلات نقل نہیں کی جا رہی ہیں۔ (فتاوی رضویہ ج ۴ ص ۶۸۱)

۳: امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ایک قول کی توجیہ

کسی غیر مقلد نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سقوط زکوٰۃ کی خاطر ایک حیلہ کرتے تھے کہ سال کے آخر میں اپنا مال بیوی کے نام ہبہ کر دیتے تھے اور یہ بات جب امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو پہنچی تو امام ابو یوسف کی تائید فرمائی اور یہ روایت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی نقل کی اور بہت نفرت کے ساتھ اس کا رد کیا۔

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اس غیر مقلد کا تعاقب فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ اولاً تو صحیح بخاری میں امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی کوئی روایت ہی نقل نہیں کی اور اس کی کوئی حکایت اول تا آخر نہیں ملتی۔ اور نہ ہی امام ابو یوسف اس کے عامل تھے اور نہ ہی امام اعظم ان کے مصدق بلکہ امام بخاری نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک اگر کوئی شخص مال کو سال کے تمام ہونے سے قبل ہلاک کر دے یا بیچ دے یا کسی کو دے دے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اس میں نہ امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور نہ ہی امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا۔

۲۔ ہمارے فقہاء کرام نے اس بارے میں امام ابو یوسف و امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا اختلاف بیان کیا ہے اور فتویٰ بالاتفاق امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب پر ہے کہ ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں اور یہی امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذہب ہے اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی تصویب و تصدیق کی ہے حالانکہ یہ امام صاحب کے مذہب کی صریح مخالفت ہے۔

۳۔ خزانۃ المنقبین سے نقل کرتے ہیں کہ:

والحیلۃ فی منع الزکوٰۃ تکرہ بالاجماع.

کہ ہمارے تمام آئمہ کے نزدیک اس قسم کا حیلہ بالاتفاق ناجائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام ابو یوسف بھی اس کو ناجائز و مکروہ سمجھتے ہیں؟

۴۔ یہ حکایت کسی سند مستند سے ثابت ہی نہیں اور بغیر سند کے کوئی چیز طعن کے لیے مفید نہیں ہوا کرتی۔

۵۔ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے یزید پلید پر لعنت نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ یہ بات تواتر سے ثابت ہی نہیں کہ یزید حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قاتل یا

آمر تھا جب یزید کی طرف لعنت نہیں کی جا سکتی تو کسی مسلم کی طرف بغیر تحقیق کے کفر و فسق کو منسوب کرنا کیسے جائز ہوگا۔ امام المسلمین امام ابو یوسف کی شان تو بڑی اعلیٰ و ارفع ہے ان کی طرف اس فعل کو بغیر کسی سند و تواتر کے کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ بغیر دلیل شرعی کے کسی فعل کو قبیح اور بعید سمجھنا غیر معتبر اور غیر مسموع ہے یہ تو محل اجتہاد ہے اور اجتہاد مجتہد میں خطاء واقع ہو بھی جائے تو وہ قابل ملامت و طعن نہیں ہوا کرتا۔

۷۔ زکوٰۃ کے واجب ہونے کے بعد اگر ایسا حیلہ کیا جائے کہ جو مانع زکوٰۃ ہو تو یہ حرام قطعی ہے لیکن زکوٰۃ کے وجوب سے قبل ہی ایسا حیلہ کیا جائے کہ زکوٰۃ واجب ہی نہ ہو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ سال کے گزارنے پر فرض فرمائی ہے اور اگر سال تمام ہونے کے بعد ادا نہ کرے اور حیلے کرتا رہے تو تب تو گنہگار ہوگا۔ لیکن اگر قبل از تمام سال ایسا کرے تو گنہگار نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرض نہیں فرمایا کہ قدر نصاب مال جمع کرو اور پھر سال گزرنے دو اور پھر زکوٰۃ ادا کرو البتہ امام اعظم و امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس حیلے کے عدم جواز پر فتویٰ دیا کہ کہیں اس کی تجویز مقاصد شنیعہ کا دروازہ نہ کھول دے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی اگر امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ساتھ دیں تو امام ابو یوسف کی شان جلیل میں کیا نقصان ہوگا کیونکہ ہر مجتہد بعض اقوال میں مصیب اور بعض میں مخطی ہوتا ہے اور بعض اقوال کو لوگ پسند کرتے ہیں اور بعض کو رد کرتے ہیں یہ ردو قبول تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دور سے رائج و معمول ہے بزرگان دین کی شان میں جہاں کہیں کوئی حملہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قلم شمشیر بنکر ان کے ناموس کا تحفظ کرتا ہوا نظر آتا ہے ایسے متعدد مقامات ہیں کہ جہاں بزرگان دین کی طرف غلط منسوب اقوال کو لیکر بد مذہبوں نے ان کے تقدس کو مجروح کرنے کی کوشش کی مگر اعلیٰ حضرت نے ایسے

جوابات دیئے کہ مخالفین کے اوسان خطا ہو گئے اور ان اقوال منسوبہ کی ایسی تاویلات و توجیہات فرمائیں کہ معترضین و مشککین کے دانت کھٹے ہو کر رہ گئے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۱۸۷ تا ۲۰۰)

تنقیح مسائل: اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے دلائل متعارضہ کے مابین تطبیق و ترجیح سے بھی فقہی خدمات انجام دیں اور بہت سارے ایسے مسائل جو تشنہ تنقیح تھے ان کی تنقیح بھی فرمائی چنانچہ مشکل سے مشکل مقام تنقیح میں آپ کا قلم چابک دست نظر آتا ہے یہ مشکل کام علم فقہ کی پر خار وادیوں میں سبک خرامی اور اس فن کے بحر ذخار سے گوہر مراد کی تحصیل کی صریح دلیل ہے اس دعوے کے ثبوت پر تنقیح کی چند نظیریں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ صاع کی مقدار میں فقہاء کرام کا اختلاف

امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صاع سے مراد صاع عراقی ہے جس کی مقدار آٹھ رطل ہے دیگر آئمہ ثلاثہ رحمہم اللہ مع صاحبین کے صاع سے صاع حجازی مراد لیتے ہیں جس کی مقدار پانچ رطل اور ایک ثلث ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب رحمۃ اللہ کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے اس مسئلے کی تنقیح فرمائی کہ تمام فقہاء کرام کے نزدیک صاع بالاتفاق چار مد کا ہے البتہ مد کی مقدار میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مد دو رطل کا ہے اور دیگر آئمہ کے نزدیک مد کی مقدار 1-1/3 (ایک بٹا تین) رطل یعنی ایک رطل اور ثلث رطل ہے۔ اور صحیح مسلم اور مسند امام احمد اور سنن ترمذی کی حدیث ہے کہ:

كان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يتوضا بالمد

اس سے معلوم ہوا کہ آپ ایک مد سے وضو فرماتے تھے اور طحاوی شریف کی حدیث میں ہے کہ:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتوضی برطلین.

اس سے معلوم ہوا کہ مد کی مقدار دو رطل ہے اور ایک صاع میں بالاتفاق چار مد ہوتے ہیں لہٰذا ایک صاع کی مقدار آٹھ رطل ہے اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے اپنے دور کے اوزان مروجہ کے مطابق صاع کی مقدار بیان کی کہ رطل کا وزن بیس استار کا ہوتا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا ہوتا ہے اور مثقال ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے اور انگریزی روپیہ سوا گیارہ ماشے یعنی اڑھائی مثقال کا ہوتا ہے لہٰذا رطل شرعی نوے مثقال کا ہوا اور نوے مثقال کو اڑھائی پر تقسیم کریں تو چھتیس روپے بنتے ہیں لہٰذا صاع شرعی کا وزن دوسو اٹھاسی روپے ہوا یہ تو وہ مقدار ہے جس کے برابر کوئی غلہ وزن کر کے پیمانہ بنایا جائے۔ لیکن پھر یہ اشکال پیدا ہوا کہ کونسا غلہ تولا جائے بعض حضرات نے ماش و مسور کا اعتبار کیا ہے کہ ان دونوں میں تفاوت نہیں ہوتا اور بعض حضرات نے گندم کا اعتبار کیا ہے چنانچہ صاحب شرع وقایہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ماش اور گندم اور جو تینوں کا وزن کر کے دیکھا ہے۔ گندم ماش سے وزنی ہے اور جو گندم سے وزنی ہیں لہٰذا خیر الامور اوساطہا کے تحت گندم کا اعتبار کیا جائے۔ لیکن علامہ شامی کے نزدیک جو کا اعتبار کرنا مختار ہے۔ اعلیٰ حضرت نے بھی اسی کو پسند فرمایا جس پر آپ نے دو دلیلیں پیش کیں۔

ا۔ حضور ﷺ کے زمانے میں عام غذا جو کی تھی گندم کی کثرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے سے ہوئی اس پر آپ نے تین حدیثیں پیش کیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ اقدس میں عام غذا جو کی تھی اسی سے

صدقہ فطر و دیگر صدقات و کفارات ادا کیے جاتے تھے۔

۲۔ جو میں احتیاط ہے اور عبادات میں احتیاط ہی پسندیدہ ہے لہٰذا جو کے صاع کو ترجیح ہوگی۔

آپ نے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی حل کر دیا کہ آٹھ رطل جو وزن کر کے جو پیمانہ بنایا جائے اس میں گندم کتنے وزن کی آئے گی چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں ۲۷ رمضان ۱۳۲۷ھ کو آدھے جو کے صاع کا تجربہ کیا جو کہ چار رطل جو کا پیمانہ تھا اس میں گندم کو سطح کے برابر کر کے تولا گیا تو ثمن رطل کم پانچ رطل گندم نکلی یعنی ایک سو چوالیس روپے بھر جو کی جگہ ایک سو پچھتر روپے آٹھ آنے بھر کی گندم نکلی۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۵۲۵ تا ۵۲۶)

۲۔ جمعہ کی اذان خطبہ

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ کے دور میں اذان خطبہ کے بارے میں علماء کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ یہ اذان مسجد کے اندر ہونی چاہیے یا باہر فقہاء متقدمین کی کتب اس بارے میں خاموش ہیں۔ آپ کے بعض معاصرین علماء کرام نے تداول و تعامل کو دلیل بنا کر اندرون مسجد اذان کے جواز پر فتویٰ دیا تھا کہ ہندوستان میں زمانہ قدیم سے اذان اندرون مسجد خطیب کے سامنے دی جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں خوب تنقیح و تحقیق سے کام لیا اور متعدد کتب فقہ سے یہ ثابت کیا کہ مسجد کے اندر اذان دینا مکروہ ہے چنانچہ قاضی خان کی عبارت نقل کی کہ:

ان یوذن الاذان علی المئذنة او خارج المسجد ولا یوذن فی المسجد.

اس کے بعد ابوداؤد شریف سے ایک حدیث نقل کی کہ:

کان یوذن بین یدی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا جلس علی المنبر یوم الجمعۃ علی باب المسجد و ابی بکر و عمر۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عہد نبوت اور عہد خلفاء راشدین میں اذان مسجد سے باہر دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ آپ نے مجوزین کے شکوک کا ازالہ بھی فرمایا کہ انہیں اس بات سے مغالطہ لگا ہے کہ فقہ کی بعض کتب میں یدی الامام یا یدی المنبر کے الفاظ مذکور ہیں اس پر کلام فرمایا کہ بین یدی الامام وغیرہ کے الفاظ صرف مواجہت کے مقتضی ہوتے ہیں اتصال وقرب کے مقتضی نہیں ہوتے کیونکہ یہ لفظ مبہم ہے اور یہ لفظ ظرف مکان وزمان دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً۔

لہ ما بینا ایدینا و ما خلفنا و ما بین ذالک

اور دوسری جگہ ہے وھو الذی یرسل الریح بشرا بین یدی رحمۃ۔ پہلی آیت میں ظرف مکان اور دوسری میں ظرف زمان کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جواز کے قائلین نے تعامل کو دلیل بنایا تھا آپ فرماتے ہیں نص حدیث اور تصریحات فقہاء کے خلاف ہندوستان کا رواج وتعامل میں کسی شئی کا پایا جانا حجت نہیں کیونکہ ہندوستان مین رواج کا اعتبار کیا جائے تو پھر ہندوستان کی بعض مساجد میں تو پنجگانہ نماز کی اذانیں بھی اندر ہی دی جاتی ہیں۔ اسی مسئلے کے ضمن میں اعلیٰ حضرت نے دو تحقیقی نکتے بھی پیش فرمائے کہ جن سے مسجد کے اندر اذان ہونے کا محل متعین فرمایا کہ کس صورت میں اذان مسجد کے اندر ہوگی تنقیح مسائل کے تحت یہ دو نظیریں پیش کی گئی ہیں جو آپ کی دقت نظری حدت ذہنی اور جودت طبع کی واضح دلیلیں ہیں۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۴۹۷ تا ۵۰۴)

اصلاح واضافہ: امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ کی فقہی تحقیقات مختلف انواع و

اقسام پر منقسم ہیں کہیں تو متقدمین فقہاء کی نظروں سے جو گوشے مخفی رہ گئے تھے انہیں اجاگر فرمایا اور کہیں قواعد وضوابط وضع فرمائے اور کہیں اصلاح واضافہ سے کام لیا۔ اب چند ایسی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں جہاں اعلیٰ حضرت نے اصلاح واضافہ کے ذریعہ فقہ کی خدمت فرمائی ہے۔

ا۔ مرد کے وہ اعضاء جو شرمگاہ شمار ہوتے ہیں فقہ کی بعض کتابوں میں ان کی تعداد تین اور بعض میں چار اور پانچ تک کا ذکر ہے بالاستیعاب کسی کتاب میں بھی بیان نہیں البتہ متفرق کتب سے اگر وہ بیان کردہ اعضاء کو جمع کیا جائے تو ان کی کل تعداد آٹھ بنتی ہے۔ اعلیٰ حضرت سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا گیا کہ اعضاء شرمگاہ کی تعداد کتنی ہے اور یہ سوال نظم کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے اس کا جواب بھی نظم کی صورت میں دیا اور ان کی تعداد نو تک بتائی آپ فرماتے ہین کہ فقہاء کرام کا آٹھ اعضاء بیان کا موجب حصر نہیں۔ آپ نے ان کے علاوہ کئی دیگر مسائل بھی بیان فرمائے۔

(۱) ستر عورت کی حدیں۔ (۲) ناف عورت سے خارج اور زانو داخل ہیں۔ (۳) یہ بھی بتایا کہ عضو کی کتنی مقدار کے منکشف ہونے سے نماز فاسد ہوتی ہے۔ (۴) یہ بھی بتا دیا کہ مذہب مختار پر ادائے رکن حقیقتاً شرط نہیں۔ (۵) ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ مذہب صحیح میں ذکر اور انثیین اور دبر اور ہر دو سرین الگ الگ عضو کامل ہیں۔ (۶) ساتھ ہی اپنی طرف سے زائد بیان کردہ عضو کا بھی اشارہ بیان کر دیا کہ دبر اور انثیین کے درمیان کا فاصلہ بھی اعضاء شرمگاہ میں شامل ہے اگرچہ کتب کے اندر اس کا ذکر نہیں لیکن اس کا مشمول ظاہر ہے۔ (۷) یہ بھی بتایا کہ ہر گھٹنا اپنی ران کے تابع ہے مرد کی شرمگاہ کا نو ثابت کرنا امام اہل سنت کی فقہ دانی پر ایسی شہادت ہے جو آفتاب نیمروز

سے بھی زیادہ درخشاں اور تابندہ ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج۶ص۲۹)

۲۔**مسئلہ لمعہ**: فقہ کی کتابوں میں مسئلہ لمعہ اور اس کا حکم بیان کیا جاتا ہے لمعہ کا مطلب یہ ہے کہ جس نے بدن کا کچھ حصہ دھویا کچھ باقی رہا کہ پانی ختم ہو گیا پھر حدث ہوا جو موجب وضو ہے اب جو پانی ملے اسے وضو میں صرف کرے یا بقیہ جنابت کے دھونے میں اعلیٰ حضرت نے بھی اس مسئلے پر تفصیلی طور پر کلام فرمایا اور لمعہ کی ۹۸ صورتیں بیان فرمائی اور ہر ایک صورت کا مدلل شرعی حکم بیان فرمایا حالانکہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ مسئلہ مع صورتیں واحکام ذکر کیا گیا ہے اور سب سے زیادہ صورتیں صاحب شرح وقایہ صدر الشریعہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں اور ان کی کل مقدار پندرہ ہے اعلیٰ حضرت نے اٹھانویں صورتیں اور ان کے تیس احکام بیان کیے کیونکہ بعض صورتوں کے درمیان ایک ہی حکم مشترک ہے اس لیے احکام کی مقدار کل تیس ہوئی۔ یہ اضافہ واصلاح آپ کی فقہ دانی کی واضح دلیل ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۴ ص ۲۸۳)

۳۔**مسئلہ تیمم**: اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے تیمّم کے بارے میں تین سو گیارہ امور بیان فرمائے کہ جن میں سے ایک سو اکیاسی امور ایسے ہیں جن سے تیمّم کرنا جائز ہے اور ان ایک سو اکیاسی امور میں سے چوہتر امور وہ ہیں جنہیں فقہاء متقدمین نے بیان فرمایا ہے اور ایک سو سات وہ امور ہیں جن کا اعلیٰ حضرت نے اپنی طرف سے اضافہ فرمایا اور یہ اضافہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مذہب کے اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔ اسی طرح ایک سو اکیاسی اشیاء سے عدم جواز تیمّم کو بیان فرمایا جن میں سے اٹھاون اشیاء فقہاء متقدمین نے بیان فرمائی ہیں اور ۷۲ اشیاء کا عدم جواز آپ نے اپنے اجتہاد سے امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مذہب پر بیان فرمایا۔ ایسے ہی وہ صورتیں جو پانی سے عجز کی وجہ سے تیمّم کے صحیح ہونے کے لیے عند الشرع

مقبول ہوئی ہیں فقہاء کرام کی کتب میں ان کی مقدار چالیس سے پچاس تک بیان کی گئی ہے لیکن اعلیٰ حضرت نے پانی سے عجز کی صورتیں گنائیں تو ترتیب وار ۱۷۵ تک بتائیں۔ تیمم کے بارے میں اعلیٰ حضرت نے جو تحقیق فرمائی ہے وہ کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ہم نے بطور اختصار اس کا خلاصہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح کے اضافات زیادتیاں آپ کے تبحر علمی کی عظیم شہادتیں ہیں حقیقت بات یہ ہے کہ فقہ میں آپ اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ آپ کے فتاویٰ پر نظر ڈالنے والا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے علوم عطا فرمائے تھے کہ جن سے آج دنیا کے ہاتھ خالی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ عرب وعجم کے علماء نے اپنی گردنیں جھکا کر تسلیم کیا کہ امام احمد رضا اپنے وقت کے بے مثال فقیہ اور عالم دین ہیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ۶۵۰ تا ۶۵۸)

تکاثر دلائل: اعلیٰ حضرت قدس سرہ جب کسی مسئلے پر بحث کرتے ہیں تو ایک ایسے فقیہ کی تصویر ابھرتی نظر آتی ہے جو قوت اجتہاد بصیرت فکر، ذہانت و تعقل اور علمی استحضار میں دور دور تک اپنی مثال نہیں رکھتا۔ آپ جب کسی مسئلے پر بحث کرتے ہیں تو دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔ دلائل کی کثرت آپ کے فتاویٰ میں اس حد تک ہے کہ کئی سو سال کے فقہاء کے درمیان یکتا و یگانہ دکھائی دیتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے ہاں دلائل کی بہتات دیکھنے کے بعد مذہب حنفیت کی قوت واضح ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی اس اعتراض کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے کہ علماء حنفیہ زیادہ تر قیاس پر عمل کرتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی فقیہ کی وسعت علمی اور شان تفقہ کثرت دلائل سے ہی واضح ہوتی ہے کیونکہ یہ تکاثر دلائل بار علم اور وسعت نگاہ، تعمق نظر اور قوت فکر کی بنیاد پر ہوتا ہے اب ہم بطور نمونہ چند ایسے نمونے پیش کرتے ہیں کہ جن سے اعلیٰ حضرت کے کثرت استدلال پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ نماز میں عمامہ کی فضیلت

اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ایک استفتاء پیش کیا گیا کہ عمامہ باندھ کر نماز پڑھنے کی فضیلت ثابت ہے یا کہ نہیں تو آپ نے عمامہ باندھ کر نماز پڑھنے کی فضیلت پر احادیث کی مختلف کتب سے بیس احادیث پیش کیں۔ جن میں سے چند حدیثیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ الفرق بيننا وبين المشركين العمائم على القلانس.

۲۔ العمائم تيجان العرب

۳۔ العمائم تيجان العرب فاذا وضعوا العمام وضعوا عزهم وفي لفظ وضع الله.

۴۔ لا تزال امتي على الفطرة ما لبسوا العمائم على القلانس.

۵۔ عليكم بالعمائم فانها لباس الملائكة وارخوا و ارفعوا لها خلف ظهوركم.

۶۔ ان الله وملائكته يصلون علىٰ اصحاب العمائم يوم الجمعة.

۷۔ ركعتان بعمامة خير من سبعين ركعه بلا عمامة.

(فتاویٰ رضویہ ج ۶ ص ۲۳۰)

۲۔ عدم جواز تکرار نماز جنازہ

اعلیٰ حضرت قدس سرہ سے کسی نے نماز جنازہ کے اعادہ کے متعلق سوال کیا کہ کیا مذہب حنفی کی رو سے نماز جنازہ دوبارہ پڑھنی جائز ہے یا کہ نہیں تو آپ نے اعادہ کے عدم جواز پر پچاس کتب متون وشروح اور فتاوی کی دو سو سات عبارات پیش کیں۔ اور نماز جنازہ کے تکرار کے ناجائز و گناہ ہونے پر مذہب حنفی کا اجماع ثابت کیا اور

بعض لوگوں کے اس مغالطے کو بھی چار طرح سے رفع فرمایا کہ حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز جنازہ چھ مرتبہ پڑھی گئی ہے۔ یہ فتویٰ کئی صفحات پر پھیلا ہوا ہے اعلیٰ حضرت کی مصنفات کا مطالعہ کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا ایک چلتی پھرتی عظیم لائبریری تھے۔ آپ جب کسی مسئلے پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی تحقیق و تدقیق کے لیے سینکڑوں عبارات پیش کرتے ہین جن سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں رہتا کہ کتب تفاسیر و حدیث و فقہ و دیگر فنون پر کتنی گہری نظر کے مالک تھے زیر بحث مسئلے کے متعلق جتنے بھی دلائل ہوتے ہیں انہیں ترتیب وار ذکر کرتے ہیں۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۹ ص ۲۹۹)

مسئلہ سماع موتیٰ

اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے پاس سماع موتیٰ کے بارے میں کسی مفتی کا فتویٰ پیش کیا گیا کہ جس میں اہل قبور کو خطاب کرنے اور ان کے وسیلہ سے حاجت روائی طلب کرنے کو شرک قرار دیا گیا تھا۔ آپ نے اس فتوے کا محققانہ جواب تحریر فرمایا۔ اولا تو آپ نے مفتی مذکور اور دیگر منکرین زیارت اہل قبور کی عبارات میں نو وجوہ سے اختلاف بیان فرمایا اور ساتھ ہی اس مفتی پر ۳۵ سوالات کیے اور اس کے بعد موت کے بعد روح کے باقی رہنے اور دیکھنے سننے وغیرہ ادراکات کے ثبوت پر ساٹھ احادیث پیش کیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے جسد خاکی سے روح کے انتقال کے بعد بھی اس کا جسم کے ساتھ ایک خاص تعلق باقی رہتا ہے۔

اس کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین اور تابعین عظام و تبع تابعین اعلام اور مجتہدین اسلام کے تین سو اقوال نقل کیے اور ان تین سو اقوال میں سے ایک سو پانچ اقوال صرف شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے خاندان سے تعلق

رکھنے والوں کے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اولیاء کرام بعد از انتقال بھی اپنے متعلقین کو اپنے فیوضات سے مستفیض ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور ان کے ساتھ بلاواسطہ تکلم کرتے ہیں اور مصائب کے وقت اولیاء کرام لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور اس کے بعد 'انک لا تسمع الموتٰی' سے غلط استدلال کرنے والوں کے بیانات پر مدلل تبصرہ فرما کر ان کے دعوے کی دلیل کو غلط ثابت فرمایا اور منکرین سماع موتی مسئلہ یمین کو اپنے دعوے کے اثبات پر پیش کرتے تھے آپ نے ان کے تمام دلائل کو نقل کر کے ان کو رد فرمایا اس کے بعد آپ نے کتب حدیث وفقہ واصول فقہ کے علاوہ کتب تفاسیر کے حوالہ جات کی روشنی میں پچاس سے زائد دلیلوں اور ایک سو سے زائد اعتراضات سے رد بلیغ فرمایا یہ بات مسلم ہے کہ مفتی وفقیہ اس کو نہیں کہا جاتا جو کتب فقہ سے عبارت نقل کر کے اپنا فیصلہ سنا دے بلکہ مفتی وہ شخص ہے جس کی نظر قرآن وحدیث پر ہوتی ہے اور آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ کا ذخیرہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت ایک عظیم مفتی وفقیہ تھے ان کے سامنے قرآنی آیات بھی تھیں اور احادیث اور عبارات فقہیہ بھی تھیں جب وہ کسی مسئلے پر بحث کرتے ہیں تو براہ راست آیات قرآنیہ سے استدلال کرتے ہیں اور احادیث نبویہ سے استشہاد پیش کرتے ہیں اور سینکڑوں عبارات فقیہ سے مسئلے کی وضاحت کرتے ہیں جب وہ لکھتے ہیں تو علم و حکمت کا سیلاب امڈتا نظر آتا ہے۔ آپ کے قلم کی سرعت رفتار کو دیکھ کر فقہاء متقدمین کی یاد تازہ ہوتی ہے آپ کی قوت حافظہ کو دیکھ کر امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا حافظہ یاد آجاتا ہے۔ آپ کی شخصیت اپنے زمانے کی بے مثال شخصیت تھی فقہ میں تو آپ کی نکتہ رسی اور باریک بینی اور کمال کا تو ہر موافق ومخالف معترف ہے۔

(فتاوی رضویہ ج ۹ ص ۶۷۵ تا ۸۳۶)

علوم عصریہ سے مسائل فقہ کی تائید

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عشق نبوی کو نئی زندگی عطا کی جنون محبت کو دوام عطا فرمایا اور قلب وروح میں محبت کی وہ سرمدی اور لافانی سرور وخمار بھر دیا جسے فنا کرنا تو کجا اس کی حرارت کا کم کرنا بھی ابد تک ممکن نہیں۔ ایسا ہی آپ نے متعدد علوم وفنون کو حیات نو بخشی۔ آپ کی ذات میں متنوع علوم وفنون میں حیرت انگیز ماہرانہ صلاحیت، تفقہ، تدبر، اصابت رائے اور ذاتی بلند کرادار واخلاق کی شان پوری آب وتاب سے موجود ہے کہ آپ بیک وقت ایک بلند پایہ مفسر، نکتہ دان، فقیہ، نامور محدث اور معروف ریاضی دان، ماہر علم منطق وفلسفہ اور ماہر علم نجوم و جفر، اور لاثانی نعت گو شاعر اور ایک بہترین قاری اور عظیم اصولی تھے اور ۵۴ مختلف علوم وفنون میں آپ کی سینکڑوں تصانیف ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی میدان میں آپ کی شخصیت کس قدر ومنزلت کی مالک تھی۔ آپ جس طرح علوم نقلیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے ایسے ہی علوم عقلیہ میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔

علوم عقلیہ کو پڑھنے اور پڑھانے کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ آپ نے علوم عقلیہ کو صحیح معنوں میں علوم آلیہ سمجھ کر ان سے قرآن وحدیث اور فقہ کی خدمات لیں۔ اور متعدد مسائل فقہ کی تحقیق میں علوم عصریہ کی اصطلاحات استعمال کیں اور زیر بحث مسئلے کی وضاحت علمی اور فنی انداز سے کر کے مستفتی کو مطمئن کرتے ہیں اور یہ ایک مسلم بات ہے کہ ایک فن کو دوسرے فن کی اصطلاحات کے ذریعہ ثابت کرنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ تو اس آدمی کا کام ہوتا ہے جو دونوں فنون کے اندر مجتہدانہ صلاحیت وقدرت کا مالک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ملکہ اور قدرت اعلیٰ حضرت کو عطا فرمائی

تھی۔ جس پر فتاویٰ رضویہ کے مختلف مقامات شاہد و عادل ہیں کہ جہاں پر آپ نے متعدد مسائل فقہ کی علوم عقلیہ وعصریہ کے ذریعہ وضاحت وتائید فرمائی ہے جن سے آپ کا بیک وقت ایک نکتہ رس فقیہ اور بلند پایہ منطقی وریاضی دان اور ماہر علم فلسفہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اب چند ایسے مسائل بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں جہاں پر آپ نے علوم مروجہ عصریہ کے ذریعہ مسئلے کی وضاحت وتائید کی ہے۔

علم ھیئت وریاضی سے فقہ کی خدمت

اختلاف مطالع میں فقہاء کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے کہ کیا اختلاف مطالع معتبر ہے یا کہ نہیں شوافع اور محدثین کے نزدیک اختلاف مطالع معتبر ہے اس لیے ان کے مذہب کے مطابق اہل مشرق کی رویت ہلال اہل مغرب کے لیے مفید نہیں لیکن فقہاء حنفیہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں کرتے اس لیے احناف کے نزدیک اہل مشرق کی رویت ہلال اہل مغرب کے لیے مفید ہوگی بشرطیکہ رویت شرائط شرعیہ سے ثابت ہو اس بارے میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فتاویٰ رضویہ میں علم ریاضی کے ذریعہ وضاحت فرمائی اولاتو آپ نے اختلاف مطالع کو معتبر سمجھنے والوں کے اقوال میں جو اختلاف پایا جاتا تھا اس اختلاف کو بیان فرمایا کہ بعض حضرات کے نزدیک اختلاف مطالع تب معتبر ہوگا جبکہ چوبیس فرسخ کی مسافت پائی جائے اور بعض کے نزدیک ایک مہینے کی راہ ہونی چاہیے اور ان دونوں قولوں میں آٹھ گنے کا فرق ہے کیونکہ ہر روز کی منزل انیس میل ہوتی ہے اور انیس کو تیس کے ساتھ ضرب دی جائے تو پانچ سو ستر میل بنتے ہیں لہٰذا ایک ماہ کی راہ پانچ سو ستر میل پر مشتمل ہوئی اور ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اب ایک ماہ کی مسافت کو تین پر تقسیم کریں تو ایک سو

نوے فرسخ بنتے ہیں۔لہٰذا دونوں قولوں میں شدید اختلاف پایا گیا۔اس کے بعد احناف کی تائید کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ شافعیہ جن مسافتوں کا تعین کرتے ہیں وہ عبث ہے کیونکہ کبھی دو ماہ کی مسافت سے زائد پر بھی اختلاف مطالع نہیں پایا جاتا اور کبھی ایک ماہ سے کم کی مسافت پر بھی اختلاف مطالع متحقق ہو جاتا ہے۔اس بات کو آپ نے علم ہیئت وریاضی کے قواعد سے یوں واضح فرمایا کہ شمس وقمر کے درمیان جب تک کم ازکم آٹھ درجہ کا فاصلہ نہ ہو رویت ہلال ممکن نہیں اور یہ فاصلہ شرقاً غرباً ہوتا ہے اور جو فاصلہ شمس وقمر کے درمیان مشرق میں ہوگا وہ مغرب میں پہنچ کر زائد ہو جائے گا اب فرض کیجئے کہ آفتاب شمالی ہے اور قمر کا میل نہیں ایک شہر خط استواء پر واقع ہے اور دوسرا شہر اس سے آٹھ درجے شمالی اور تیسرا سترہ درجہ شمال پر واقع ہے اور تینوں شہروں کا طول البلد ایک ہو فرض کیجئے کہ خط استواء پر رویت ہوئی تو سترہ درجے پر کیا رویت ہوگی حالانکہ آٹھ درجے پر بھی رویت ضروری نہیں کیونکہ خط استواء پر آفتاب جلد غروب ہوگا تو اندھیرے کی وجہ سے رویت ممکن ہوئی۔نیز وہاں چاند بلند بھی ہوگا اس لیے رویت ہلال دیر تک ممکن اور شمال کے دونوں شہروں کا معاملہ بالکل برعکس ہے کہ یہاں پر آفتاب بھی دیر سے غروب ہوگا اور قمر بھی پستی میں ہوگا پھر فرض کیجئے کہ سترہ درجہ والے شہر میں رویت ہوئی تو خط استواء تو کیا آٹھ درجے والے شہر میں بھی بدرجہ اولیٰ رویت ہوگی حالانکہ آٹھ درجے کے بعد ایک ماہ کی مسافت سے کم اور سترہ درجے کے بعد دو ماہ سے زائد مسافت ہوتی ہے معلوم ہوا کہ کبھی دو ماہ سے زائد مسافت پر بھی اختلاف مطالع کا اثر نہیں پڑتا اور کبھی ایک ماہ سے کم مسافت بھی اثر انداز ہوتی ہے لہٰذا یہ واضح ہو گیا کہ شہروں کا بعد قابل اعتبار نہیں ہوتا۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۲۰۵ تا ۲۴۹)

صبح کاذب کی تحقیق

صبح صادق و کاذب کے درمیان جو اشتباہ واقع ہوتا ہے اس بارے میں علماء کرام نے مختلف وجوہ بیان کر کے اس اشتباہ کو زائل کرنے کی کوشش فرمائی لیکن پھر بھی مسئلہ قابل وضاحت اور تشنہ توضیح و تحقیق تھا۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کی ایسی تحقیق فرمائی کہ جس سے تمام شکوک وشبہات زائل ہو گئے اور صبح صادق و صبح کاذب کے درمیان امتیاز کی صورت واضح ہو گئی۔ چند وجوہ سے مسئلے کی نوعیت کو واضح فرمایا اور وہ بیان کردہ وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) حدیث شریف میں صبح صادق کو مستطیر اور صبح کاذب کو مستطیل فرمایا گیا ہے اس حدیث کی بنا پر ناواقف لوگ صبح کاذب کو ڈورے کی مثل باریک سفیدی گمان کرتے ہیں اور جہاں تھوڑی سے چوڑائی میں سفید ہو تو اس کو صبح صادق سمجھتے ہیں حالانکہ حدیث شریف کی مراد یہ نہیں بلکہ حدیث کی مراد وہ ہے جو حضور ﷺ نے خود اپنے دست اقدس کے اشارے سے تعلیم فرمائی کہ شرقاً غرباً سپیدی پھیلی ہوئی ہو تو وہ صبح کاذب ہے اور دونوں دست مبارک کی کلمہ کی انگلیوں کو ملا کر ہاتھ پھیلا کر جنوباً شمالاً اشارہ کر کے فرمایا کہ جنوب وشمال میں افق پر پھیلنے والی سپیدی صبح صادق ہے۔

(۲) صبح کاذب کی وجہ تسمیہ بعض کتب میں **یعقبه ظلمة فالافق یکذبه** سے بیان کی گئی ہے کہ ایسی سفیدی ہوتی ہے کہ جس کے بعد ظلمت آتی ہے سپیدی تو کہتی ہے صبح ہو گئی ہے لیکن افق اس کی تکذیب کرتا ہے اس لیے اس کو صبح کاذب کہا جاتا ہے بعض لوگوں کو صبح کاذب کی وجہ سے تسمیہ سے غلط فہمی لگی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ صبح کاذب کی سپیدی کے بعد تاریکی چھا جاتی ہے اور اس کے بعد صبح صادق نمودار ہوتی ہے اعلیٰ حضرت نے ان کا تعاقب فرمایا کہ یہ بالکل باطل ہے کیونکہ صبح کاذب کی سپیدی ختم

نہیں ہوتی بلکہ وہ سپیدی اخیر تک بڑھتی رہتی ہے اور غروب آفتاب تک وہاں تاریکی نہیں آتی بلکہ اس وجہ تسمیہ کا مطلب یہ ہے کہ صبح کاذب کی سپیدی افق سے بہت بلند ظاہر ہوتی ہے اور اسکے عقب میں بالکل اندھیرا ہوتا ہے یعنی افق میں سپیدی کے نیچے تاریکی ہوتی ہے جب صبح صادق پھیلتی ہے تو یہ تاریکی بھی روشنی میں بدلتی رہتی ہے۔

(فتاوی رضویہ ج ۱۰ ص ۵۶۷ تا ۶۱۷)

(۳) بعض کتب ہیئت پر رد

صبح کاذب کی تحقیق کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے تیسری وجہ بیان کرتے ہوئے بعض کتب ہیت پر رد بھی فرمایا کہ بعض کتب ہیت میں لکھا ہے کہ جب آفتاب افق سے پندرہ درجے نیچے رہتا ہے تو اس وقت صبح صادق ہوتی ہے اور صبح کاذب اس سے صرف تین درجے پہلے ہوتی ہے یعنی اٹھارہ درجے کے انحطاط پر ہوتی ہے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ یہ محض وہم باطل ہے کیونکہ ہزاروں بار کا مشاہدہ ہے کہ آفتاب کا انحطاط اٹھارہ درجے کے قریب رہ جاتا ہے تو اس وقت یقیناً صبح صادق ہو جاتی ہے اور صبح کاذب تو اس سے بہت درجوں قبل ہو چکی ہوتی اس کے بعد اعلیٰ حضرت اپنا مشاہدہ بیان فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان کی شب ششم کو میں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ آفتاب افق سے ۳۴ درجے زیادہ افق سے نیچا تھا صبح کاذب اپنی جھلک دکھا رہی تھی حالانکہ ابھی صبح صادق ہونے کے لیے ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت باقی تھا۔

(۴) عوام یہ سمجھتے ہیں کہ جب افق سے سپیدی اٹھتی ہوئی بلندی پر آتی ہے تو ہمیں مکانوں میں یا چھتوں پر دکھائی دیتی ہے اس بناء پر صبح ہوتی دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ صبح صادق تو اس بہت پہلے ہو چکی ہے جیسا کہ ستارے وغیرہ شہروں میں اپنے طلوع ہونے کے بہت دیر بعد دکھائی دیتے ہیں حالانکہ یہ بھی محض وہم باطل ہے کیونکہ یہ

سپیدی افق سے بہت اونچی ہوتی ہے تو اس وقت ہماری آنکھوں کو نظر آتی ہے فرض کریں کہ کوئی آدمی جنگل میں ہو اور اس کے سامنے کوئی شئی حائل نہ ہو تو وہاں بھی یہ بیاض افق کے بہت اوپر ہوگی اور اس کے نیچے تمام کنارہ آسمان تاریک ہوگا اسی کو یعقبہ ظلمہ کہا گیا ہے۔

(۵) بعض کتابوں میں یہ واقع ہوا تھا کہ صبح صادق رات کا ساتواں حصہ ہوتا ہے۔ اس سے لوگوں کو غلط فہمی لگی اور انہوں نے ہر موسم و ہر مقام کے لیے عام سمجھا حالانکہ بات ایسی نہیں تھی اعلیٰ حضرت نے ان کے اس مغالطے کو یوں رفع فرمایا کہ جن علماء کرام نے یہ لکھا وہ ان کے اپنے عرض بلد اور خاص موسم کے ساتھ مختص ہے ورنہ ہمارے بلاد میں صبح صادق یقیناً رات کے چھٹے حصے سے لیکر دسویں حصے تک ہوتی ہے۔

(٦) آخر میں اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے صبح کاذب شروع ہونے کے بعد صبح صادق کے پھیلنے تک اس سپیدی کی جو صورتیں پیدا ہوتی ہیں انہیں مفصل ذکر فرمایا اور تمام صورتیں سات ہیں اور ان ساتوں صورتوں کو سات اشکال کے ذریعہ سمجھایا جن سے صبح کاذب و صبح صادق کے اشتباہ کا ازالہ فرما کر دلنشین انداز کے ساتھ وضاحت فرمادی۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ فقیر نے اس فن میں نری کتابوں کی باتوں پر اعتماد نہیں کیا نہ خالی دلائل ہندسیہ پر تنہا تجربہ و مشاہدہ پر بلکہ سب کو جمع کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ اپنی ذہنی جدتوں سے بھی بہت کچھ کام لیا یہاں تک کہ بفضلہٖ تعالیٰ برہان وعیان کو مطابق کر دیا۔

حقیقت بات بھی یہی ہے کہ صبح صادق و کاذب کے درمیان امتیاز کے بارے میں اتنا مفصل اور واضح بیان کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا یہ صرف اعلیٰ حضرت کا ہی حصہ ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ٦١٧)

(۳) مسئلہ طلوع وغروب

سورج کے طلوع وغروب کے وقت نماز کی ممانعت حدیث شریف میں وارد ہے حنفیہ کے نزدیک اس کا معنیٰ قرص آفتاب میں اتنا تغیر آجائے کہ اس پر بلا تکلف نگاہ پڑنے لگے اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مقدار قدر رمح یعنی ایک نیزے کی مقدار تحریر فرمائی ہے۔ اعلیٰ حضرت کے زمانے کے علماء میں سے بعض نے اس وقت مکروہ کی مقدار پندرہ منٹ بتائی تھی اور اعلیٰ حضرت نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بناء پر اس وقت کی مقدار بیس منٹ بتائی اور اس امر کی تحقیق محاسبات ہندسیہ اور علم ہیئت وتوقیت کے قواعد سے بھی کی چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ زمین کے گرد کئی میل تک بخارات کا کرہ پھیلا ہوا ہے جس کی وجہ سے طلوع وغروق کے وقت آفتاب پر نگاہ بلا تکلف جمتی ہے اور آفتاب جب بلند ہوتا ہے اور کرہ کا قلیل حصہ حائل رہ جاتا ہے تو شعاعیں زیادہ ظاہر ہوتی ہیں اور نگاہ جمنے نہیں پاتی یہ حالت دونوں جہتوں میں یکساں ہے۔

اس صورت کو اعلیٰ حضرت نے محاسبات ہندسیہ سے ثابت فرمایا اور تفصیلاً سمجھانے کی سعی بلیغ فرمائی یہ اعلیٰ حضرت کا ہی حصہ ہے کہ مسائل دینیہ کی علوم ہندسیہ سے تائید فرماتے ہیں۔

آفتاب جب نصف النہار پر ہوتا ہے انتہائی تیزی پر ہوتا ہے اور اس سے قبل و بعد دونوں پہلوؤں پر جتنا افق سے قریب تر ہوتا ہے اس کی شعاع میں بھی ضعف پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ شرق وغرب میں ایک حد کے قریب اصلا نگاہ کو خیرہ نہیں کرتی۔ مشرق میں جب تک اس حد سے آفتاب نکل کر اونچا نہ ہو جائے اس وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

اور اس تقریر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ وقت دونوں جانب برابر ہے نہ یہ کہ مشرق کی طرف تو پندرہ منٹ ہو اور مغرب کی جانب ڈیڑھ دو گھنٹے ہو جائے جو اس سے کئی نیز ے زائد ہے۔ تجربہ سے جب یہ وقت تقریباً بیس منٹ ثابت ہوا تو جب سورج کی کرن چمکے اس سے بیس منٹ گزرنے تک نماز ناجائز اور وقت مکروہ ہوا اور ادھر جب غروب کو ۲۰ منٹ رہیں وقت کراہت آجائے گا اور آج کی عصر کے سوا ہر نماز منع ہو جائے گی۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے ان لوگوں کے وہم کا بھی ازالہ فرمایا کہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ آفتاب کے متغیر ہونے سے مراد دھوپ کا پیلا ہونا ہے۔ آپ فرماتے ہیں یہ ہرگز صحیح نہیں کیونکہ سردیوں میں سورج ڈھلکنے کے فوراً بعد ابھی سایہ ایک مثل کو بھی نہیں پہنچتا ہے تو آفتاب متغیر ہو جاتا ہے اور تین طور پر دھوپ میں زردی پیدا ہوتی ہے حالانکہ اس وقت بالاجماع نماز ظہر کا وقت باقی رہتا ہے کیونکہ اگر ان لوگوں کے اس زعم کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر وقت عصر کے داخل ہونے سے پہلے ہی وقت کراہت آجائے اور نماز عصر کا بلا کراہت پڑھنا ممکن ہی نہ رہے گا۔ اور یہ زعم صریح باطل ہے۔ طحاوی علی الدرر میں ہے:

المراد ان یذهب الضوء فلا یحصل البصر به حیرة ولا عبرة لتغیر الضوء لان تغیر الضوء یحصل بعد الزوال. (فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۱۳۶)

علم منطق سے فقہ کی خدمت

اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ حضرت کو جس طرح علوم نقلیہ میں تبحر عطا فرمایا تھا ایسے ہی علوم عقلیہ میں بھی حظ وافر سے نوازا تھا علوم عقلیہ میں علم منطق و فلسفہ اساس کی حیثیت رکھتے ہیں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ ان دونوں علموں میں بھی عظیم درجے کی مہارت کے مالک تھے آپ نے ان فنون کی روشنی میں بہت سارے مسائل فقہ کا حل

پیش فرمایا۔ اب بعض ایسی نظیریں پیش کی جاتی ہیں جن میں علم منطق کے قواعد کے ذریعے مسائل کی عقدہ کشائی فرمائی ہے۔

(۱) امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نواقض وضو کے بارے میں ایک کلیہ بیان فرمایا ہے کہ: **ما لیس بحدث لیس بنجس**

اس کی شرح میں علماء کرام نے فرمایا کہ اس کا عکس نہیں آ سکتا لہٰذا یہ نہیں کہہ سکتے کہ **ما لا یکون نجسا لا یکون حدثا** علامہ شامی رحمۃ اللہ نے اس شرح کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اس عکس سے مراد عکس مستوی ہے کیونکہ عکس مستوی میں جزء اول کو ثانی اور ثانی کو اول بنا دیا جاتا ہے بشرطیکہ صدق و کیف باقی رہیں۔

اعلیٰ حضرت نے علامہ شامی کے بیان کردہ مطلب کو قابل اعتراض قرار دیا کہ عکس مستوی میں اصل قضیہ کی طرح صدق کا باقی رہنا ضروری ہے لہٰذا اگر اس عکس سے مراد عکس مستوی ہو تو پھر عکس مستوی کی نفی سے اصل قضیہ کی نفی لازم آئے گی کیونکہ عکس مستوی اصل قضیہ کو لازم ہے اور لازم کی نفی اصل کی نفی کو مستلزم ہو گی اس لیے یہاں عکس سے مراد عکس مستوی نہیں ہو سکتا ورنہ اصل قضیہ کی نفی لازم آئے گی لہٰذا یہاں عکس سے مراد عکس عرفی ہے اور عکس عرفی کی تعریف فرمائی کہ **ھو عکس الموجبتہ الکلیۃ کنفسھا مثلا کل حلال طاھر** لیکن اس کا عکس عرفی نہیں آ سکتا کیونکہ وہ کل طاہر حلال ہے حالانکہ ہر طاہر حلال نہیں ایسے ہی کہا جاتا ہے **ارتفاع العام لیستلزم ارتفاع الخاص** اس کا بھی عکس عرفی نہیں آ سکتا کیونکہ **ارتفاع الخاص ارتفاع العام** کو مستلزم نہیں ایسے ہی نفی مستلزم نفی الملزوم کا بھی عکس عرفی نہیں آتا کیونکہ نفی ملزوم نفی لازم کو مستلزم نہیں۔

(فتاوی رضویہ ج ۱ ص ۳۵۴)

(۱) اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ عبث کے معنے سے بحث کرتے ہوئے عبث کے بارے میں علماء نے بارہ طرز کی جو تعریفات کی تھیں انہیں نقل کیا اور ان میں سے اکثر علماء نے عبث کا معنیٰ بے فائدہ کام سے کیا تھا آپ ان تمام تعریفات کو نقل کر کے آخر میں ایک منطقیانہ بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح عاقل کا کوئی فعل اختیاری، اس وقت تک صادر نہیں ہوگا جب تک تصور بوجہ ما اور تصدیق بفائدہ مانہ ہو یوں ہی انسان کے ہوش وحواس جب تک حاضر ہیں بغیر کوئی شغل نہیں رہتا خواہ عقلی ہو جیسے کسی قسم کا تصور یا عملی ہو جیسے جوارح سے کوئی حرکت تو کسی قسم کا بھی شغل ہو نفس کے لیے اس میں اپنی عادت کا حصول اور اپنے مقتضی کا تیسر ہے اور یہ خود اس کے لیے ایک نوع نفع ہے۔ اگر چہ دین و دنیا میں سوائے ایک عادت بے معنی کی تحصیل کے اور کوئی ثمرہ و نفع اس پر مرتب نہ ہو بایں معنی کوئی فعل فعل اختیاری فاعل کے لیے اصلاً فائدہ سے عاری محض نہ ہوگا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ فائدہ قضیہ شرع بلکہ قضیہ مرضیہ عقل سلیم کے نزدیک بھی مثل لا فائدہ و محض غیر معتد بہا ہو بلکہ ممکن ہے کہ اس کا مآل ضرر بحت ہو جیسے کفار کی عبادات شاقہ کہ عاملة ناصبة تصلیٰ ناراً حامیة۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۹۹۰)

رقت وسیلان کے معنے کی تحقیق کرتے ہوئے علامہ شرنبلالی کا ایک قول نقل فرماتے ہیں کہ:

ان کل ما لا ینعصر لیس برقیق

علامہ کے اس پیش کردہ قاعدہ پر اعلیٰ حضرت نے بطرز منطق معارضہ قائم فرمایا کہ اس کا عکس کل رقیق ینعصر آتا ہے اور یہ عکس درست نہیں۔ کیونکہ تیل رقیق تو ہے لیکن منعصر نہیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ۴۱)

اعلیٰ حضرت طبعی طور پر منطق وفلسفہ وغیرہ فنون سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن فی نفسہ ان علوم میں مہارت رکھتے تھے جس پر آپ کی متعدد کتب شاہد و عادل ہیں کہ جن میں

آپ نے ان فنون کی اصطلاحات استعمال فرما کر مسائل کی وضاحت فرمائی۔ فتاویٰ رضویہ میں متعدد ایسے مقامات ہیں جہاں آپ نے منطقی انداز سے استدلال فرمایا ہے ہم نے یہ چند مقامات بطور مثال پیش کیے ہیں فتاویٰ رضویہ میں سبحان السبوح نامی ایک رسالہ شامل ہے جو خالص منطقی طرز پر تحریر فرمایا ہے جس سے آپ کی مہارت و حذاقت اور علم منطق کے اندر گہرائی اور بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس علم کے اندر بھی مجتہدانہ صلاحیتوں کا مالک بنایا تھا جس پر آپ کی وہ تحقیقات فقہیہ شہادت دے رہی ہیں کہ جن کے اندر آپ نے اس علم کے مختلف قواعد سے استدلال فرمایا اور متعدد مباحث فقیہ کا اضافہ فرمایا ہے۔

(فتاوی رضویہ ج ۱۵ ص ۳۱۱)

فلسفہ سے علم فقہ کی خدمت

پانی میں کسی قسم کی رنگت پائی جاتی ہے یا کہ نہیں اس میں اختلاف ہے بعض حضرات نے پانی کو بے لون قرار دیا ہے اور بعض حضرات ذی لون قرار دیتے ہیں اعلیٰ حضرت نے بھی اس بارے میں تحقیق فرمائی اور پانی کی رنگت کو ثابت فرمایا آپ فرماتے ہیں کہ علامہ فاضل احمد بن ترکی مارکی نے پانی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ **جوھر لطیف سیال لا لون له یتلون بلون انائه** اور سید شریف رحمہ اللہ تعالیٰ برف کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں **وھو مرکب من اجزاء شفافه لا لون لھا وھی الاجزا المائیة الرشیئة** ان دونوں تعریفوں کے مطابق پانی کا بے لون ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کی رائے اس کے برعکس ہے آپ فرماتے ہیں کہ پانی ذی لون ہے اور اس کے ذی لون ہونے پر آپ نے چند طرح استدلال فرمایا۔

(۱) فقہاء کرام نے اپنی کتابوں میں ماء مطلق کی بحث کرتے ہوئے پانی کو ذی لون

قرار دیا ہے۔(۲) حدیث شریف میں ہے ان الماء طھور لا ینجسه الا ما غلب علی ریحه و طعمه و لونه یہ حدیث ابن ماجہ کے علاوہ طحاوی اور سنن دار قطنی میں بھی مروی ہے جس سے پانی کا ذی لون ہونا صراحتاً ثابت ہو رہا ہے۔

(۳) تیسری دلیل فلاسفہ کے طرز پر دی کہ ابصار عادی دنیاوی کے لیے مرئی کا ذی لون ہونا شرط ہے اور پانی مرئی ہے لہٰذا پانی کا ذی لون ہونا ضروری ہے اگر پانی ذی لون نہ ہوتا تو یہ دکھائی نہ دیتا حالانکہ ہم اس کو دیکھتے ہیں اس کا دیکھا جانا اس کے ذی لون ہونے کی دلیل ہے۔

حدوث الوان کے لیے روشنی شرط نہیں

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے پانی کی رنگت کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے ابن سینا و ابن ہیثم وغیرہ کے اس زعم کو بھی باطل قرار دیا ہے کہ حدوث الوان کے لیے روشنی شرط ہے آپ فرماتے ہیں ان فلسفیوں کا کہنا ہے کہ رنگ کے حدوث کے لیے روشنی شرط ہے اس سے لازم آتا ہے کہ تاریک جگہوں میں رنگ معدوم ہو اور روشنی کے آنے پر دوبارہ رنگ لوٹ آئے۔ حالانکہ یہ ان فلاسفہ کے مذہب کے بھی مخالف ہے کیونکہ ان کے مذہب کے مطابق اعادہ معدوم محال ہے اور یہاں اعادہ معدوم لازم آرہا ہے نیز اس کے علاوہ حدیث شریف سے استدلال کیا کہ حدوث الوان کے لیے روشنی کی شرط نہیں کیونکہ جہنم کے بارے میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے جہنم کے تاریک و سیاہ ہونے کا بیان ہے لہٰذا یہاں بھی تاریکی کے ساتھ سیاہی کا وجود ہے تو معلوم ہوا کہ حدوث الوان کے لیے ضیاء شرط نہیں۔

پانی کا رنگ سفید ہے یا سیاہ

کتب فقہ میں ایک عنوان باب المیاہ کے نام سے باندھا جاتا ہے جس میں پانی کی اقسام اور پانی کی طہارت ونجاست سے بحث ہوتی ہے اور اسی ضمن میں پانی کے اوصاف ثلاثہ رنگ، ذائقہ، بو کا بھی ذکر ہوتا ہے فقہاء کرام کے مابین رنگ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ کیا پانی کا رنگ ہے یا کہ نہیں اگر ہے تو وہ رنگ سپید ہے یا سیاہ بعض حضرات کے نزدیک پانی کی رنگت سپید ہے اور بعض حضرات کے نزدیک سیاہ ہے ہر گروہ اپنے دعوے کے ثبوت پر حدیث سے استدلال کرتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کی تحقیق کے مطابق پانی کا رنگ نہ خالص سپید ہے اور نہ خالص سیاہ بلکہ سپید مائل بیک گونہ سواد خفیف ہے۔

اور جو علماء پانی کے رنگ کو سپید قرار دیتے ہیں ان کی دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

حوضی و مسیرته شهر مائه ابیض من اللبن وریحه اطیب من المسک

دوسری حدیث میں ابیض من الورق ہے جس سے پانی کی رنگت کا سپید ہونا معلوم ہوتا ہے اعلیٰ حضرت نے ان کے استدلال کا جواب دیا کہ حوض کوثر کے پانی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں سپیدی پائی جاتی ہے جس طرح کہ اس کی خوشبو کا مشک سے زیادہ خوشبودار ہونا اس کی خصوصیت ہے۔ حالانکہ مطلق پانی میں خوشبو قطعاً نہیں ہوتی لہٰذا اس پر قیاس کر کے رنگ کو سپید ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اور جو حضرات رنگت کی سیاہی کے قائل ہیں ان کی دلیل حضرت عروہ کی وہ حدیث ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے انہوں نے روایت کی ہے کہ:

یا ابن اختی کنا ننظر الی الهلال ثم الهلال ثم الهلال ثلثة اهلة فی شهرین

وما اوقد فی ابیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم نار.

حضرت عروہ کہتے ہیں کہ میں نے اس پر حضرت عائشہ سے عرض کی کہ:

وما کان یعیشکم تو انہوں نے ارشاد فرمایا الاسود ان التمر والماء

(الفتاوی رضویہ ج ۲)

اس حدیث میں پانی اور کھجور دونوں کو اسود کہا گیا ہے اعلیٰ حضرت نے اس کا جواب دیا کہ یہاں پانی کو تغلیباً اسود کہا گیا ہے جیسا کہ قمرین میں تغلیباً شمس کو بھی قمر کہہ دیا گیا ہے۔

فقہاء متقدمین اور اعلیٰ حضرت

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے فقیہ تھے کہ آپ کی فقاہت کے سبب علم وفضل کے ان مخفی گوشوں تک صاحبان طلب کی رسائی ہوئی جو رہنمائی کی نایابی کے باعث مجبور بیٹھ گئے تھے، امام احمد رضا ایک مقلد تھے آپ کا فقہی مسلک حنفی تھا لیکن آپ ایسے مقلد تھے کہ جس کی تقلید کے دامن میں اجتہاد و استنباط کی وسعتیں اپنی تمام تر گہرائیوں اور گیرائیوں کے ساتھ سمٹ کر آ گئی تھیں۔ اعلیٰ حضرت بزرگان دین وفقہاء ملت وعلماء ومتقدمین کے خوشہ چین اور ان کے فضل وکمال کے معترف اور ان کی عظمتوں کے اور ان کی رفعتوں کے حاکی اور ان کے علو واعزاز کے قائل اور ان کے تبحر علمی کا اجاگر کرنے والے اور ان کے فضل وکمال کی شہادت دینے والے، ان کے کمالات کو سراہنے والے تھے۔ کیا زبان سے کیا بیان سے، لیکن ان کی بصیرت ہر وقت ان کی رہنمائی کے لیے موجود رہتی ہے۔ سلف صالحین کے قدم پر چلنے سے پہلے اس کی صحیح سمت کا اندازہ لگاتے ہیں اور پھر قدم اٹھاتے ہیں۔

آپ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سچے مقلد اور متشدد متبع تھے اور ان

کی اصابت رائے اور اجتہاد وفکر اور قیاس و استحسان کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہیں لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے متبعین ومقلدین فقہاء کرام سے دامن ادب تھام کر ایک مجتہد کی طرح ضرور اختلاف کرتے ہیں۔ اور پختہ رائے سے اپنا موقف ثابت کرتے ہیں۔ اسلاف کرام کے لوازم واعزاز واحترام واکرام کو قدم قدم پر ملحوظ رکھتے ہیں اور جہاں حق گوئی کی بات آئی تو وہاں اس کے بیان کرنے میں کوئی جھجک پیدا ہونے نہیں دی جب فقہاء کرام اور اصولیین کے جھرمٹ میں گرے ہوئے ہوں تو پھر ادب وفرق مراتب کا دامن تھام کر مردانہ وار اختلاف رائے کرتے ہیں اور اپنے اختلاف کو فاضلین فن کے اقوال اور اس فن کی کتب کے حوالے سے مبرہن کرتے ہیں۔ عقلی ونقلی دلائل سے اپنے موقف کو ثابت کرتے ہیں، حقیقت بات یہ ہے کہ اسلاف والا مراتبت جو علم وفن کی بلندیوں پر کمندیں ڈالتے تھے ان سے معارضہ اور تعاقب کوئی آسان بات نہیں ان سے اختلاف رائے اور ان کے اقوال کے تعاقب کے لیے اور قول مرجح کو پیش کرنے کے لیے ویسا ہی فضل وکمال درکار تھا جیسا کہ علماء متقدمین کو حاصل تھا اب ہم ایسی چند امثلہ پیش کرتے ہیں جن میں اعلیٰ حضرت نے فقہاء متقدمین سے اختلاف رائے فرمایا اور اپنے موقف کو دلائل و براہین سے ثابت فرمایا ہے جن سے آپ کے فقہی مقام کی بلندی وعظمت اور اجتہادی قوت وبصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ سید طحاوی اور اعلیٰ حضرت

فقہاء کرام نے ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ جو شئی بھی جسم سے بوجہ مرض خارج ہو وہ ناقض وضو ہے اس قاعدے کی بنا پر علامہ طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے درمختار

کے حاشیہ میں فرمایا کہ زکام سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا امام احمد رضا نے علامہ طحاوی کا تعاقب فرمایا کہ فقہاء کا یہ ضابطہ مطلقاً نہیں بلکہ مقید ہے کہ وہ بیماری سے خارج ہونے والی شئی میں خون یا پیپ کی آمیزش کا شائبہ ہو اس پر آپ نے فقہ کی مختلف کتب کی عبارات پیش کیں کہ جن میں اس کی تصریح موجود ہے قاعدہ کی وضاحت کے علاوہ زکام کے ناقض وضو نہ ہونے پر مستقل دلیل بھی رقم فرمائی۔

۱۔ فقہاء کرام نے یہ تصریح فرمادی ہے کہ دماغ سے نازل ہونے اور پیٹ سے صادر ہونے والے بلغمی رطوبات ظاہر ہیں ان کا اخراج ناقض وضو نہیں اور زکام کے ذریعہ بھی ناک کے راستے رطوبات بلغمی کا اخراج ہوتا ہے لہٰذا زکام کا خروج ناقض وضو نہیں۔

۲۔ فقہاء کرام نے ضابطہ مقرر فرمایا ہے کہ نجاست کا خروج موجب حدث ہے۔

۳۔ زکام ایک عام چیز ہے دنیا کا کوئی شخص بھی جس نے چند سال عمر پائی ہو وہ اس میں ضرور مبتلا ہوا ہوگا۔ ایسے ہی صحابہ و تابعین و آئمہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہے ہونگے۔ اگر زکام ناقض وضو ہوتا تو ان حضرات کی طرف سے تصریحات ملتیں حالانکہ کہیں بھی کوئی تصریح نہیں پائی جاتی بارہ سو برس بعد علامہ سید طحاوی نے ہی زکام کو ناقض وضو قرار دیا ہے اس لیے ان کا یہ قول محل نظر بلکہ غیر مفتی بہ ہے۔ یہ امام احمد رضا کا ہی فقہی مقام ہے کہ امام طحاوی جیسے محدث وفقیہ کا تعاقب فرما کر اپنے موقف کو دلائل سے مبرہن فرمایا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ا ص ۳۴۷ تا ۳۴۹)

علامہ شامی اور اعلیٰ حضرت

حضور ﷺ نے اپنی حیات اقدس میں اذان دی ہے یا کہ نہیں بعض علماء کرام نے فرمایا کہ آپ نے ایک سفر میں اذان دی تھی جس پر ترمذی شریف کی ایک حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضور علیہ ﷺ نے ایک مرتبہ کسی سفر مین اذان دی ہے بعض علماء کرام نے اس قول کا رد کیا ہے کہ ترمذی کی حدیث میں اذان کی نسبت آپ کی طرف مجازی ہے کیونکہ امام احمد نے ترمذی کے ہی طریق پر روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا تھا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

مما یکثر السؤال عنہ ھل باشر النبی ﷺ الاذان بنفسہ وقد اخرج الترمذی انہ علیہ السلام اذن فی سفر و صلی باصحابہ وجزم بہ النوری ولکن وجد فی مسند احمد من ھذا الوجہ انہ امر بلالا فاذن فعلم ان فی روایت الترمذی اختصارا ان معنی قولہ اذن امر بلالا.

اعلیٰ حضرت کی تحقیق یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ سفر میں اذان دی ہے اس کو اسناد مجازی پر محمول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تحفہ امام ابن حجر میں ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ سفر میں اذان دی ہے اور اس اذان کے تشہد میں اشہد انی رسول اللہ کے الفاظ وارد ہیں اور اس میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش بھی نہیں۔ نیز علامہ شامی نے تحفہ کی اس روایت کو دوسری جگہ ذکر کر کے اس کی صحت کو بھی بیان کیا ہے۔

فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۳۷۳

امام نووی اور اعلیٰ حضرت

وضو سے فارغ ہونے کے بعد اعضاء وضو کو کپڑے سے پونچھنے کے بارے میں بعض حضرات کراہیت کے قائل ہیں۔ اس پر صحیحین کی ایک حدیث پیش کرتے ہیں حضور ﷺ غسل سے فارغ ہوئے تو ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پونچھنے کے لیے ایک کپڑا پیش کیا تو آپ نے کپڑا نہ لیا اور پانی کو ہاتھ سے پونچھ پونچھ کر جھاڑ دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو و غسل کے بعد کپڑے سے پونچھنا مکروہ ہے۔ حضرت امام نووی اس روایت کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ وہ کپڑا میلا ہو اور حضور ﷺ نے اس بناء پر واپس کیا ہو۔ لہٰذا یہ ایک خاص واقعہ ہے جس کو عموم پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

مگر اعلیٰ حضرت کو یہ تاویل پسند نہیں آئی کیونکہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ کون حضور ﷺ کی نظافت اور لطافت طبع کو جاننے والا ہو سکتا ہے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

وفیہ بعد ان تکون ام المومنین اختارت له صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم مثل هذا مع علمها بکمال نزاهته ولطافته صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم.

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی نظافت طبع تو ظاہر کی مگر ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نظافت طبع اور مزاج شناس رسول ﷺ ہونے کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ پھر اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے اپنی طرف سے ایک تاویل کی کہ آپ نے کپڑا بوجہ عجلت قبول نہیں فرمایا تھا۔ اس تاویل پر پھر اعتراض کیا کہ اگر آپ کو جلدی تھی تو پھر پونچھنے اور ہاتھ سے صاف کرنے میں کیا فرق پڑتا حالانکہ آپ سے ہاتھ سے

صاف فرمایا ہے۔

اس کا خود ہی جواب دیا کہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے فانطلق وھو ینفض یدیہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو عجلت تھی اس لیے ہاتھوں کو جھاڑتے ہوئے تشریف لے گئے اور کپڑے کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ اس واقعہ سے اعضاء کو کپڑے سے پونچھنے کی ممانعت پر استدلال کرنا صحیح نہیں بلکہ یہ کپڑے سے پونچھنے کی سنت پر دلیل ہے کیونکہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آپ کی خدمت میں کپڑا پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آپ کی عادت مبارکہ تھی۔ (فتاوٰی رضویہ ج ا ص ۳۱۴)

علامہ ابن نجیم اور اعلیٰ حضرت

وضو میں جو اعضاء دھوئے جاتے ہیں ان پر پانی بہانا فرض ہے لیکن فقہاء کرام نے اس میں کچھ باریکیاں پیدا فرما دی ہیں۔ اعلیٰ حضرت اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ منہ، ہاتھ پاؤں تینوں اعضاء مذکورہ پر پانی بہانا ضروری ہے فقط بھیگا ہاتھ پھیرنا یا تیل کی طرح چپڑ لینا بالاجماع کافی نہیں۔ بلکہ ان تمام اعضاء کے تمام ذروں سے کم از کم دو دو بوندیں گریں۔

اس کے بعد ابن نجیم کا قول نقل کیا کہ وہ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک غسل کے معنے صرف تر کرنے کے ہیں۔ خواہ اپنی جگہ سے بہے یا نہ بہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف کا یہ قول اپنے ظاہر پر نہیں بلکہ اس کی تاویل کی گئی ہے غسل کا معنیٰ یہ ہے کہ عضو مغسولہ سے ایک یا دو قطرے بہ جائیں لیکن پے درپے قطرات نہ ٹپکیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے غسل کا حکم دیا ہے اور اگر یہ قول اپنے

ظاہر پر رہے تو پھر یہ نہ لغۃً غسل ہے اور نہ شرعاً کیونکہ لغت میں میل وغیرہ کو دور کرنے اور پانی کو جاری کرنے کو کہا جاتا ہے۔ (فتاوی رضویہ ج ۱)

امام ابن ھمام اور اعلیٰ حضرت

امام ابن ھمام رحمہ اللہ تعالیٰ وضو میں بسم اللہ اور ذکر الٰہی کو واجب عملی قرار دیتے ہیں۔ امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ ان کے قول کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

لم یات المستدل بشی حتی سمع ما سمع.

اور فرماتے ہیں کہ مسئلہ تسمیہ میں صرف علامہ ابن ھمام نے ہی یہ قول کیا ہے یہ نہ ائمہ مذہب سے منقول ہے اور نہ ہی محققین کے ہاں مقبول بلکہ ابن ھمام کے اپنے شاگرد قاسم ابن قطلو بغا نے کہا ہے کہ ہمارے شیخ کی جو مباحث مذہب کے مخالف ہونگی تو وہ معتبر نہیں ہونگی۔ اعلیٰ حضرت نے علامہ قاسم کے قول پر اضافہ فرمایا کہ یہ مخالفت اس وقت غیر معتبر ہوگی جبکہ وہ اختلاف زمانہ کی وجہ سے پیدا نہ ہوا گر یہ اختلاف زمانے کے اختلاف سے پیدا ہو تو معتبر ہوگا مثلاً تعلیم واذان اور امامت وغیرہ پر اجرت کے جواز کا فتویٰ اگر مذہب کے مخالف ہے لیکن یہ مخالفت اختلاف زمانہ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اس لئے اس قسم کا اختلاف معتبر ہوگا۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۲۹۳)

یہ ہیں وہ چند مقامات جہاں پر امام احمد رضا نے متقدمین سے اختلاف کیا اور اپنے موقف و دلائل کو براہین سے ثابت فرمایا۔ ان کے علاوہ متعدد مقامات ایسے ہیں کہ جہاں امام احمد رضا نے علماء متقدمین سے اختلاف رائے فرمایا اور اپنی اصابت فکر اجتہادی قوت سے اپنے موقف کو ثابت فرمایا۔

معاصرین اور اعلیٰ حضرت

اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح متقدمین کے ساتھ اختلاف رائے کیا اس طرح اپنے معاصرین علماء کے ساتھ بھی متعدد مقامات میں اختلاف کیا اور اپنے موقف کو پختہ دلائل سے ثابت فرمایا۔ اعلیٰ حضرت ہر ذی علم سے اختلاف رائے کرتے ہیں لیکن آپ کا اختلاف اور ان لوگوں کے اختلاف میں بڑا فرق ہے جو اختلاف برائے شہرت یا اختلاف برائے اختلاف پر مبنی ہوتا ہے یہ اختلاف کبھی اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ فریق مخالف کے غلطی پر ہونے کا ظن غالب ہو جاتا ہے اور کبھی آگے بڑھتے بڑھتے اتحاد کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اب ایسی چند امثلہ پیش کی جاتی ہیں جن میں آپ نے اپنے معاصرین کے ساتھ اختلاف رائے فرمایا ہے۔

اعلیٰ حضرت اور خلیل احمد انبیٹھوی

اسمٰعیل دہلوی نے بعض لوگوں کی اتباع میں امکان کذب کا نظریہ پیش کیا اور اپنا ایک رسالہ یکروزی لکھ کر اس نظریہ کی اشاعت کی تو اس وقت کے علماء نے اس نظریہ کی تردید کی اور تصنیف و تالیف اور مباحثوں و مناظروں کے ذریعہ اس نظریئے کو پھیلنے پھولنے نہ دیا۔ لیکن سالہا سال بعد خلیل احمد انبیٹھوی نے اپنی کتاب براہین قاطعہ میں میں دوبارہ اس نظریئے کو داخل کر کے امت مسلمہ کے اندر افتراق و انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی اور یہی مسئلہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس کا معرکۃ الاراء جواب دیا جو سبحان السبوح عن عیب الکذب المقبوح کے تاریخی نام سے مشہور ہے اور یہ رسالہ آپ کے فتاویٰ رضویہ میں شامل ہے۔

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاً تو ایک مقدمہ قائم فرمایا جس میں یہ ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر صفت کمال کا ثبوت واجب اور ہر صفت نقصان ناممکن ومحال ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اسی صفت کا ثبوت ہوگا جو اس کے ساتھ تعلق کی قابلیت رکھتی ہو اور اس کے بعد چار تنزیہات پیش کیں جن میں اللہ تعالیٰ کے کذب کا امتناع اور اشاعرہ و ماتریدکا کذب باری کے ممتنع ہونے پر اجماع ثابت کیا اور امتناع کذب باری تعالیٰ پر تیس دلیلیں ذکر کیں جن میں سے پانچ علماء متقدمین کی بیان کردہ ہیں اور پچیس کا اپنی طرف سے اضافہ فرمایا اور تنزیہ سوم کے عنوان کے تحت امکان کذب کے قائلین کے دلائل ذکر کر کے ان کو رد فرمایا اور آخر میں امکان کذب کے قائلین کے اس مغالطے کا ازالہ بھی فرمایا کہ یہ مسئلہ زمانہ قدیم سے مختلف فیہا چلا آرہا ہے کیونکہ خلف وعید کے قائلین علماء کرام بھی امکان کذب کے قائلین و مجوزین نہیں بلکہ ان کی عبارت سے یہ ثابت ہے کہ وہ بھی کلام باری میں کذب کو محال سمجھتے ہیں۔

اس پر آپ نے دس دلیلیں پیش کیں کہ علماء حق کے نزدیک خلف وعید بمعنی عدم ایقاع یہ تو عین عفو وکرم ہے اور خلف بمعنی تبدیل قول اور تکذیب خبر کہ جس پر امکان کذب متفرع ہو سکے اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۵ص ۳۱۱)

مفتیان سبعہ اور اعلیٰ حضرت

نفاذ وصیت اور موصیٰ لہٗ بالزائد کے رد علی الزوجین پر ترجیح کے بارے میں ایک استفتاء کے جواب میں آٹھ مفتیوں نے فتویٰ صادر کیا تھا مگر ہر ایک میں کچھ نہ کچھ اختلاف وتضاد پایا جاتا تھا تو چیف کورٹ ریاست بہاولپور۔نے اس استفتاء اور تمام مفتیوں کے فتووں کو اعلیٰ حضرت کے پاس بھجوایا۔

اعلیٰ حضرت نے ان مسائل کے متعلق بارہ افادات تحریر فرمائے اور ہر ایک افادے کے تحت مجموعی ستائیس فائدے اور ایک سو چوبیس تفریعات میں ان فتووں کی خاص خاص اغلاط کی نشاندہی فرمائی اور پھر آخر میں اصل استفتاء کا حکم اور جواب تحریر فرمایا اور پھر اخیر کے عنوان سے تمام جوابات کے اجمالی احکام ذکر کیے۔

آپ کا یہ فتویٰ نہایت ہی معرکۃ الاراء اور طویل ہے جو سوال سے جواب تک سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تحقیقی فتوے کے مطالعہ کرنے سے اعلیٰ حضرت کی فقہی بصیرت و معاصرین پر فوقیت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ واقعی امام احمد رضا قوت اجتہاد، بصیرت فکر، ذہانت و تعقل اور علمی استحضار میں اپنے دور میں بے مثل و بے نظیر تھے۔ (فتاویٰ رضویہ ج۲۵ص۲۰۳)

مولانا عبدالحی اور اعلیٰ حضرت

بعض لوگوں نے نماز کے بعد دعا مانگنے کو بدعت قرار دیا تھا مولانا عبدالحی صاحب سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے دعا بعد از نماز کے ثبوت پر صرف ایک حدیث پیش فرمائی اور یہی مسئلہ فرقہ اہل حدیث کے امام نذیر احمد دہلوی سے پوچھا گیا تو انہوں نے بھی ایک حدیث پر اکتفاء کیا۔ اور اعلیٰ حضرت سے جب دعا بعد الصلوٰۃ کا ثبوت طلب کیا گیا تو آپ نے ایک آیت کریمہ اور دس احادیث سے استخراج فرمایا۔

اشرف علی تھانوی اور اعلیٰ حضرت

اذان میں حضور ﷺ کا نام اقدس سنکر انگوٹھے چومنے کے بارے میں اشرف

علی صاحب تھانوی نے ایک فتویٰ صادر کیا کہ اذان سنکر انگوٹھے چومنا کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں اور اس بارے میں جو کچھ روایات مروی ہیں وہ ارباب تحقیق کے نزدیک درجہ ثبوت تک نہیں پہنچیں اور اقامت کے بارے میں تو غیر معتبر روایت بھی موجود نہیں اعلیٰ حضرت نے ان کا ایسا تعاقب فرمایا کہ جس کی مثال بہت کم ملتی ہے آپ نے ان کے اس فتوے کو تیس سے زائد وجوہ سے رد کیا چند وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ تھانوی صاحب نے فرمایا کہ تقبیل ابہامین کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں یہ سلب کلی ہے حالانکہ فقہ کی ایک ہزار سے زائد کتب میں تقبیل الابہامین کے بارے میں روایت موجود ہے۔

۲۔ تقبیل الابہامین حدیث موقوف سے ثابت ہے اور یہ عمل حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے اور ان کا عمل ہی کافی ہے کیونکہ خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی اطاعت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لازم قرار دیا ہے۔

۳۔ حدیث کی صحت کی نفی حدیث کے غیر معتبر ہونے کو مستلزم نہیں کیونکہ کتب رجال میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ حدیث غیر صحیح معتبر ہوتی ہے اور فضائل اعمال میں حدیث اگرچہ صحیح یا حسن نہ بھی ہو قابل اعتبار ہوتی ہے۔

۴۔ کسی فعل پر کراہیت کا حکم لگانے کے لیے بھی نص کا ثبوت ضروری ہے۔ یہاں کونسی نہی وارد ہے۔

۵۔ اقامت میں بھی انگوٹھے چومنا مستحسن ہے کیونکہ اس کا منشاء یعنی نام اقدس سن کر تعظیم کرنا موجود ہے نیز اذان میں انگوٹھے چومنا جب ثابت ہوا تو اقامت میں بھی چومنا مستحسن ہوگا کیونکہ یہ بھی تعظیم کا ایک فرد ہے اور تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کم از کم مستحسن ہے۔

۶۔ آخر میں اعلیٰ حضرت نے کتب فقہ کی وہ عبارات نقل کیں جن عبارات کو نقل کرنے میں تھانوی صاحت نے کمی وزیادتی سے کام لیا تھا۔ آپ نے متعلقہ عبارت بتمامہا کو نقل کر کے زیادتی ونقصان کی نشاندہی فرمائی۔

رشید احمد گنگوہی اور اعلیٰ حضرت

رشید احمد گنگوہی سے منی آرڈر کے بارے میں حکم شرعی دریافت کیا گیا کہ یہ اجارہ بن سکتا ہے یا کہ نہیں تو انہوں نے منی آرڈر کو ربا (سود) ٹھہرا کر حرام قرار دیا اور یہی سوال اور گنگوہی صاحب کا جواب اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس بھجوایا گیا تو آپ نے محققانہ جواب تحریر فرمایا اور گنگوہی صاحب کے فتوے کو کئی وجوہ سے رد کیا گنگوہی صاحب نے منی آرڈر کے اجارہ نہ ہونے پر دو دلیلیں دی تھیں۔

۱۔ یہ اجارہ نہیں بن سکتا کیونکہ منی آرڈر کا روپیہ اگر تلف ہو جائے تو بھیجنے والا محکمہ ڈاک سے ضمان طلب کرتا ہے حالانکہ اجارے میں شئی تلف ہو جائے تو اجیر ضامن نہیں ہوتا۔

۲۔ اگر اجارہ ہوتا تو بعینہ اسی روپے کا پہنچانا لازم ہوتا حالانکہ اس امر کا نہ بھیجنے والا خیال کرتا ہے اور نہ ڈاک والے اعلیٰ حضرت نے اولاً گنگوہی صاحب کا منشاء غلطی بیان کیا کہ انہیں غلطی اس لیے لگی ہے کہ انہوں نے منی آرڈر کو قرض محض سمجھا ہے اور یہ کہہ دیا کہ دس روپے منی آرڈر کرنے پر ڈاک والے دو آنے وصول کرتے ہیں اور یہ دو آنے بلاعوض ہیں اور ربا ہیں حالانکہ یہ دو آنے روپے کا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے اور رسید لانے کی اجرت ہے کیونکہ ڈاک خانہ اجیر مشترک کی دوکان ہے جو بغرض تحصیل اجرت کھولی گئی ہے یہ دو آنے وہاں جانے اور رسید لانے کی اجرت ہے جیسا کہ لفافہ و

پارسل وغیرہ کی اجرت دی جاتی ہے جس طرح پارسل وغیرہ کی صورت میں سود متحقق نہیں ایسے ہی منی آرڈر کی صورت بھی سود سے خارج ہے اس کے بعد گنگوہی صاحب کی دونوں دلیلوں کا رد کیا۔

دلیل اول کا چند طرح رد فرمایا

۱۔ وجوب ضمان مطلق اجارہ کے منافی نہیں کیونکہ صدھا صورتوں مین اجیر پر ایجاب ضمان کا حکم ہوتا ہے۔

۲۔ اگر مطلق نفی ضمان تسلیم کر لیا جائے تو اس سے طلب ضمان ناجائز ہوگا اور محکمہ ڈاک بری ہوگا۔ لیکن اس سے اصل عقد کیوں بدلے گا بہت سارے لوگ عاریت پر تاوان لیتے ہیں۔ اور جاہل مستعیر ذمہ داری بھی لیتے ہیں کیا یہاں بھی نفس عاریۃ منتفی ہو جائے گی۔

۳۔ منی آرڈر اجارہ محضہ بھی نہیں بلکہ قرض کا معنیٰ بھی یقیناً متحقق ہے اور قرض میں مثل کا رد کرنا اس کا خاص حکم ہے تو یہ تضمین یہاں پر بر بنائے اجارہ نہیں بلکہ بر بنائے قرض ہے دوسری دلیل کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اس روپے کا بعینہ پہنچانا تب لازم ہوتا جب کہ وہ اجارہ ہوتا حالانکہ یہاں تو ڈاک خانہ زر کو دوسری جگہ لے جا کر ادا کرنے اور وہاں سے رسید لانے پر اجیر اور داخل کردہ رقم کا مستقرض و مدیون ہوتا ہے۔ لہٰذا ڈاک خانہ میں داخل کردہ زر جب ڈاک خانہ والوں پر قرض اور دین ہوا اور دین میں بعینہ اسی زر کا واپس کرنا لازم نہیں ہوتا گنگوہی صاحب کی دونوں دلیلیں صرف اس قدر پر دال ہیں کہ منی آرڈر اجارہ محضہ نہیں حالانکہ دعویٰ تو تب ثابت ہوتا جبکہ وہ منی آرڈر کو قرض محض خالی عن الاجارہ ہونا ثابت کرتے۔

اس کے بعد منی آرڈر کے اجارہ ہونے پر محققانہ بحث فرمائی کہ ڈاک خانہ اجیر مشترک ہے اس میں جس قدر بھی فیسیں ہیں سب اجرت عمل ہیں اس پر شبہ کا بھی ازالہ فرمایا کہ اگر منی آرڈر کی رقم ضائع ہو جائے تو محکمہ ڈاک ضامن ہوتا ہے حالانکہ اجارے میں شرط ضمان باعث فساد عقد ہوتی ہے۔ آپ نے اس شبہ کا یوں ازالہ فرمایا کہ یہ شرط لوگوں کے عرف میں جاری ہے اور جو شرط عرف مین متعارف ہوتی ہے وہ شرط بیع واجارہ وغیرہ عقود میں جائز ہوتی ہے اور باعث فساد نہیں ہوتی۔

ہمارے آئمہ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے **قول الاجارۃ تفسدھا الشروط الفاسدۃ کما تفسد البیع** ۔ سے مراد بھی شروط غیر متعارفہ ہی ہیں۔ منی آرڈر میں شرط ضمان تمام بلاد اسلامیہ میں متعارف ہے لہٰذا یہ شرط باعث فساد نہیں ہوگی۔

اس کے بعد اس شبہے کا بھی ازالہ فرمادیا کہ عرف کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں واقع ہونا ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ عرف کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں واقع ہونا ہرگز ضروری نہیں اس پر کتب فقہ کی تیس عبارات پیش کیں کہ جن میں بیع کے اندر شرط متعارف لگائی گئی ہے لیکن وہ شرط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں متعارف نہ تھی۔

آخر میں عرف کا تمام جہاں کے تمام مسلمانوں کو محیط ہونا ضروری ہے یا کہ بلاد کا عرب کو پانچ دلیلیں قائم فرما کر یہ ثابت کیا کہ عرف کا تمام جہاں کے تمام مسلمانوں کو محیط ہونا ضروری نہیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج۱۹ص۵۶۳)

حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت و کردار

اللہ تعالیٰ نے روز و شب نہ جانے کتنے انسانوں کو وجود بخشا اور نہ جانے کتنے انسانوں کو عدم کی منزلوں سے ہمکنار فرمایا۔ مگر کبھی کبھی عالم وجود میں کچھ ایسی پاکیزہ ہستیاں جلوہ گر ہوتی ہیں جو آسمان علم و عمل پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتی ہیں اور دین اسلام کی نصرت اور مذہب کی حمایت کو اپنی حیات مستعار کا جزو بنا دیتی ہیں اور دینی و علمی خدمات میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قربان کر دیتی ہیں اور اپنی زبان و قلم کو ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی اشاعت میں مصروف رکھتی ہیں۔ ایسی ہی ایک ہستی مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تھی جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ دین اور علوم دین کی خدمت میں صرف کیا۔

حضرت مفتی اعظم پاکستان تاریخ اسلام کی ان دلآویز ہستیوں میں سے ایک تھے جو تاریخ بشریت میں خال خال پیدا ہوتی ہیں۔

آپ کی ذات بلند حوصلگی، اولوالعزمی، عمل پیہم، جہد مسلسل، ایمان محکم کی زندہ و جاوید تصویر تھی۔ آپ نے دین اسلام کی نصرت، مسلک اہل سنت کی ترویج و اشاعت، علوم دینیہ کے فروغ، مقام مصطفیٰ کے تحفظ، افکار رضا کی تبلیغ کے لیے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ عالم کے صفحات میں آب زر سے ثبت کرنے کے لائق و قابل صد تحسین ہیں۔

حضرت مفتی اعظم پاکستان بیک وقت ایک عظیم محدث، جلیل القدر فقیہہ، اعلیٰ

مدبر و منتظم، مشفق و مہربان استاذ و مربی، بلند پایہ مدرس، علوم دینیہ کے درخشاں آفتاب اور فنون عقلیہ کے بحر ذخار اور صائب الرائے مفکر اور اس علمی ذوق کے امین تھے جو اکابر اہل سنت سے آپ کو بطور وراثت ملا تھا۔ اس قحط الرجال کے دور میں آپ کا وجود نشان راہ اور علم و عمل کی اجاڑ بستیوں میں نور نواز آفتاب تھا۔ آپ کی وفات سے دنیائے علم و فضل کا ایک درخشاں آفتاب غروب ہو گیا۔

آج کے دور میں دین اور علوم دین کی حفاظت و اشاعت کے لیے حضرت مفتی اعظم ایسے مجاہد عالم دین کا وجود اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت تھا۔ افسوس کہ ہم آپ کے وجود مسعود سے محروم ہو گئے۔

ضرورت جتنی بڑھ رہی ہے صبح روشن کی
اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

آج ہم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس دور میں اسلام کے خلاف ہر سو سے حملے ہو رہے ہیں۔ الحاد و بے دینی نے ایک منظم شکل اختیار کر لی ہے اور اس کی تائید کے لیے مرتب و مدون فلسفے وجود میں آ چکے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن اور اسلام کے تصادم سے آج مختلف سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور یہ سوالات سرسری اور سطحی قسم کے نہیں۔ بلکہ نہایت گہرے، عمیق اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مسائل سے جو علمائے اسلام عہدہ برآ ہو سکتے تھے وہ یکے بعد دیگرے ہم سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور جو چند معدودے حضرات باقی ہیں معلوم نہیں وہ کتنے دنوں کے مہمان ہیں۔

گزشتہ ربع صدی کا آپ جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ وراثت علم نبوت کے کتنے جلیل القدر آفتاب و ماہتاب یکے بعد دیگرے ہمیں داغ مفارقت دیتے چلے

گئے۔لیکن ہمیں دور دور تک ان کا نعم البدل تو کجا بدل محض بھی نظر نہیں آتا۔ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ دینی علوم کے ارتقاء کے بجائے تنزل کا دور ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے اس بات پر اظہار ملال فرمایا ہے۔کہ کائنات ارض سے علم وعلماء کا خاتمہ ہو جائے۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا؛

ان الله لا يقبض العلم انتزاعا من العباد ولكن يقبض العلم بقبض العلماء.

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰)

اللہ تعالیٰ بندوں کے سینوں سے علم نہیں چھینے گا بلکہ علماء کے اٹھائے جانے سے علم اٹھایا جائے گا۔

حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا؛

خذوا العلم قبل ان يقبض او يرفع فقال اعرابى كيف يرفع؟ فقال ان ذهاب العلم ذهاب حملته ثلاث مرات.

(فتح الباری ج ۱۔ ص ۱۹۵۔ عمدۃ القاری۔ ج ۲۔ ص ۱۳۲)

علم کے اٹھائے جانے سے پہلے علم حاصل کرو۔ایک دیہاتی نے عرض کیا کیسے علم اٹھایا جائے گا؟ آپ نے فرمایا علم کا اٹھنا اہل علم کا اٹھ جانا ہے۔یہ بات آپ نے تین مرتبہ تکرار سے فرمائی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

ان قبض العلم ليس ينزع من صدور الرجال ولكنه فناء العلماء.

(المدخل الکبیر الی السنن الکبریٰ ص ۳۴۲)

علم کا اٹھنا یہ نہیں کہ لوگوں کے سینوں سے نکال لیا جائے گا بلکہ علماء کا ناپید ہونا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ علم کو اس کے ختم ہونے سے پہلے پہلے

حاصل کرو۔ علم کا ختم ہونا علماء کی موت ہے۔

ابن شہاب زہری نے فرمایا کہ علم بڑی تیزی سے سلب ہو جاتا ہے۔ علماء حق کے وجود سے دین و دنیا کا استحکام ہے۔ علم کی تباہی دین و دنیا کی تباہی ہے۔

حضرت حسن بصری کا فرمان ہے؛

عالم کی موت سے اسلام میں ایسا شگاف پڑ جاتا ہے کہ گردش لیل ونہار بھی اسے پر نہیں کر سکتی۔

حضرت ابن عباس کا ارشاد ہے؛

علماء حق وفات پاتے جائیں گے اور ان کے ساتھ ہی حق کے نشان مٹتے جائیں گے۔

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں؛

وبذهاب العلماء يذهب العلم (المدخل الكبير للبيهقي ص۔ ۳۴۶)

علماء کے چلے جانے سے علم بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

ان احادیث و روایات کے اجالوں میں جب ہم اپنے موجودہ زمانے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ہمارا علمی کارواں کس شان وشکوہ سے روانہ ہوا اور کس جاہ وجلال سے کائنات کا سفر کیا اور اب کن اندھیروں میں آ کر رک رہا ہے

جہد مسلسل: حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی نور اللہ مرقدہ نے دینی علوم وفنون کے فروغ کے لیے جو جدوجہد، غیر معمولی سعی اور قابل ذکر حوصلے سے کام لیا اس بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ نے اس راہ میں محنت کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے پوری زندگی اسی مقصد عظیم کے لیے نچھاور کر دی۔ تن تنہاء اداروں اور انجمنوں سے بھی زیادہ کام کیا۔ اور کتب خانوں سے بھی زیادہ علمی سرمایہ فراہم کیا۔

آپ نے درس وتدریس کے ذریعہ جو علمی کارنامے انجام دیئے وہ تاریخ علم کا زرین باب ہیں۔ وقار علم کی پاسداری کے لیے جامعہ نظامیہ لاہور/شیخوپورہ کی حسین و جمیل، بلند و بالا اور وسیع عمارت تعمیر کی اور اس میں درس وتدریس کا اعلیٰ نظم ونسق قائم فرمایا جو دیگر علمی درسگاہوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔

حضرت مفتی عبدالقیوم ہزاروی قدس سرہ العزیز اپنی پوری زندگی کے ساتھ عمل کے سانچے میں ڈھل گئے۔ اہل علم ودانش نے ان کے حسن عمل کی داد دی دنیا نے ان کی سربلندی اور عظمتوں کا لوہا مانا۔ گویا علوم دینیہ کی تمام برکات اور ان کی تمام تر رحمتیں ان پر نازل ہوئیں اور وہ جی بھر کر ان سے بہرہ اندوز ہوئے۔ ان کی داستان حیات آئندہ نسلوں کے لیے سراسر مشعل راہ ہے۔ حضرت محسن اہل سنت نے علم دین کو اپنی حیات کا جزو بنایا اور اپنے علم کے مطابق اپنے کردار کو بنایا اور یہ ثابت کر دیا کہ زمانے میں دین اور دینی علوم کی خدمت بندہ مومن کی میراث ہے۔ اس متاع بے بہا کی بدولت کون و مکان کی تمام تر بلندیاں اور لامکاں کی تمام رحمتیں اس بندہ مومن پر نچھاور ہو جاتی ہیں اس کا مقام مہ وکواکب کی انجمن سے بھی بلند ہوتا ہے۔ اس کا علمی وقار اپنوں ہی سے نہیں بیگانوں سے بھی خراج تحسین لیتا ہے۔ اس کے فقر میں شاہی جلال نمودار ہوتا ہے۔

بوئے گل کا باغ سے اور گل چین کا دنیا سے سفر اس عالمگیر قانون کا اثر ہے جس سے نہ کوئی بچا ہے نہ بچے گا۔ حضرت مفتی صاحب عمر بھر دینی خدمت کے عظیم الشان کارنامے انجام دے کر وہاں چلے گئے جہاں سب گئے اور سب کو جانا ہے۔ لیکن آپ کے علمی، دینی کارنامے باقی ہیں اور باقی رہیں گے۔

آتی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو   گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

افراد سازی: حضرت مفتی صاحب نے اپنی زندگی میں بے شمار دینی و علمی کارنامے انجام دیئے آپ کے ان کارناموں میں ممتاز کارنامہ افراد سازی کا ہے۔ آپ نے اپنی عظیم دینی درسگاہ میں باصلاحیت افراد پیدا کرنے اور انہیں آگے بڑھانے کے سلسلہ میں بڑی محنت فرمائی۔ آپ نے علماء تیار کیئے اپنے پیچھے دین کے متنوع شعبوں کے لیے کئی افراد تیار کر کے انہیں دین کی خدمت میں لگا کر اور آگے بڑھا کر چلے گئے۔ آپ کی قائم کردہ عظیم درسگاہ جامعہ نظامیہ رضویہ کا آسمان علم اس وقت جن درخشاں ستاروں سے جگمگا رہا ہے ان سب کی روشنی آپ ہی سے مستفاد ہے۔ اس وقت دنیا کے مختلف ممالک میں آپ کے فیض یافتہ تلامذہ مختلف نمایاں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے تربیت یافتہ افراد میں مدرس بھی ہیں اور مصنف بھی، عالمی سکالرز بھی اور عالمی سطح پر دین کا فریضہ انجام دینے والے مبلغ بھی، قابل قدر دینی ادرے قائم کرنے والے اور چلانے والے مہتمم بھی اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز محدث بھی ہیں اور الحمد للہ آپ کے تربیت یافتہ تلامذہ میں علم و عمل کی پختگی کے ساتھ ساتھ عقائد اہل سنت و جماعت کے تصلب کا جوہر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ علمی و عملی ماحول کا جس قدر اچھا اور صحت مند ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے کئی گنا بڑھ کر عقائد کا صحیح ہونا ضروری ہے۔ اگر علمی و عملی ماحول صحت مند و توانا ہے اور علمی و عملی پختگی درجہ رسوخ کو پہنچ چکی ہے مگر عقائد میں تصلب کے بجائے ڈھیلا پن ہے تو یہ علم و عمل نعمت نہیں بلکہ بہت بڑے وبال کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب اپنے تلامذہ کو عقائد اہل سنت اور افکار علمائے حق پر سختی سے کاربند رہنے کی شدت سے تاکید فرماتے تھے۔

جامعہ نظامیہ: اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر

ہیں دینی درسگاہیں مذہبی علوم کی اشاعت اور احیاء دین کے لیے ہمہ وقت کام کر رہی ہیں۔ درحقیقت یہی وہ دینی ادارے ہیں جن کی بدولت صدیوں سے اسلام اور اس کے بنیادی علوم زندہ و تابندہ ہیں۔ ان دینی درسگاہوں کا بنیادی مقصد مسلمانوں میں اسلام سے ذہنی و معاشرتی انحراف کی جو وباء عام ہوتی جارہی ہے۔ اس سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا اور انہیں اسلامی علوم و اخلاق اور معاشرے کا دلدادہ بنانا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے یہ ادارے مصروف عمل ہیں۔ اور پورا تعلیمی سال بغیر کسی ہڑتال، ہڑبونگ، احتجاج اور تخریبی کاروائیوں کے مکمل انہماک کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ پاکستان میں اسلام کی برتری اور مساجد و خانقاہوں کی تمام رونقیں اور مسلمانوں میں اسلامی اقدار سے انسیت و لگاؤ صرف اسی لیے نظر آتا ہے کہ دینی درسگاہیں اور ان سے متفق علماء کرام شب و روز اسلامی طرز حیات، علوم قرآن و حدیث اور مسائل فقہ کی ترویج و اشاعت کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ میدان خالی ہوتا تو مغربی تہذیب و تمدن کے شیدائی اور اسلام کو پرانا اور فرسودہ نظام کہنے والے یا سنت سے منہ موڑ کر قرآن کی آڑ میں بے دینی والحاد کو پروان چڑھانے کے خواب دیکھنے والے کب کے اسلام کا آفتاب گرد آلود کر چکے ہوتے اور وہ مذہبی تفوق اور اس سے عقیدت کی جو نمایاں علامتیں آج نظر آرہی ہیں ختم ہوگئی ہوتیں۔ پاکستان کے مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ بے راہ روی اور مذہبی بیزاری کی بے شمار اور منظم آندھیوں کے باوجود پاکستان میں اسلام غالب اور فاتح کی حیثیت سے زندہ ہے۔ بلاشبہ مذہبی درسگاہوں کی یہ عظیم و جلیل القدر خدمات ناقابل فراموش بھی ہیں اور باعث مسرت و اطمینان بھی۔ ان درسگاہوں میں سے کچھ درسگاہیں اتنے اعلیٰ پیمانے پر کام کر رہی ہیں جنکے متعلق وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی دینی و علمی سرگرمیوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی مساعی

سے علم دین کو غیر معمولی تقویت پہنچ رہی ہے۔ ان مثالی درسگاہوں میں حضرت مفتی اعظم پاکستان کی قائم کردہ معروف وممتاز دینی درسگاہ جامعہ نظامیہ رضویہ کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس درسگاہ نے دینی علوم کی نشر واشاعت اور مسلک اہل سنت کے تحفظ اور افکار رضا کی پاسبانی، اسلامی اقدار کی حفاظت کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ کا ایسا روشن باب ہے جو آئندہ نسلوں کے لیے باعث افتخار اور علم وعمل کی دنیا میں مینارہ نور ہے۔ جامعہ نظامیہ اسلام کا محفوظ قلعہ اور اہل سنت و جماعت کا ناقابل شکست حصار اور حضرت مفتی اعظم کا زندہ و جاوید کارنامہ اور صدقہ جاریہ ہے۔ جو انشاء اللہ تعالیٰ رہتی دنیا تک قائم رہے گا اور اسلام کی آبیاری ہوتی رہے گی۔ علم کی جو شمع آپ نے روشن کی ہے اس کی ضیاء دنیا کو منور کرتی رہے گی۔ جس طرح کسی ثمر بار درخت کا انحصار اس کی جڑ کی مضبوطی واستواری پر ہوتا ہے اور وہ اپنے ثمر سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی دینی ادارہ، انجمن اپنے بانی ومنتظم کے اخلاص وتقویٰ کے بقدر پھلتا پھولتا اور ارتقاء کی منازل طے کرتا اور مستحکم وقائم رہتا ہے اور اس کی کارکردگی کمال اور خوبی کا اندازہ اس کے تربیت یافتہ افراد سے ہوتا ہے۔ جامعہ نظامیہ رضویہ کے بانی حضرت مخدوم اہلسنت مفتی اعظم پاکستان رحمۃ اللہ علیہ علم وتقویٰ، زہد وقناعت ،خلوص وللہیت، علم وحکمت، محبت وشفقت، دانش وفراست کا پیکر اعظم اور دنیاوی جاہ ومنصب، مال ودولت، عزت وشہرت، نام ونمود، ذاتی آرام وآرائش سے کنارہ کش اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے جذبہ میں مگن۔ ان صلوٰۃ ونسکی و محیای ومماتی للہ رب العالمین۔ کی مجسم تصویر تھے اور بحمد اللہ اس عظیم دانش کدہ سے تربیت یافتہ علماء دین کی محبت وحفاظت کے نشے سے سرشار، دفاع حق میں تیغ آبدار، علمائے حق کے نظریات وافکار کے پاسدار، حب نبوی سے سرشار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور حضرت مفتی اعظم پاکستان کے اخلاص وتقویٰ نے اسی شجر طیبہ (جامعہ نظامیہ)

کو اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء توتی اکلہا کل حین باذن ربہا کا مصداق بنا دیا۔ اور آپ کی شبانہ روز محنت نے اسے اوج ثریا تک پہنچا دیا۔

تدریس: علوم دینیہ کی تدریس حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمۃ اللہ کی زندگی کا اہم مشغلہ تھا۔ اور آپ کو تدریس کے ساتھ عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ کسی حال میں بھی تدریسی سلسلے میں انقطاع برداشت نہ فرماتے۔ تدریسی سال کے آغاز سے اختتام سال تک تدریس کا ایک ہی انداز اور مکمل جوش وخروش رہتا۔ اسباق کا حتی المقدور ناغہ نہ فرماتے۔ اگر کسی ضروری کام کی وجہ سے بیرون لاہور کا سفر کرنا پڑتا تو پورے اسباق پڑھانے کے بعد سفر اختیار فرماتے۔ اور دوسرے روز اسباق کی تدریس کے وقت واپس جامعہ تشریف لا کر اسباق پڑھاتے۔ راقم کو یاد ہے کہ جس سال راقم جامعہ نظامیہ رضویہ میں دورہ حدیث کی سعادت حاصل کر رہا تھا حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو کسی ضروری کام کے سلسلہ میں ملتان اور اسلام آباد جانا پڑا تو آپ نے اپنے تمام اسباق پڑھا کر سفر اختیار کیا اور دوسرے روز صبح اسباق کے وقت واپس پہنچ کر سارے اسباق پڑھائے۔ سفر کی صورت میں آپ کا اکثر یہی معمول ہوتا تھا۔ شب بیداری اور سفر کی مشقت کا احساس تک نہ ہوتا۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ جس سال ہماری کلاس جامعہ نظامیہ رضویہ میں دورہ حدیث کی سعادت حاصل کر رہی تھی پورے تدریسی سال کے عرصہ میں حضرت مفتی صاحب نے سوائے جمعۃ المبارک کے اسباق کی تدریس کا کوئی ناغہ نہیں فرمایا۔ البتہ ایک دن شدید بخار کی وجہ سے اپنے رہائش گاہ سے جامعہ میں تشریف نہ لا سکے۔

چراغ وہی چشمۂ نور کہلائے گا جو اپنی لو سے چھوٹے بڑے سینکڑوں چراغ روشن کر دے۔ جو ایسا نہ کر سکے وہ خواہ کتنی ہی روشنی کا حامل کیوں نہ ہو اسکی ضیاء گستری

بس اسکے دم تک رہیگی۔اور یہ حقیقت ہے کہ جس عالم یا صاحب فن نے اپنے علم یا فن کو منتقل نہ کیا وقت کا عفریت اسے نگل گیا۔حضرت مفتی اعظم پاکستان اس نقطہ سے خوب آشنا تھے۔اسلئے آپ نے درس وتدریس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تاکہ تلامذہ کے ذریعے شمع علم کی روشنی دور دور تک تادیرامت میں باقی رہے۔اپنی عمر عزیز کے انچاس سال شمع علم فروزاں رکھنے میں گزار دیئے۔آپ کی اکہتر سالہ زندگی میں بچپن کے ابتدائی دس سال چھوڑ کر بقیہ تمام زندگی درس وتدریس میں گزری۔بارہ سال حصول علم میں گزارے اور انچاس سال مسند تدریس کو زینت بخشی۔یوں ابتدائے شباب سے آخر حیات تک تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔وصال کے روز بھی اپنے معمول کے مطابق سارے اسباق پڑھائے۔حضرت استاذ الاساتذہ رئیس المحدثین مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمہ اللہ فیضان علم کی تقسیم میں علمائے سلف کے صحیح مظہر تھے۔آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے والے طلباء علم وفضل کی دولت سے مالا مال ہوتے، عشق رسول ﷺ سے معمور اور جذبہ خدمت دین وملت سے سرشار ہوتے۔آپ نے ملک پاکستان کی سرزمین پر علوم دینیہ واحکام شرعیہ کے بلند وبالا مینار نصب فرمائے۔ آپ جملہ علوم وفنون کی تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔کسی بھی فن کا درس ہوتا طلباء کے قلوب واذہان میں عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شمع فروزاں کرتے چلے جاتے۔آپ کو فرق مستحدثہ باطلہ کے ابطال میں کمال مہارت تھی۔دوران تدریس فرق ہائے ضالہ باطلہ کے دلائل پیش کر کے پھران کا بلیغ علمی وتحقیقی رد فرماتے۔

درس نظامی کے وہ اسباق جو بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی تدریس عام طور پر خود فرماتے۔مثلاً تلخیص المفتاح، رسائل منطق، ہدایت الحکمۃ، نحومیر، کافیہ وغیرہ اسباق بطور خاص خود پڑھاتے۔آپ طلباء کو نہایت محنت کرواتے۔ ہر طالبعلم سے

باری باری عبارت پڑھاتے۔ سبق یاد نہ رکھنے اور عبارت کی تیاری نہ کر کے آنے والے طالبعلم کی خوب سرزنش فرماتے۔ کم استعداد اور کند ذہن طالبعلم بھی اگر کچھ عرصہ آپ کی سختی برداشت کر لیتا تو اللہ کے فضل و کرم سے وہ ذی استعداد بن جاتا تھا۔

آپ طلباء کو تکرار اسباق اور مطالعہ کتب کی تاکید فرماتے اوقات مطالعہ میں طلباء کی خود نگرانی فرماتے۔ اگر کسی طالبعلم کو اوقات مطالعہ میں غیر حاضر پاتے تو سخت سرزنش ہوتی۔ جامعہ نظامیہ رضویہ میں نیا نیا داخل ہونے والا طالبعلم ان سخت پابندیوں سے ابتداً گھبرا جاتا تھا لیکن اگر کچھ عرصہ ان سخت پابندیوں کو برداشت کر لیتا تو پھر ان سے مانوس ہو جاتا اور اس میں محنت و لگن کا جذبہ اور مطالعہ کا ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ کی ذات میں رفعت علم اور ایصال معنی کی قوت رکھی تھی اور عمل و فکر کی رہنمائی کرنے والا انداز بیان بھی اور ہر طالبعلم کے ذوق اور سطح فہم کا شعور بھی بخشا تھا۔ افہام و تفہیم کا انداز اتنا دلنشیں ہوتا کہ کم سے کم استعداد رکھنے والا طالبعلم بھی مطلب بخوبی سمجھ لیتا۔

گفتگو بے تکان انداز والہانہ ہوتا۔ کئی کئی گھنٹے مسلسل درس ہوتا مگر نہ تھکن کا احساس ہوتا نہ اکتاہٹ کا نام و نشان ہوتا بلکہ سراپا محویت کا عالم ہوتا۔

درس حدیث: دورہ حدیث کی کلاس کو صحیح بخاری شریف اور جامع ترمذی شریف خود پڑھایا کرتے تھے۔ دوران سال دونوں کتابیں اول تا آخر مکمل پڑھاتے تھے۔ بخاری شریف کا درس صبح کے وقت ہوتا تھا اور ترمذی شریف ظہر کے بعد پڑھاتے تھے۔ درس حدیث میں آپ حل مفہوم حدیث، مسائل خلافیہ میں آئمہ مجتہدین کے اقوال و مذاہب دلائل احناف، فریق مخالف کے جوابات، مذہب حنفی کی وجوہ ترجیح، مسلک اہل سنت کے

دلائل، فرق باطلہ کی تردید اور اسی قسم کی دیگر مباحث نہایت عام فہم انداز سے بیان فرماتے۔
جس مقام پر توضیح وتشریح کی ضرورت ہوتی وہاں ہر صورت میں تفصیلاً بیان فرماتے۔

آئمہ کا اختلاف بیان کرتے ہوئے ہر مجتہد کا نام بڑی عقیدت اور نہایت احترام سے لیتے۔ درس حدیث کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ عقیدت ومحبت کا پتہ چلتا اور چہرہ مبارک سے نور کی شعاعیں بلند ہوتی تھیں۔ محویت و انہماک اور احترام وعقیدت کا یہ عالم کہ آنے جانے والے کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ ہم جلیس سے بھی بے نیاز رہتے۔ ہر سوال کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دیتے۔ یہ انداز آپ کے باطنی وقار اور علمی جلال کی غمازی کرتا تھا۔ واقعی یہ مسند تدریس بڑی شان وعظمت والی اور بہت کیف بار ہوا کرتی تھی۔ تدریس کے ساتھ یہ والہانہ عقیدت وتعلق صرف اپنی ذات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ جامعہ کے ہر فارغ ہونے والے طالبعلم کو تدریس کی نصیحت فرماتے۔ جامعہ سے فارغ کسی فاضل کے بارے میں آپ کو علم ہوتا کہ وہ تدریس کا فریضہ انجام دے رہا ہے تو بڑی مسرت کا اظہار فرماتے۔

اوقات کی پابندی: حضرت استاذ العلماء رئیس المتکلمین مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمہ اللہ اوقات کی شدت سے پابندی فرماتے۔ کوئی لمحہ بے کار گزارنے کے قائل نہ تھے۔ آپ کے انضباط اوقات کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک مشین ہے جو ہر وقت چل رہی ہے۔ کسی لمحہ بیکار نہ رہتے۔ دیکھنے والے دیکھتے کہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ یا طلباء کو پڑھانے میں مصروف ہیں یا قلم وقرطاس تھامے ہوئے کچھ تحریر فرما رہے ہیں۔ یا مطالعہ میں مشغول ہیں یا جامعہ کے تعمیری کام کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یا تنظیم المدارس کے کسی مسئلہ میں الجھے

ہوئے ہیں۔ حضر ہو یا سفر، عسر یا یسر، خوشی ہو یا غمی، سردی ہو یا گرمی، صحت ہو یا مرض کسی بھی حال میں آپ کے انضباط اوقات اور پابندی معمولات میں تغیر نہ ہوتا تھا۔ آپ کے علمی و دینی کارنامے اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ آپ نے واقعی زندگی کے ایک ایک لمحہ کی قدر کی اور اوقات کو معمولات کی غیر معمولی پابندی سے گزارا۔

اسی کشمکش میں گزری میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

آپ اپنے تلامذہ میں بھی وقت کی قدر و قیمت کا جذبہ اور احساس پیدا فرماتے اور وقت کو رائیگاں اور بے مقصد مشاغل میں صرف کرنے کی شدت سے ممانعت فرماتے۔ زندگی کے قیمتی لمحات کی قدر دانی اور ہر لمحہ و ہر ساعت علمی و عملی، دینی مشاغل میں صرف کرنے اور دین متین و مسلک حق کی خدمت، تعلیم و تحقیق، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، افراد کی تربیت اور معاشرے کی تہذیب و اصلاح میں صرف کرنے اور تضیع اوقات سے بچنے کی تاکید فرماتے۔

تصانیف: حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گوناں گوں مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ آپ کی محققانہ تصانیف میں التوسل، العقائد والمسائل، علمی مقالات، تاریخ نجد و حجاز وغیرہ کئی کتب و رسائل زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے کئی علمی و وقیع مضامین مختلف موضوعات پر ملک کے معروف و مؤثر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

علمائے اہل سنت کے ساتھ سلوک

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکابر علمائے اہل سنت کا بے حد ادب و احترام کرتے۔ جامعہ نظامیہ میں جب بھی اکابر میں سے کوئی شخصیت تشریف لاتی تو

آپ ان کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آتے۔ اور اپنے ہم عمر علماء کے ساتھ بھی نہایت محبت و پیار، اخلاق و خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ تشریف لانے والے مہمان عالم دین کو جامعہ نظامیہ رضویہ کے تمام شعبوں کا تعارف کرواتے اور کام کی نوعیت سے آگاہ فرماتے۔ اور اپنے اپنے اداروں میں محنت و جانفشانی سے کام کرنے کی ترغیب دیتے۔ دینی و علمی امور میں محنت کرنے والے علمائے کرام کے کام کو بے حد سراہتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ علمائے اہل سنت میں سے کسی عالم دین کے ساتھ اگر کسی تنظیمی معاملے یا کسی فقہی مسئلہ میں کوئی اختلاف ہوتا تو آپ کبھی طلبہ کے سامنے اس اختلاف کا تذکرہ نہ فرماتے۔ کبھی بھی کسی بھی سنی عالم دین کا تذکرہ سوائے کلمات خیر کے نہ فرماتے۔ عالم اسلام میں کہیں بھی اہل سنت و جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی عالم دین کا وصال ہوتا حضرت مفتی صاحب جامعہ میں ایصال ثواب کی محفل منعقد فرماتے اور تعزیتی اجلاس ہوتا جس میں خود حضرت مفتی صاحب اور جامعہ کے اساتذہ کرام اس عالم دین کی دینی و علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے اور طلباء کو اس شخصیت کے کارناموں سے متعارف کرواتے۔

حضرت مفتی صاحب ملک بھر میں اہلسنت کے کسی دینی ادارے میں تشریف لے جاتے تو اس ادارہ کے انتظامی و تدریسی امور کے بارے میں ضرور رہنمائی فرماتے۔ آپ ان نفوس قدسیہ میں سے ایک تھے جن کے دم سے رونقیں چلتی تھیں۔

ان کا سایہ ایک تجلی ان کا نقش پا چراغ

وہ جدھر گزرے ادھر ہی روشنی ہوتی گئی

وہاں وہاں ابھی بھی رقصاں ہیں بوئے گل و عنبر

جہاں جہاں چمن سے بہار گزری

فتاویٰ رضویہ کی جدید تدوین

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ العزیز کی بیشمار دینی و ملی خدمات ہیں ان میں سے ایک نہایت اہم خدمت جس کے لیے برصغیر کے مسلمان یقیناً ان کے مرھون احسان ہیں وہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمہ اللہ تعالیٰ کا عظیم فقہی ذخیرہ فتاویٰ رضویہ کی جدید تدوین و ترتیب، عبارات و نصوص کی تخریج و ترجمہ اور کتابت و طباعت کے نئے پیراہن میں منظر عام پر لانا ہے۔

حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمۃ اللہ علیہ کے علمی، دینی، ملی کارہائے نمایاں کو اگر الگ الگ تفصیلی طور پر ضبط تحریر میں لایا جائے تو ہزاروں صفحات منقوش ہوں گے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کا احاطہ ناممکن ہے۔ آخر میں آپ کے چند نمایاں کارناموں کا اجمالی تذکرہ پیش ہے۔

تنظیم المدارس پاکستان کا قیام

اس تنظیم کو قائم فرمانے اور اس کی بقاء کے لیے آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس تنظیم کے ذریعے اہل سنت و جماعت کے تمام دینی مدارس کو مربوط فرمایا آپ اس کے پہلے ناظم اعلیٰ تھے۔ اس عہدے پر آپ ایک عرصہ تک فائز رہے۔ اور گزشتہ دو سال سے آپ اس کے مرکزی صدر تھے۔

تنظیم المدارس کی سند کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے ایم اے تسلیم کروانے میں آپ کا کلیدی کردار رہا۔

جماعت اہل سنت اور جمعیت علماء پاکستان میں ہمیشہ آپ کا کردار نمایاں رہا۔

تحریک نظام مصطفیٰ اور تحریک ختم نبوت (۱۹۷۴ء) میں آپ کی بے پناہ قربانیاں شامل ہیں۔

مرکزی مجلس رضا، رضا اکیڈمی، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کے قیام اور ان کی

سرگرمیوں کو پروان چڑھانے میں آپ پیش پیش رہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا اور دیگر اکابر علمائے اہل سنت کی تصانیف کو منظر عام پر لانے کے لیے آپ نے ایک اشاعتی ادارہ "رضا فاؤنڈیشن" قائم فرمایا۔

جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کی تین منزلہ عمارت تعمیر فرمائی۔

جامعہ نظامیہ رضویہ میں روز بروز تشنگان علوم کا اضافہ ایک وسیع عمارت کا متقاضی تھا جس کیوجہ سے آپ نے شیخوپورہ کے مقام پر ایک قطعہ زمین حاصل کیا۔ اور اس میں ایک وسیع و بلند و بالا اور حسین و جمیل عمارت تعمیر کی۔

فتاویٰ رضویہ کی جدید تدوین و اشاعت آپ کے زریں کارناموں میں سے ہے۔

اعلیٰ حضرت کی گراں مایہ تصانیف الدولۃ المکیۃ، کفل الفقیہ، الاجازات المتینہ، ہادی الاضحیۃ، الصافیۃ الموحیہ اور حسام الحرمین وغیرہ کو جدید تزئین کے ساتھ اشاعت اہل سنت پر آپ کا عظیم احسان ہے۔

عوام وخواص میں آپ کی محبوبیت

چشم فلک نے لاہور کے عتیق سٹیڈیم میں مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ کی نماز جنازہ کے موقع پر عوام وخواص، علماء وحفاظ اور مقتدر شخصیات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن دیکھا۔ جو آپ کی مقبولیت و محبوبیت کا اظہار تھا۔ ہر شخص علم و عمل کے اس نیر تاباں کے آخری دیدار کے لیے بے تاب تھا۔ وفات سے تدفین تک آپ کا چہرہ مبارک کھلے ہوئے گلاب کی لطافتوں کا مظہر تھا۔

زندہ ہوجاتے ہیں جو مرجاتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کردیا

شرف ملت استاذ العلماء حضرت مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ

شرف ملت، محسن اہل سنت، استاذ العلماء حضرت علامہ شیخ الحدیث مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ دنیائے اسلام کی ان قابل فخر اور یگانہ روز ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ حضرت شرف ملت کا اپنی دینی، علمی خدمات کی بدولت تاریخ میں حیات جاوداں رکھنے والے فرزندان اسلام میں شمار ہوتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دین کی خدمت کے لیے پیدا فرمایا تھا اس لیے اس کے اسباب و شرائط ایسے جمع فرما دیئے تھے جو کم کسی کو نصیب ہوتے ہیں۔ حضرت استاذ العلماء علوم معارف کی غیر معمولی اور بلند پایہ شخصیت اور پاکیزہ سیرت کا پیکر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذہانت و فطانت اور ذہنی و دماغی کمالات اور ہر فن کی مکمل قابلیت سے نوازا تھا۔ آپ کو معقولات و منقولات پر مکمل عبور حاصل تھا۔ حضرت شرف اہل سنت شریعت کے عالم باعمل اور راہ طریقت کے سالک، سلوک و تصوف کے رمز آشنا اور صاحب حال شخصیت تھے۔ طبع کی سلامتی ذوق کی نفاست اور قلب کے اخلاص میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ حصول علم سے فراغت کے بعد درس نظامی کے علوم وفنون کی تدریس کا کام انجام دینے لگے۔

ملک عزیز کی کئی معروف دینی درسگاہوں میں آپ نے تدریس فرمائی ہے۔ تاہم اپنی حیات مبارکہ کا اکثر حصہ اہل سنت کی ممتاز دینی درسگاہ جامعہ نظامیہ لاہور میں علوم دینیہ کی تدریسی خدمت میں بسر فرمایا۔ آپ کی قابلیت اور پرتاثیر تدریس کا

شہرہ جب عام ہونے لگا تو ملک کے اطراف واکناف سے تشنگان علوم آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی علمی پیاس بجھانے لگے۔ کسی بھی فن کا درس ہوتا تو حضرت طلباء کے قلوب واذہان میں عشق مصطفی ﷺ کی شمع فروزاں کرتے جاتے تھے۔ آپ کو تدریس سے بڑا شغف تھا۔ آپ کے دریائے علم سے بے شمار لوگ سیراب ہوئے۔ آپکی تدریس کا انداز اتنا دلنشیں ہوتا تھا کہ بات ذہن میں اترتی چلی جاتی تھی جو طالبعلم آپ سے دو چار سبق پڑھنے کی سعادت کر لیتا پھر دوسرے کسی معلم سے اس کی تشفی نہ ہوتی۔ آپ مشکل سے مشکل مسئلہ بڑے احسن اور سہل طریقے کے ساتھ چٹکیوں سے حل فرمادیتے۔ آپ کے ہاں ہر تدریسی سال درس نظامی کے اونچے درجے کے اسباق کی تدریس ہوتی۔ دوران تدریس بڑے بڑے علمی دقائق بیان فرماتے مگر کبھی بھی اپنی طرف منسوب کر کے دعویٰ کے رنگ میں پیش نہ فرماتے کہ اس میں میری رائے اور تحقیق یہ ہے۔ حضرت کی علمی خدمت اور کمال کسر نفسی وتواضع کا یہ وہ مقام بلند ہے کہ جس تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہوتی

اللہ تعالیٰ نے شرف اہلسنت کو محنت و کاوش، حب علم اور اس کے افادے کا ذوق وشوق اور لوگوں کو اس سے بہرہ ور کرنیکا جو ملکہ عطا فرمایا تھا وہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ آپ کو سوتے جاگتے ہر وقت یہ تصور رہتا تھا کہ دنیا آرام کرنیکی جگہ ہے نہ پیر پھیلانے کی۔ ہر وقت کسی نہ کسی صورت میں دینی خدمت میں مشغول رہتے۔ تھے۔ کبھی تدریس، کبھی تصنیف و تالیف، کبھی تحقیق و تدقیق، کبھی وعظ ونصیحت میں مصروف رہتے۔ غم آخرت اور فکر مسلک آپ کے قلب پر تسلط رہتا۔

آپ سے استفادہ کرنے والے اہل علم کا حلقہ بڑا وسیع ہے آپکی تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہے کہ آپ کے بے شمار تلامذہ ملک اور بیرون ملک دینی وملی خدمات انجام

دے رہے ہیں۔

حضرت استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ کو عربی اور فارسی لغت پر مکمل عبور تھا۔ جہاد افغانستان کے دور میں افغانستان سے ہجرت کر کے آنے والے دینی مدارس کے طلباء کو پشتو اور فارسی کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی تھی آپ ایسے طلباء کو فارسی زبان میں پڑھاتے تھے آپ فارسی زبان میں تکلم فرماتے تو یوں محسوس ہوتا کہ شاید فارسی آپ کی مادری زبان ہے قاضی حمد اللہ، شمس بازغہ، مطول جیسی درس نظامی کی ادق کتب بڑی فصاحت وبلاغت کے ساتھ فارسی زبان میں پڑھاتے تھے۔

عربی زبان بھی آپ بڑی روانی کے ساتھ بولتے تھے۔ اور عربی میں آپ نے کئی کتب تصنیف فرمائی ہیں جن میں الحیاۃ الخالدۃ، المعجزۃ والکرامۃ، الوسیلۃ اور من عقائد اہل السنۃ وغیرہ اور کئی عربی مقالات شامل ہیں۔

حضرت متعدد کتب کے مؤلف، مصنف، مرتب اور مدون اور مترجم اور محشی ہیں۔ یہ تمام کتب برصغیر پاک وہند میں قبول عام حاصل کر چکی ہیں اور بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔

حضرت استاذ العلماء نے کتب کی تصنیف وتالیف کے علاوہ دینی کتب کی اشاعت وطباعت کیلئے مکتبہ قادریہ کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم فرمایا جہاں سے بہت ساری علمی، تحقیقی، کتب شائع ہوئیں اور بے شمار اہل قلم کو حضرت نے تصنیف و تالیف اور دینی کتب کی اشاعت کی طرف متوجہ فرمایا۔ آج ہمیں علماء اہل سنت کی ہر دینی موضوع پر علمی تصانیف میسر ہیں اور تقریباً ہر شہر وقصبہ میں اہلسنت کے کتب خانے قائم ہیں۔ اس سارے سلسلے کے پیچھے محسن اہل سنت مفتی اعظم پاکستان حضرت علامہ مولانا مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شرف ملت استاذ العلماء

مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ کی کاوشیں کارفرما ہیں۔ یہ دونوں بزرگ علماء اہل سنت اور اہل قلم حضرات کو ہمیشہ اس کام کی ترغیب فرماتے رہتے تھے۔

حضرت استاذ العلماء شرف ملت قدس سرہ العزیز کے مطالعہ اور تحقیق کا خاص موضوع امام احمد رضا ہیں۔ آپ کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ سے گہری عقیدت تھی بلکہ یہ عقیدت بڑھ کر عشق کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ خود امام احمد رضا پر بہت کچھ لکھا اور مختلف زاویوں سے لکھا بلکہ اپنے احباب اور معاصرین سے بھی کئی اہم اور مفید کتابیں تالیف کروائیں۔ حضرت نے اس طرح مطالعات امام احمد رضا اور رضویات کو نئی جہتیں عطا کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں امام احمد رضا کے دینی کارناموں اور مذہبی افکار سے لوگوں کو متعارف کروانے اور عوام و خواص کے قلوب میں ان کی عظمت مستحکم کرنے میں حضرت استاذ العلماء نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

حضرت شرف ملت رحمۃ اللہ علیہ نے کئی دینی موضوعات پر مفید کتب تصنیف فرمائی ہیں۔ آپ کی تصانیف دلائل واضحہ کا گنجینہ اور خوبصورت اسلوب نگارش پر مشتمل ہوتیں۔ جس موضوع پر بھی لکھتے اس کے تمام اطراف کا احاطہ فرماتے اور آپ کی تحریر زیر بحث موضوع کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتی اور اس میں کسی لحاظ سے کوئی نقص و عیب نہ ہوتا۔ آپ کا انداز استدلال اس قدر محیر العقول ہوتا کہ بڑے بڑے اصحاب عقل و خرد اور اہل علم و قلم مبہوت رہ جاتے آپ کو اپنی ان لافانی علمی و تحقیقی تصانیف کے سبب علماء اہل سنت اور مشاہیر اسلام کی تاریخ میں خصوصی طور پر شہرت و بقائے دوام کی سعادت حاصل رہے گی اور جن کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ:

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اہل سنت کے اس عظیم پیشوا اور بطل جلیل اور بیشمار کتب درسیہ کے مؤلف کے حالات زندگی کو محفوظ رکھنے اور عام لوگوں تک پہنچانے کی اشد ضرورت ہے۔

حضرت استاذ العلماء قدس سرہ العزیز کو اپنے اساتذہ کرام سے بڑی عقیدت تھی بالخصوص ملک المدرسین استاذ العلماء رئیس المناطقہ حضرت عطاء محمد بندیالوی رحمۃ اللہ علیہ سے حد درجہ عقیدت تھی۔ اور حضرت استاذ العلماء بندیالوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس قابل فخر شاگرد اور تلمیذ رشید کے ساتھ بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے اور ان کے علمی ودینی کارناموں کو بہت سراہتے اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

ایک سال ہماری کلاس حضرت شرف ملت رحمۃ اللہ علیہ سے علم ہیئت کی معروف کتاب ''تصریح'' پڑھنے کی سعادت حاصل کر رہی تھی۔ 'تصریح' سمجھانے کے لیے 'کرہ' کی ضرورت ہوتی ہے کرہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے حضرت ہمیں ''گلوب'' کے ذریعے سمجھانے کی کوشش فرماتے تھے دوران سال ایک مرتبہ حضرت استاذ العلماء بندیالوی رحمۃ اللہ علیہ جامعہ نظامیہ لاہور تشریف لائے۔ تو ان سے اس بارے میں تذکرہ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت رئیس المفسرین مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے میں چند کرے بنوائے تھے لیکن اب وہ ناپید ہو چکے ہیں اور حضرت شرف ملت سے مخاطب ہو کر فرمایا کہا گر آپ کُرے بنوالیں تو اچھا ہوتا اور کسی سے اس بارے میں بات کر کے دیکھیں چنانچہ حضرت شرف صاحب نے آپکی ہدایت کے مطابق رضا اکیڈمی کے ناظم جناب حاجی مقبول صاحب کے ذریعے چند کُرے بنوائے اور دوسری مرتبہ جب حضرت استاذ العلماء جامعہ نظامیہ تشریف لائے تو انہیں وہ کُرے دکھائے گئے تو استاذ العلماء نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ اس محفل میں محسن اہل سنت حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی

صاحب رئیس المدرسین حضرت مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ جامعہ نظامیہ کے دیگر اساتذہ کرام بھی موجود تھے۔ حضرت استاذ العلماء بندیالوی نے حضرت شرف ملت کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے فرمایا شرف قادری صاحب کا یہ کام تاریخی کارناموں میں شمار ہوگا کہ حضرت مراد آبادی کے بعد انہوں نے اس علم کی تدریس کے لیے یہ کام انجام دیا۔ جو اس علم کی مفید خدمت ہے اور اس کو زندہ رکھنے کی اہم کاوش ہے۔

حضرت شرف ملت کے دینی و علمی فیوض و برکات اور مسلکی خدمات و کارنامے اس قدر مختلف الانواع ہیں جن کا احاطہ ایک مختصر مضمون میں مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

حضرت شرف ملت استاذ العلماء کو اللہ تعالیٰ نے کئی خصوصیات سے نوازا تھا ان میں سے ایک ممتاز خصوصیت عشق رسول ﷺ ہے آپ کو حضور علیہ السلام کی ذات اقدس سے گہری عقیدت و محبت اور نہایت عشق تھا۔ محفل میں جب بھی نعت پڑھی جاتی تو آپکی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی درس حدیث کے دوران اکثر روتے رہتے حرمین طیبین کا جب بھی تذکرہ ہوتا بیتاب و بیقرار ہو جاتے۔

جس سال آپکو پہلے حج کی سعادت حاصل ہوئی تو حرمین طیبین کی سرزمین پر پاؤں رکھنے سے پہلے جوتا اتار پھینک دیا اور پورا سفر ننگے پاؤں کیا۔ جب واپس تشریف لائے تو آپ کے دونوں پاؤں زخموں سے چور تھے اور تلوؤں میں سوراخ ہو چکے تھے۔

خدا رحمت کند ایں پاک طینت را

فقیہ عصر استاذ العلماء حضرت مولانا محبوب الٰہی رحمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

فقیہ عصر استاذ العلماء مفتی اعظم سرحد مولانا مفتی محبوب الٰہی رحمانی رحمہ اللہ کا تعلق صوبہ سرحد کے مردخیز خطہ ہزارہ کے ایک گاؤں ''لنگاں'' کے ایک مذہبی علمی خاندان سے تھا۔ آپ کے والد مرحوم اور بڑے بھائی قاضی احسان الٰہی اور اپ کے نانا اور اپنے دور کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ آپ کے سارے خاندان کا روحانی تعلق حضرت غوث الزماں خواجہ عبدالرحمٰن چھوہروی رحمہ اللہ سے تھا۔ حضرت استاذ العلماء نے اپنی تعلیم کا آغاز اپنے گاؤں میں ہی اپنے نانا اور بڑے بھائی قاضی احسان الٰہی مرحوم سے کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ آپ ''گن چھتر شریف'' مظفر آباد میں بھی زیر تعلیم رہے۔ گن چھتر شریف حضرت خواجہ خواجگاں غوث الزماں خواجہ عبدالرحمان چھوہروی رحمہ اللہ کا مرشد خانہ ہے۔ جہاں اس زمانے میں درس نظامی کا مدرسہ قائم تھا۔ حضرت استاذ العلماء کے برادر اکبر حضرت قاضی احسان الٰہی رحمۃ اللہ علیہ بھی کچھ عرصہ یہاں تدریس فرماتے رہے۔ اسی عرصہ میں حضرت مولانا مفتی محبوب الٰہی رحمانی بھی اسی مدرسہ میں زیر تعلیم رہے۔ اور اس کے بعد برصغیر پاک و ہند کے مختلف دینی مدارس میں علوم وفنون حاصل کیے اور درس نظامی کی تکمیل کے بعد کچھ عرصہ حضرت استاذ العلماء علامہ مولانا عبدالغفور ہزاروی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہو کر دورہ تفسیر اور فن مناظرہ وغیرہ پڑھنے کا شرف حاصل کیا اور اسی عرصہ میں حضرت علامہ ہزاروی صاحب کے حکم پر مانسہرہ کے ایک گاؤں، گاندھیاں کی مسجد میں امامت کی پیشکش قبول فرماتے ہوئے وہاں تشریف لائے۔ اس زمانے میں دینی مدارس مساجد میں ہی قائم ہوتے تھے۔ آپ چونکہ دینی علوم وفنون کے بلند پایہ مدرس تھے آپ نے اسی گاؤں کی مسجد شریف میں درس نظامی کی تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا

ہر طرف سے طلبہ کشاں کشاں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی علمی تشنگی بجھاتے رہے۔ کافی عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

اسی عرصہ میں حضرت صاحبزادہ محمد طیب الرحمٰن چھوہروی بھی شرف تلمذ حاصل کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور موقوف علیہ کے درجہ تک آپ سے اکتساب علم کیا اور اس کے بعد حزب الاحناف لاہور سے دورہ حدیث کا شرف اور سند فراغت حاصل فرمائی۔ اور واپس آ کر اپنے استاذ محترم حضرت علامہ مفتی محبوب الٰہی صاحب قدس سرہ العزیز کی خدمت میں حضرت غوث الزماں خواجہ عبدالرحمٰن چھوہروی رحمہ اللہ کے قائم کردہ دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ ہری پور میں تدریس کی پیش کش کی۔ حضرت استاذ العلماء حضرت خواجہ عبدالرحمٰن چھوہروی سے عقیدت اور حضرت صاحبزادہ صاحب کی دلجوئی کی خاطر اس پیشکش قبول فرماتے ہوئے دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ ہری پور تشریف لائے۔ یہاں پر آپ کئی سال صدر المدرسین اور مفتی کے منصب پر فائز رہے۔ دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ میں بے شمار طلبہ نے آپ سے اکتساب علم کیا۔ آپ کا انداز تدریس نہایت سہل اور بلیغ ہوتا تھا ایسا انداز بہت کم مدرسین میں دیکھا گیا ہے۔

آپ کے سامنے عبارت پڑھنے والے طالبعلم کو خوب تیاری کرنی پڑتی تھی۔ آپ کے سامنے عبارت پڑھنے کی جرات کرنے والے طالبعلم کی عبارت بہت تھوڑے عرصہ میں درست ہو جاتی۔ صرفی ونحوی قواعد ازبر ہو جاتے اور مطالعہ کا شوق اور بڑھ جاتا۔ آپ کا انداز تدریس نہایت فصیح و بلیغ، علمی وفنی نکات پر مشتمل ہوتا آپ کی تدریسی تقریر اتنی سہل ہوتی کہ کند ذہن طالب علم کے ذہن میں بھی اسباق کا مفہوم پوری طرح راسخ ہو جاتا تھا۔

حضرت استاذ العلماء رحمہ اللہ درس نظامی کے علوم وفنون کے بلند پایہ مدرس تھے۔صرف ونحو،عربی ادب اور فقہ واصول فقہ وغیرہ فنون میں خصوصیت کے ساتھ ید طولیٰ حاصل تھا۔ان فنون کی تدریس کے دوران طلبہ کی آسانی کے لیے تقریرات لکھواتے تھے ہر ایک کتاب پر رقم کی جانے والی تقریرات اس فن کی بہترین وضخیم شرح بن جاتی تھیں۔

آپ اپنے دور کے بے نظیر مفتی تھے۔اطراف واکناف سے استفتاء آپ کے پاس آتے۔آپ ان پر مفصل و مدلل علمی فتاویٰ صادر فرماتے۔آپ کی تحریر نہایت خوبصورت،علمی ادبی نکات سے لبریز ہوتی۔اپنی عمر کے آخری حصہ میں بہت نحیف ہو چکے تھے۔اس عرصہ میں آپ کو دارالعلوم کی انتظامیہ کی طرف سے صرف فتاویٰ کے صدور کی زحمت دی جاتی تھی۔آپ نے اپنی ساری حیات مبارکہ درویشانہ وفقیرانہ انداز میں بسر فرمائی۔آخری دم تک دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ سے وابستہ رہے۔آپ کا وصال بھی دارالعلوم رحمانیہ میں ہوا۔اور درگاہ عالیہ چھوہر شریف کے قبرستان میں آخری آرام گاہ بنی۔آپ صابر وشاکر،شب زندہ دار،نہایت ہی متقی و پرہیزگار عالم دین،شفقت ومحبت کا مرقع،للّٰہیت وخلوص وقناعت وسادگی کا پیکر اور درویش منش صاحب روحانیت اور سلف صالحین کا نمونہ تھے۔اللہ تعالیٰ آپ کی قبر انور پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔آمین۔

حضرت علامہ مولانا عبدالغفور بالاکوٹی رحمہ اللہ

آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد میں ۱۸ اکتوبر 2005ء کو آنے والے قیامت خیز زلزلہ کے سبب بے شمار قیمتی جانیں لقمہ اجل بنیں، اس جانکاہ حادثہ میں ہزارہ ڈویژن سے تعلق رکھنے والی ایک ممتاز علمی وفکری شخصیت علامہ عبدالغفور بالاکوٹی رحمہ اللہ بھی مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ آپ کا تعلق ہزارہ کے معروف تاریخی مقام بالاکوٹ سے تھا۔ حضرت مولانا بالاکوٹی مرحوم ممتاز عالم دین، نکتہ رس مقرر، ثقہ مدرس، فصیح و بلیغ خطیب، سیاسی اسرار ورموز سے آشنا دانشور اور پرخلوص سماجی شخصیت کے مالک تھے۔

حضرت علامہ مرحوم نے اپنی تعلیم کا آغاز ضلع مانسہرہ کے ایک معروف گاؤں ''گاندھیاں'' سے فرمایا جہاں مفتی اعظم سرحد فقیہ عصر استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی محبوب الٰہی رحمانی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اور اس کے بعد اہل سنت کی قدیم دینی درسگاہ دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ ہری پور سے درس نظامی کی تکمیل فرمائی آپ کے اساتذہ کرام میں حضرت مفتی اعظم سرحد مولانا محبوب الٰہی رحمانی حضرت شرف ملت مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری صاحب، حضرت مولانا سید سلیمان شاہ صاحب، حضرت مولانا قلندر صاحب، حضرت مولانا قاضی سید نظام الدین شاہ صاحب سابق ضلع قاضی مظفر آباد، حضرت شیر سرحد مولانا عبدالمالک صاحب شامل ہیں۔

آپ کو سلسلہ عالیہ قادریہ رحمانیہ میں حضرت پیر طریقت خواجہ محمود الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ دربار عالیہ چھورشریف سے شرف بیعت حاصل تھا۔ آپ کو اپنے شیخ طریقت اور درگاہ عالیہ چھورشریف سے بے حد عقیدت تھی آخر دم تک دربار عالیہ چھور شریف اور دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ سے اپنا تعلق برقرار رکھا۔

حضرت مولانا نہایت ہی بلند اخلاق کے مالک تھے۔ تمام احباب سے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ تلامذہ کے ساتھ بڑی شفقت کا مظاہرہ فرماتے۔ اپنے اساتذہ کرام اور دیگر علماء کرام و مشائخ عظام کا نہایت ادب و احترام کرتے اور ان سے گہرا رابطہ رکھتے، ہر دینی معاملے میں مشاورت فرماتے تھے۔

حضرت مولانا عبدالغفور بالاکوٹی رحمہ اللہ نے تحصیل علم سے فراغت کے بعد مختلف مقامات پر دینی خدمات انجام دیں۔ مادر علمی دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ ہری پور میں تدریس فرمائی جہاں پر راقم کو بھی آپ سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ اور اس کے علاوہ ہری پور ایبٹ آباد بالاکوٹ، سرائے صالح، گڑھی حبیب اللہ راولپنڈی وغیرہ شہروں میں خطابت کے فرائض بھی انجام دیئے۔

حضرت مولانا مرحوم کی بالاکوٹ اور کاغان ویلی کی سنگلاخ سرزمین میں قابل قدر دینی خدمات ہیں۔ آپ کو اس علاقے میں دینی خدمات کی انجام دہی میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مخالفین کی جانب سے مخالفتوں کی آندھیاں چلتی رہتی تھیں مگر مولانا مرحوم بڑی جرات و استقامت کے ساتھ بے سروسامانی کے عالم میں اپنے دینی و مسلکی مشن کے فروغ کے لیے جدوجہد فرماتے رہے۔

حضرت مولانا نے بالاکوٹ شہر میں دینی علوم کے فروغ اور تبلیغ اسلام کی خاطر ایک ادارہ بھی دارالعلوم اسلامیہ جمالیہ رحمانیہ کے نام سے قائم فرمایا تھا۔ آخر وقت تک اسکی سرپرستی فرماتے رہے۔ بالاکوٹ شہر اور اس کے گرد ونواح میں ہر سال میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقع پر جلسے اور جلوس کا بڑی عرق ریزی کے ساتھ اہتمام فرماتے اور اس علاقے میں تبلیغ کے لیے ملک بھر سے سربرآوردہ شخصیات اور ممتاز علماء کرام، مشائخ عظام کو خطاب کے لیے مدعو فرماتے۔

حضرت علامہ شاہ احمد نورانی، حضرت مولانا عبدالستار نیازی، حضرت مولانا صاحبزادہ سید فیض الحسن، حضرت مولانا محمد شفیع اوکاڑوی، حضرت صاحبزادہ خواجہ طیب الرحمان چھوہروی (رحمہم اللہ) حضرت مولانا عبدالمالک جیسی ممتاز علمی و روحانی اور سیاسی شخصیات نے آپ کی دعوت پر کئی مرتبہ بالاکوٹ و کاغان ویلی کا تبلیغی دورہ فرمایا۔

حضرت مولانا بالاکوٹی رحمہ اللہ نے جماعت اہل سنت اور جمعیت علماء پاکستان کے پلیٹ فارم سے ہزارہ میں اٹھنے والی ہر دینی تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ 1977ء میں نظام مصطفیٰ کیلئے چلنے والی تحریک میں ہزارہ ڈویژن سے جمعیت علماء پاکستان کی بھرپور نمائندگی فرمائی۔ سنی کانفرنس رائیونڈ، سنی کانفرنس ملتان میں ہزارہ ڈویژن کے علماء کے قافلے کے ہمراہ جاندار نمائندگی بھی آپ کے حصے میں آئی۔

صوبہ سرحد میں تحریک منہاج القرآن کے قیام میں بھی پیش پیش رہے۔

حضرت علامہ مولانا عبدالغفور بالاکوٹی رحمہ اللہ ہزارہ ڈویژن میں اہل سنت و جماعت کے روحِ رواں کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی وفات سے اہل سنت کو اس علاقے میں واقعی لاتلافی نقصان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی دینی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور آپ کے درجات کو بلند فرمائے۔